بے تیغ سپاہی
جنگ 71ء اور قید و بند کی روداد
لیفٹیننٹ کرنل (ر) عبدالقادر ستارۂ جرأت

بے تیغ سپاہی

جنگ 71 اور قید ہند کی روداد

لفٹیننٹ کرنل (ر) عبدالقادر ستارۂ جرأت

بار اول 2010

بار دوم 2020

مصنف لفٹیننٹ کرنل عبد القادر ستارۂ جرأت

ترتیب، طباعت اور پرنٹنگ پرنٹ میڈیا لیاقت روڈ راولپنڈی

ٹائٹل کور طوبیٰ

قیمت 500 روپے

ملنے کا پتہ: 1 اشرف بک ایجنسی اقبال روڈ کمیٹی چوک راولپنڈی

2 ادریس بک ڈپو، بنک روڈ صدر راولپنڈی

3 علم و عرفان پبلشرز۔ الحمد مارکیٹ 40، اردو بازار لاہور

4 بک سنٹر فیروز سنز بلڈنگ صدر راولپنڈی

5 ویلکم بک پورٹ اردو بازار کراچی

ISBN-10: 9651939907

ISBN-13: 978-9651939907

انتساب

والد محترم کے نام جن کے ایک تھپڑ نے، جو انہوں نے مجھے ان کی وردی کی جیب سے اپنے دفتر کی پنسل نکال کر استعمال کرنے پر رسید کیا تھا، میری زندگی کے ہر دوراہے پر رہنمائی کی۔

Maj Fazal Hussain (retd)

Maj Abdul Qadir, SJ

Capt Abdul Rehman

سگنل کور کے جریدے قاصد کے 1973 کے ایک شمارے سے اقتباس (یہ شمارہ میری قید سے واپسی سے پہلے شائع ہوا تھا۔عبدالرحمان کے نام کے ساتھ TJ ظاہر نہیں کیا گیا کیونکہ اسے ۱۹۷۴ میں قیدیوں کی واپسی کے بعد چھان بین کر کے یہ ایوارڈ دیا گیا تھا)

باب اول

فہرست عنوانات

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
1	پہلے ایڈیشن کے بارے میں	7
2	کچھ اس کتاب کے بارے میں	12
3	دیباچہ	14
4	ابتدائیہ	15
5	چٹاگانگ ۔ 1969 سے 1970 تک	17
6	ڈھاکہ آمد اور آغاز جنگ 1971	23
7	ڈھاکہ سے اگلے مورچوں پر ۔	27
8	۲۷ بریگیڈ کا براہمن باڑیا سے انخلا	30
9	بھیراب بازار ۔ شکاری کا جال یا دفاعی حصار	36

باب دوم

1	سرنڈر اور قید	57
2	کیا سرنڈر ناگزیر تھا؟	64
3	کچھ دن ڈھاکہ میں	76
4	شکستہ مانس بریلی کو	78
5	کیمپ 58 میں چند دن	85
6	بریلی سے میرٹھ اور فرار کی کوشش	96
7	عبدالرحمان پر کیا بیتی۔ اس کی اپنی زبان میں	108
8	فرار ہونے والے باقی پانچ افسر	146
9	کیمپ 40 اور قید تنہائی	152
10	میرٹھ سے آگرہ کیمپ 88 میں	168
11	آگرہ سے رانچی اور فرار کی کوشش	177
12	چلتی ٹرین سے چھلانگ۔ شجاعت کی کہانی	186
13	کیمپ 98 میں	189

196	کیمپ 98 سے 95 اور سرنگ کا آغاز	14
209	کیا راز افشا ہو جائے گا ؟	15
214	مون سون کی آمد اور کام میں تعطل	16
216	سرنگ کی کھوج کے لیئے باقاعدہ چھاپہ	17
219	اسپتال سے فرار کا منصوبہ	18
224	شملہ معاہدہ اور سرنگ پر دوبارہ کام کی مخالفت	19
229	آخری کوشش	20
232	سرنگ کے بارے میں شجاعت کی کتاب سے اقتباس	21
244	وطن واپسی	22
		23

باب سوم

246	قید کے بعد کی کچھ سرگرمیاں	1
265	اپنے ملک کے لئے کچھ کرنے کی خواہش	2

پہلے ایڈیشن کے بارے میں

اس کتاب کی لکھائی اور ترتیب تو 1974 میں قید سے واپسی کے بعد ماسوائے آخری ایک دو ابواب کے تقریباً مکمل ہوگئی تھی۔ اسے چالیس سال تک منظرعام پر میں کیوں نہ لایا تو اس سلسلے میں میں جو کچھ بھی کہوں گا اسے شاید میری کسرنفسی سے تعبیر کیا جائیگا۔ یوں سمجھ لیجئے کہ میں جن حالات میں سے گذرا اور جو کچھ میں نے دیکھا اور محسوس کیا اسے من وعن بیان کر کے سفر آخرت سے قبل اپنا بوجھ (اگر اجازت ہو تو کہوں بار امانت) کچھ ہلکا کرنا چاہتا ہوں۔ اسے دنیا کمانے کا ذریعہ بنا کر اس بوجھ میں مزید اضافہ کرنا میری حماقت ہوگی۔ جہاں تک عزت اور شہرت کا تعلق ہے تو میں ان سب چیزوں کا اب تقریباً 78 سال کی عمر میں کیا کروں گا۔ لڑائی اور قید کے دوران میں نے جو کچھ کیا اس کا میری دنیاوی ترقی اور شہرت پر کوئی خاطرخواہ اثر نہیں پڑا۔ ستارۂ جرأت کا اعزاز، سٹاف کورس، انجینئرنگ ڈگری، اچھی جنگ (جی۔او۔سی کی لکھی ہوئی) اور امن کے دوران کی اے۔سی۔آرز ACRs اور سکول آف سگنلز اور انفنٹری سکول کی بالترتیب کلاس بی اور کلاس اے کی انسٹرکٹری کے باوجود میں لفٹیننٹ کرنل کے عہدے تک بمشکل ترقی پا سکا۔ خیر اس میں کچھ حادثاتی وجوہات بھی ہیں جن کا مفصل بیان تو یہاں مناسب نہیں

صرف اتنا عرض کیئے دیتا ہوں کہ قسمت نے مجھے میجر جنرل تجمل سے ایک غیر متوقع ملاقات کروائی جس کا بعد میں پتا لگا کہ وہ کسی سازش کے سلسلے میں تھی۔ایک سال کے بعد مجھے بے گناہ قرار دے کر بحال تو کر دیا گیا لیکن میری آئندہ ترقی کی راہ مسدود ہوگئی۔رہی شہرت تو اس کا اندازہ ان واقعات سے لگایا جا سکتا ہے۔1998 میں انٹر سروسز پبلک ریلیشن(I.S.P.R) کو ہم دونوں بھائیوں کا جی۔ایچ۔کیو۔ آڈیٹوریم میں یوم دفاع پر مدعو کرنے کا پچیس سال بعد نجانے کیسے خیال آ گیا۔کمپیئرنگ کے دوران ٹی۔وی۔کے ایک مشہور اینکر طلعت حسین نے انتہائی مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہوئے کہا کہ ان کی کہانی اگر فلمائی جائے تو اس کی شہرت ٹائٹینک Titanic فلم سے بھی زیادہ ہوگی۔اس کے بعد باقاعدہ طور پر الفا بریووچارلی AlphaBravoCharlie کے حوالے سے شہرت پانے والے شعیب منصور کو اسپر ایک ٹی۔وی سیریل بنانے کا کام سونپا گیا۔انہوں نے ہمارے ساتھ کافی نشستوں کے بعد سکرپٹ جی۔ایچ۔کیو کے حوالے کر دی۔میں نے اس کے بارے میں کسی سے پوچھا تو نہیں لیکن بہت عرصے بعد غیر مستند اطلاع کے مطابق اسے اس وقت کے چیف آف آرمی سٹاف نے یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ میں ان کو اچھی طرح جانتا ہوں۔جیسے آگے ذکر آئے گا پرویز مشرف اور میں نے ایک ساتھ کمانڈو کورس کیا تھا اور وہ میری صلاحیتوں کو شاید بجا طور پر اپنے سے کم تر سمجھتا ہوگا۔یوم دفاع پر ٹی۔وی پر نشر ہونے والے اس پروگرام کو دیکھنے والے صرف دو اشخاص سے میں نے اس سلسلے میں ضرور داد وصول کی۔ایک تو اسلام آباد سبزی منڈی کے ایک ٹماٹر فروش اور ایک صدر راولپنڈی میں شیخ SHEIKH's کے مالک سے۔ٹماٹر والے نے تو کوئی رعایت نہیں کی (ٹماٹر اس وقت بہت مہنگے تھے) لیکن شیخ صاحب نے دو اڑھائی ہزار کی خریداری پر کچھ کمی کی پیشکش کی۔

گو یہ کتاب کے موضوع سے کچھ ہٹ کر ہے لیکن چونکہ میری زندگی کی مسلسل جد و جہد کا ایک اہم حصہ ہیں اس لیئے قید سے واپس آنے کے بعد کے حالات اور خیالات آخری حصے میں شامل کر دیئے ہیں ۔ زندگی کے آخری ایام میں کچھ کرنے کی خواہش کے عنوان کے تحت جو کچھ میں نے لکھا ہے اس کے پڑھنے سے شاید کسی منزل کے متلاشی کو رہنمائی مل جائے ۔ میری طرح یہاں اور بہت سے لوگ ہیں جو ہمارے اس ملک میں جو کچھ ہو رہا ہے یا آج تک ہوتا رہا ہے اس سے مطمئن نہیں ہیں ۔

میں نے حتی الامکان کوشش کی ہے کہ جس کسی کے بارے میں کچھ ایسی چیز لکھی ہے جس کا کوئی منفی پہلو نکل سکتا ہے تو دانستا اس کا اصلی نام نہیں لکھا تا کہ اس کی دلآزاری نہ ہو۔ میں ان ساتھیوں خاص کر کیپٹن شجاعت ، میجر ذوالفقار علی جنجوعہ ، کیپٹن احسن ، کیپٹن منظر ، لفٹیننٹ عارف ، لفٹیننٹ آفتاب لودھی ، کیپٹن امیر خان ، میجر سلیم ملک اور میجر علاؤالدین کا بے حد ممنون ہوں جنھوں نے قید کے آخری دن تک میرا ساتھ دیا۔ مجھے امید ہے کہ جن ساتھیوں کے نام رہ گئے ہیں وہ اسے میرے حافظے کی کمزوری سمجھ کر مجھے معاف کر دیں گے ۔

اپنی فوج کے بارے میں جو کچھ بھی لکھا گیا ہے اس کا مقصد اصلاح احوال ہے نہ کہ اس کی عمومی صلاحیت پر کوئی منفی تبصرہ ۔ اگر اس کی کارکردگی مجموعی طور پر مایوس کن رہی تو اس کی ذمہ داری اس وقت کی سیاسی اور فوجی قیادت پر عائد ہوتی ہے ۔ اگر دونوں طرف خلوص اور بھائی چارے کا فقدان نہ ہوتا تو بنگالیوں کو جو ہم سے شکایات تھیں ان کا مداوا کافی حد تک ممکن تھا لیکن جس چیز نے حالات کو آخر میں اس حد تک بگاڑا کہ پاکستان دولخت ہو گیا وہ بلا مبالغہ تین آدمیوں کی ہوس اقتدار تھی ۔ یحیٰی خان کو مجیب الرحمان نے لالچ دی کہ اگر اسے وزارت عظمیٰ سونپی

گئی تو صدارت اسی کی قائم رہے گی ۔اس خود غرضی کے تحت اس نے مشرقی پاکستان میں فوج کو الیکشن کے دوران اور اس کے بعد بگڑتے ہوئے حالات میں بھی بیرکوں کے اندر پابند کر دیا۔ اس کے بعد وہاں جو کچھ ہوا وہ نجانے اب تک منظر عام پر کیوں نہیں لایا گیا۔مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے فوجیوں ، عام شہریوں اور بہاریوں کے ساتھ جو سلوک کیا گیا وہ تو تقسیم کے وقت غیر مسلموں نے بھی نہیں کیا تھا۔ یہ بہت کم لوگوں کے علم میں ہے کہ فوجی جوانوں کی ایک غیر مسلح کمپنی کے تقریباً ڈیڑھ سو جوانوں کو کشتیہ میں قتل کر کے ان کی لاشوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے دریا میں بہا دیا گیا تھا۔اس طرح اور بہت سے ایسے رونگٹے کھڑے کر دینے والے واقعات ہیں جو اس غلط پالیسی کی وجہ سے مکتیوں نے اس وقت سر انجام دیئے جب وہاں پر موجود مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے فوجیوں کے ہاتھ باندھ دیئے گئے تھے۔اس کے ردعمل کے طور پر بعد میں جو چند شر پسندوں کے ساتھ فوج نے سلوک کیا اور جس کی ہندوستان نے بڑھا چڑھا کر تشہیر کی وہ آج بھی ہمیں بدنام کرنے کے لیئے کتابوں اور انٹرنیٹ پر موجود ہے۔اس کے مقابلے میں آج تک نہ حکومت نہ کسی اور نے ہندوستان کی پشت پناہی میں ہونے والے قتل و غارت کو منظر عام پر لانے کی جسارت کی ہے۔

اس سانحہ کا سب سے بڑا کردار ذوالفقار علی بھٹو تھا جس نے اپنے نام اور انتخابی نشان تلوار کی مناسبت سے پاکستان کے دو ٹکڑے کرتے وقت کہا تھا کہ ادھر ہم ادھر تم ۔ یحیٰی خان ان دو منہ زور گھوڑوں کو قابو میں نہ رکھ سکا اور پاکستان کے ساتھ ساتھ خود بھی دھڑام سے زمین بوس ہوگیا۔ ذوالفقار بھٹو نے شکست کی وجوہات جاننے کے لئے جو حمود الرحمان کمیشن بنایا اسے صرف جنگ میں فوج کے کردار تک محدود رکھا اسلیئے اس کا اپنا اور باقی سیاسی زعما کا رول آج تک بہت حد تک نظروں

سے پوشیدہ ہے۔ حیرت اس بات پر ہے کہ واضع شواہد کے باوجود آج تک کسی نے بھٹو یا اس واقع کے سرکردہ مشرقی اور مغربی سیاستدانوں کا پاکستان کے ٹوٹنے میں جتنا جتنا ہاتھ تھا اس کی تحقیقات کا کوئی سنجیدہ مطالبہ نہیں کیا۔ لیکن ان چیزوں کے باوجود فوج کی ہندوستان کے ہاتھوں ایک تاریخی شکست میں اس کی منصوبہ بندی کی کچھ اپنی بھی کمزوریاں تھیں جن کی کئی جگہ نشاندہی کی گئی ہے۔ یہ تو میرے علم میں ہے کہ فوج میں 1971 کے بعد بہت سی مثبت تبدیلیاں لائی گئی ہیں لیکن شاید جو کچھ وہ ہے اور جو کچھ اسے ہونا چاہیئے اس میں اب تک بھی بہت بعد ہے۔ یہ فوج بلا مبالغہ دنیا کی بہترین اور ناقابل شکست قوت بن سکتی ہے اگر اس کی سوچ اور عمل میں یہ جذبہ موجود ہو تو:

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ   مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی۔

(علامہ اقبال)

دوسرے ایڈیشن کے بارے میں

پہلے ایڈیشن کی اشاعت کے لئیے میں نے اس کتاب کا مسودہ لاہور میں اپنے ایک ساتھی کو یہ کہہ کر دیا تھا کہ وہ اسے کسی پبلشر کو دکھائے اور اگر وہ اسے مناسب سمجھے تو چھاپ کر تقسیم کردے۔ اس کے لئیے میں نے کسی رائلٹی کا تقاضہ نہیں کیا تھا اور صرف اپنے حقوق اپنے پاس رکھنے کا کہا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے اس نے اس کی چھپوائی نہایت گھٹیا کاغذ پر بے شمار غلطیوں اور مدہم اور بعض غیر واضع تصاویر کے ساتھ کی جو کتاب کی کوئی خاص پذیرائی نہ ہونے کی وجہ بنی۔ یہ ایڈیشن کچھ اضافہ کیا گیا ہے جس میں اپنے بھائی کیپٹن عبدالرحمان تمغہء جرأت کی بس سے فرار، نیپال میں نظر بندی اور پھر چھ ماہ بعد وطن واپسی کے علاوہ موجودہ ملکی حالات اوران کے حل کے بارے میں تفصیلا لکھا ہے جو شاید قارئین کی دلچسپی کا باعث ہو۔

کچھ اس کتاب کے بارے میں

پاکستان بنا بے پناہ قربانیوں کے بعد۔ پاکستان کی قیمت بہت بھاری چکائی گئی اور اس پر بہت کچھ لکھا گیا، بیان ہوا اور مسلسل لکھا جا رہا ہے۔مگر میرا پوری دیانتداری سے یہ خیال ہے کہ حقیقی قربانیوں کا ایک حدتک اندازہ ان لوگوں کو ہے جنہوں نے پاکستان بنتے دیکھا اور لٹے پٹے قافلوں اور لاشوں سے اٹی ٹرینوں کو لاہور آتے دیکھا۔ شاید بعد میں آنے والی نسل کو یہ افسانہ لگے یا ایک کہانی مگر جنہوں نے دیکھا اور اس وقت سنا ان کی کیفیت کچھ اور ہے۔ پاکستان مسلمانوں کی اجتماعی قوت سے بنا تھا اور عجیب بات ہے کہ پورے برصغیر کے مسلمان ایک اور صرف ایک نعرے پر متفق ہو گئے۔ نہ صرف متفق ہوئے بیشتر گھر بار، اہل و عیال سمیت قربان ہو گئے اور پاکستان حاصل کر لیا۔ مگر افسوس کہ حصول ملک کے بعد انکی وہ امیدیں خاک میں ملا دی گیئں اور پاکستان مسلمانوں کی ریاست بن گیا مگر مسلمان ریاست نہ بن سکا۔ اور جب وہ جذبہ جو یکجائی کا سبب تھا نہ رہا تو پاکستان کی جگہ بنگالی، پنجابی، سندھی، بلوچ اور پٹھان نے لے لی۔

اسکا سبب کوئی سیاسی جماعت تھی یا فرد یا بہت سے افراد اس پر بہت کچھ کہا

جا چکا ہے اور کہا جاتا رہے گا مگر یہ طے ہے کہ مسلمانوں کا یہ عظیم اجتماع صرف اور صرف اسلام کے نام پر بنا تھا جو بعد میں اسلامی نظام نافذ نہ ہونے کی وجہ سے بکھر گیا اور یوں ملک ٹوٹنے کا سبب بنا۔ اس پر بہت کچھ کہا گیا اور کہا جاتا رہے گا مگر سب کہنے والے سنی سنائی کہنے والے ہیں۔ ان میں کچھ حضرات کیا بلکہ چند حضرات ایسے ہیں جو اس کا حصہ تھے ان کی باتیں یقیناً وزن رکھتی ہیں۔ جیسے بریگیڈئر سالک مرحوم کی ً ہمہ یاراں دوزخ ً یا چند اور ہونگی جو میرے علم میں نہیں۔ ان سب باتوں کے علاوہ ایک عمومی تاثر یہ بھی بنا کہ ہماری فوج نے کچھ نہیں کیا، کم ہمتی دکھائی اور اتنی بڑی تعداد جنگی قیدی بن گئی۔ بات میں وزن تو ہے لیکن کیا فوج اپنی کم ہمتی سے بن گئی یا وقت کے پیادوں، اقتدار کے بھوکوں اور اقتدار میں نا اہل لوگوں نے فوج کو باندھ کر دشمن کی جھولی میں ڈال دیا۔ اس پر بھی بات کرنی چاہیے یا پھر فوج کے ان جوانوں اور افسروں سے پوچھا جائے جن پر یہ سب کچھ بیت گیا۔ انہوں نے کیا محسوس کیا اور ان کے جذبے کیا تھے، قید بند کو انہوں نے کیسے نبھایا اور کس طرح دن گذارے۔ وہ کیا سوچتے تھے، کیا کرتے تھے اور کیا کرنا چاہتے تھے اور کیا کر سکے ً۔ بے تیغ سپاہی ً ایک ایسے ہی مجاہد کی داستان ہے جس سے یہ سارے پہلو نکھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ میں اس پر مزید بات نہیں کرنا چاہتا نہ رائے دینا چاہتا ہوں بلکہ چاہتا ہوں کہ قاری خود دیکھے، جانے، سمجھے اور فیصلہ کرے کہ حقائق کیا تھے اور ہمیں بتایا کیا جاتا رہا۔

فقیر محمد اکرم اعوان

خادم سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ

دارالعرفان ضلع چکوال

2 دسمبر 2010

دیباچہ

بے تیغ سپاہی ایک سچے اور کھرے سپاہی کی داستان عزم و وفا ہے۔ انتہائی سادہ الفاظ میں بیان کی ہوئی یہ داستان سانحہ مشرقی پاکستان میں بھارتی جیل سے فرار ہونے تک ایک پیشہ ور آفیسر اور ماہر تربیت یافتہ کمانڈو کی جد و جہد سے قاری کو بڑے خوبصورت انداز میں آشنا کرتی ہے۔

مشرقی پاکستان کا المیہ ہمارے سیاستدانوں، جرنیلوں اور عسکری ہائی کمان کی غلطیوں کے نتیجے میں رونما ہوا۔ لیکن بے تیغ سپاہی کی روداد سے واضع ہو جاتا ہے کہ جہاں تک عام فوجی آفیسر اور سپاہی کا تعلق ہے وہ ان تمام خامیوں اور کوتاہیوں کے باوجود اپنے وطن سے بے پناہ محبت کی داستانیں رقم کرتے رہے اور بہادری کی ایک ایسی روایت مرتب کی جس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔

بطور سپاہی میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں وہ سب کچھ نہ کر سکا جو بے تیغ سپاہی کے مصنف لفٹیننٹ کرنل (ر) عبدالقادر نے کر دکھایا۔ اگر میرا کوئی سرمایہ افتخار ہے تو صرف یہ کہ میں ایسے محبّ الوطن، جری اور دلیر سپاہیوں اور آفیسرز کی برادری سے تعلق رکھتا ہوں۔

میں مصنف کو اس کی کاوش پر خراج تحسین پیش کرتا ہوں اور توقع رکھتا ہوں کہ وہ اپنے قلم کو اعلی و ارفع مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہوئے وطن عزیز کی خدمت کرتے رہیں گے۔

مخلص دعاگو

لفٹیننٹ جنرل حمید گل (ر)

ابتدائیہ

1965 کی لڑائی کے دوران میں چھمب جوڑیاں کے محاذ پر بریگیڈئر افتخار جنجوعہ کے 6 بریگیڈ میں سگنل کمپنی میں کمپنی افسر تھا۔ اپنے پاکستان ملٹری اکیڈمی PMA کے ساتھیوں کیپٹن نادر پرویز اور کیپٹن صبح صادق شہید وغیرہ کو انفنٹری یونٹوں میں اگلے مورچوں میں دیکھ کر رشک آتا تھا حالانکہ وہ مورچوں اور بنکروں میں نسبتاً زیادہ محفوظ ہوتے تھے اور میں اپنی لائن مین پارٹی کے ساتھ دشمن کی بمباری اور آرٹلری شیلنگ سے ٹوٹی ہوئی ٹیلیفون تاروں کو اسی گولہ باری کے دوران مرمت کروا رہا ہوتا تھا۔ پی۔ایم۔اے سے سگنل کور میں مجھے میری مرضی کے خلاف بھیجا گیا تھا (حالانکہ بعد میں مجھے اس کور نے وہ عزت اور صلاحیت بخشی جس کا میری دانست میں مستحق نہیں تھا)۔ قصہ مختصر جونہی جنگ رکی میں نے ایس۔ایس۔جی SSG میں شمولیت کے لئے اپنا نام بھجوا دیا۔

ہماری ٹریننگ کے انچارج تو میجر افتخار تھے لیکن زیادہ تر تربیت ان کے سیکنڈ ان کمانڈ کیپٹن طارق محمود (ٹی۔ایم) نے کی جو بعد میں بریگیڈئیر کے عہدے پر ترقی پا کر ایس۔ایس۔جی SSG کے کمانڈر بنے۔ ہمارے 10 زیر تربیت ساتھیوں میں انفنٹری کے تین (بلال، جاوید عزیز اور صفدر عابد) آرٹلری کے چار (پرویز

مشرف جو بعد میں آرمی چیف اور صدر پاکستان بنے، کیپٹن (میجر جنرل کے عہدے سے ریٹائر ہوئے) سعید الحسن زیدی کے علاوہ سرفراز اور اقبال) آرمی سروس کور کے عارف کے علاوہ ہم تین سگنل آفیسر (میں، حفیظ اور اعظم علی) بھی شامل تھے۔ ہم تینوں کے بارے میں ٹی۔ ایم کا خیال تھا کہ انتہائی سخت ٹریننگ کے دوران جنگ کے بعد عارضی طور پر جوش میں آئے ہوئے یہ سگنل افسر جلد ہی واپس بھاگ جائیں گے (نور جہاں کے گانے سنکر فوج میں آنے کے قصے ابھی تک زبان زد عام تھے)۔ شاید انہیں یہ احساس نہیں تھا کہ یہ اپنے وائرلیس سیٹ "توڑ" کر آئے ہیں۔ سگنلز کا کیپٹن حفیظ جس کا وزن شاید اپنے رک سیک (پیٹھ پر اٹھانے والا جھولا) سے بھی کم تھا کبھی کسی چیز میں حتیٰ کہ سخت پچس کی زد میں رہ کر بھی ہم سے پیچھے نہیں رہا۔ میں حیران ہوں کہ پرویز مشرف جسے ہم شرفو کہتے تھے کس طرح اپنے بھولے پن کے خول سے نکل کر ایک جابر حکمران بن گیا۔ ایک معمولی سے واقعہ سے شاید اس بات کی کچھ وضاحت ہو جائے۔ کمانڈو کورس کے بعد ہم اکٹھے انفنٹری سکول کوئٹہ میں ایک کورس کر رہے تھے اور جیسا اس وقت کے نوجوان افسروں کا معمول تھا ہم دونوں بھی ایک مشہور ہوٹل میں آئے ہوئے غیر ملکی سیاحوں سے گپ شپ لگانے چلے گئے۔ ہانگ کانگ یا سنگاپور سے ایک بس انگلینڈ جا رہی تھی اور اسکی ایک مسافر خاتون سے ہماری مڈبھیڑ ہوئی تو مشرف شرما کر پیچھے ہٹ گیا اور مجھے آگے کر دیا۔ میں جو لڑکیوں کے معاملے میں خود نہایت پھوہڑ واقع ہوا تھا بمشکل اسے کھانے پر مدعو کر سکا۔ آپ جاننا چاہیں گے کہ اس کے بعد کیا ہوا۔ آپ کی تسلی کے لیئے یہ بتانا پڑے گا کہ اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ہاٹ واٹر بوتل دکھا کر معذرت کر لی کہ اس کی کمر میں سفر کی وجہ سے سخت درد ہو رہا ہے۔ ایک ضمنی بات آگئی تھی اس لئے بیان کر دی ورنہ اس میں جو بعد میں تبدیلی آئی اس کے بارے میں کوئی آنے والا تاریخ

دان یا اس کی سوانح عمری کا مصنف ہی وضاحت پیش کر سکے گا۔مشرقی پاکستان میرے لیئے آہستہ آہستہ ایک سہانا سپنا کیسے بنا؟ بس یوں سمجھیے کہ ایک جنون تھا جو کسی طور میرے ذہن میں سما گیا تھا۔ مجھے وہاں جانے کے لیئے باقاعدہ منصوبہ بندی کرنی پڑی۔کمانڈو کمپنیوں کو دو سے تین سالوں تک باری باری مشرقی پاکستان بھیجا جاتا تھا اور میری کمپنی ٹیپو جو براہ راست ایس۔ایس۔جی ہیڈ کوارٹر کے زیر کمان تھی کی باری میری ایس۔ایس۔جی میں سروس کے دوران ناممکن تھی۔سگنلز کے کیپٹن اورنگ زیب نے 3 کمانڈو بٹالین چٹاگانگ سے واپس کسی سگنل یونٹ میں جانا تھا۔ کیپٹن حفیظ جس کی پوسٹنگ شروع سے ہی سگنل کمپنی (اقبال) میں ہوگئی تھی نے کمپنی کی کمان سنبھالنی تھی لہٰذا میرے علاوہ کسی اور کو وہاں بھیجا نہیں جا سکتا تھا۔اس کے پیش نظر میں نے سگنل کا ایک سپیشل کورس کیا اور اپنے آپ کو سگنل کمپنی میں پوسٹ کروالیا۔اس طرح کچھ ہی عرصے بعد میں اپنے خوابوں کے دیس میں تھا۔

چٹاگانگ۔1969 سے 1970 تک

مشرقی پاکستان کو جو کچھ اس کے بارے میں سنا تھا اس سے زیادہ خوبصورت اور پرکشش پایا۔میلوں تک پھیلے ہوئے دھان کے ہرے بھرے کھیت جن کے بیچوں بیچ نسبتاً اونچائی پر بنائے گئے چھوٹے چھوٹے گھر اور ان کے گرداگرد لمبے لمبے بانسوں کے جھنڈ اور گھر کی طرف آنے والے راستے کے اطراف میں سپاری اور ناریل کے اونچے اونچے درخت ایک مسحور کن منظر پیش کرتے ہیں۔ ہر باڑی

(گھر) کا اپنا چھوٹا سا تالاب ہوتا ہے جو پانی کی ضروریات کے علاوہ مچھلی پالنے کے کام بھی آتا ہے۔ رانگامتی کی جھیل اور اس کے آس پاس کے علاقے میں دور دور تک پھیلے ہوئے اناناس کے کھیت، سلہٹ کے چائے کے باغات، سندر بن کا میلوں پھیلا ہوا خوبصورت جنگل، کاکس بازار سے چٹاگانگ تک پھیلی ہوئی ایک میلوں لمبی ریتلی بیچ (Beach) اور برما بارڈر کے ساتھ ساتھ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں پر اونچے اونچے ساگوان کے درخت اور وسیع پاٹ والے دریا جن میں اپنی منزلوں سے بے پرواہ آہستگی سے چلتے ہوئے چھوٹے بڑے جہاز سمندر کی آغوش میں سمانے کی خاطر اپنا اپنا سفر طے کرتے ہوئے دیکھنے والوں کے دلوں کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔

لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ جس طرح کے تاثرات کوئی باہر سے آنے والا شخص محسوس کرتا ہے وہ وہاں کے رہنے والوں کے دل پر نقش نہیں ہوتے۔ دو وقت کی روٹی کی تلاش میں سرگرداں ہجوم multitude کو آس پاس کے ماحول کے ساتھ فقط اتنی سی وابستگی ہی رہ جاتی ہے جتنی کہ وہ اس کی بدنی ضروریات کو پورا کر سکے۔ جانوروں، پرندوں اور کیڑے مکوڑوں کی تگ و دو اور انسانوں کے مقاصد حیات کا فرق بہت کم رہ جاتا ہے۔ رقبے کے لحاظ سے مغربی پاکستان سے ایک تہائی اور آبادی میں برابری کی وجہ سے ماسوائے چٹاگانگ کے پہاڑی علاقے اور سندر بن کے کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں انسان نہ بستے ہوں۔ اس کے مقابلے میں وسائل نہایت محدود تھے۔ انتہائی زرخیز زمین، وافر آب پاشی کے ذرائع اور دن رات کی ان تھک محنت کے باوجود انسانوں کے پیٹ کی بھوک نہیں مٹتی تھی۔ پٹ سن اور چائے سے حاصل شدہ آمدنی غریبوں کے چولہوں کو جلائے رکھنے میں کوئی خاطر خواہ مدد نہیں دیتی تھی۔ صنعت و حرفت کا انحصار زیادہ تر گھریلو دستکاریوں پر تھا جن

میں سوتی کپڑوں کی بنائی سرفہرست تھی ۔ ایوب دور میں چٹا گانگ کے قریب کرنافلی میں کاغذ کا کارخانہ اور ڈھاکہ کے علاقے ٹونگی میں کچھ فیکٹریاں لگائی گئیں جو صوبے کی معشیت کو کوئی خاطر خواہ سہارا نہ دے سکیں ۔

صرف تعلیم کا شعبہ ایسا تھا جس کا معیار اور پھیلاؤ مغربی پاکستان کے مقابلے میں بہت زیادہ تھا لیکن تعلیمی اداروں میں ہندوؤں کا اثر و رسوخ کافی زیادہ تھا۔ زیادہ تر استاد ہندو تھے جن میں سے کچھ ہندوستانی یونیورسٹیوں اور کالجوں سے فارغ التحصیل تھے اور پاکستان کے خلاف جوان طبقے کے ذہنوں میں زہر گھولتے رہتے تھے۔ کسی مضبوط معاشی اور انتظامی بنیاد infrastructure کی عدم موجودگی میں پڑھے لکھے نوجوانوں کے لئے ملازمت کے مواقع بھی بہت کم تھے۔ بری فوج میں تو خیر بنگالیوں کی تعداد بہت تھوڑی تھی لیکن سول محکموں میں بھی ان کی کھپت بہت کم تھی۔ مغربی پاکستان کے چار صوبوں، آزاد کشمیر اور فیڈرل ایریا کے مقابلے میں ایک صوبائی حکوت ہونے کے ناطے آبادی کے لحاظ سے سرکاری ملازمتیں اسی نسبت سے کم تھیں۔ گو بنگالی مسلمانوں کی پستی کی ایک بنیادی وجہ انگریزوں کے خلاف سراج الدولہ اور تیتو میر جیسے مجاہدوں کی جد و جہد کا ردعمل تھی لیکن آزادی کے بعد ہم نے بھی انہیں اس صورت حال سے نکالنے کی کوئی شعوری کوشش نہیں کی تھی۔ مشرقی پاکستان میں متعین فوجیوں کا زیادہ تر تعلق مغربی پاکستان کے علاقوں سے تھا اور وہ ابھی تک انگریزوں کی روایات کو قائم رکھتے ہوئے مقامی آبادی سے الگ ایک قابض فوج کی سوچ رکھتے تھے۔ فیلڈ مارشل ایوب خان کے دور میں صرف ایک فوجی لفٹینٹ جنرل اعظم خان نے بطور گورنر بنگالیوں کے دل جیتنے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ میرے ذہن میں ان کی وہ تصویریں اب بھی محفوظ ہیں جن میں انہیں نیکر پہنے سیلاب زدہ لوگوں

کے درمیان گھومتے پھرتے دکھایا گیا تھا۔لیکن بعد میں آنے والے اسی صوبے کے گورنر، کمانڈر ایسٹرن کمانڈ اور دونوں طرف کے سیاستدان ان کی پیروی نہ کر سکے۔

3 کمانڈو جو صرف دو کمپنیوں پر مشتمل تھی چٹا گانگ میں تھی اور اس کی کمان کرنل شمس جس کا ایس۔ایس۔جی کے ساتھ تعلق نہیں تھا کے پاس تھی۔جی ہاں ! اسکے علاوہ مغربی پاکستان کی دونوں یونٹوں کی کمان بھی ان غیر ایس۔ایس۔جی کرنیلوں کے پاس تھی جنہیں1965 میں کشمیر میں داخل کی گئی یونٹوں کی کاروائیوں میں حصہ لینے پر تمغہ ٔ جرأت سے نوازا گیا تھا۔اس پر طرہ یہ کہ ایس۔ایس۔جی کے کمانڈر کا تعلق بھی ایس۔ایس۔جی سے نہیں تھا۔میری اطلاع کے مطابق اس کی وجہ آرمی میں اس وقت کے سرکردہ افسروں کی ایس۔ایس۔جی کو قائم کرنے والے برگیڈ یئر ابوبکرعثمان مٹھا کی مخالفت اور 1965 کی جنگ میں ایس۔ایس۔جی کا کوئی قابل قدر رول ،جس کی ذمہ داری فوج کی اعلیٰ کمان پر آنی چاہیئے تھی، نہ ہونے کی وجہ اوراس کے افسروں کے دماغوں کوٹھکانے پر رکھنا بتایا جاتا ہے۔

مجھے سگنل پلاٹون کی کمانڈ ملی اور پھر چند مہینوں کے بعد یونٹ کا ایجوٹنٹ بنا دیا گیا اور ساتھ ہی کوارٹر ماسٹری کا اضافی چارج دے دیا گیا۔ ہماری کمپنیوں کے اپریشنل علاقے پورے صوبے میں پھیلے ہوئے تھے اس لئے مجھے کمانڈنگ افسر کے ساتھ اور کبھی اکیلے بھی ان کمپنیوں کے ٹرینگ ایریا میں جانے کا موقع ملتا رہا۔1970 کے اوائل میں عوامی لیگ کی تحریک زوروں پر تھی۔ مجھے ایک ایسی ریل گاڑی میں سفر کرنے کا موقع ملا جس میں شیخ مجیب الرحمان بھی سوار تھا۔تقریباً ہر چھوٹے بڑے اسٹیشن پر گاڑی رکتی جہاں ہزاروں اور کبھی لاکھوں کی تعداد میں اس

کی آمد اور ایک جھلک دیکھنے کا نجانے کب سے ایک مخلوق انتظار کر رہی ہوتی تھی۔ اس کی جوشیلی تقریروں کا متن تو سمجھ میں نہیں آتا تھا لیکن ایسا لگتا تھا جیسے مغربی پاکستان کے خلاف نفرت کا ایک الاؤ ہے جو اس کی زبان سے بہہ رہا ہے۔ اس کی ہر دل عزیزی کی بنیاد وہ اصلی اور مفروضی محرومیاں تھیں جن کی ذمہ دار کچھ حد تک ہماری مرکزی حکومت تھی جس میں بنگالی وزرا اور وزرا اعظم بھی شامل ہوتے تھے۔ چند ایک کے سوا ان بنگالی سیاستانوں نے اپنے ہاتھوں کو عوام کی نبضوں سے ہٹا کر کرسی اقتدار تھام رکھنے میں مصروف کر لیا تھا۔ ان کی جماعتوں کی جڑیں آہستہ آہستہ عوام سے کٹ رہی تھیں اسلیئے انہیں اپنی سیاسی حیثیت قائم رکھنے کے لئے فوج کی طرف دیکھنا پڑتا تھا۔ ایوب کے ہاتھوں فاطمہ جناح کی کنونشن لیگ کی ہار نے مشرقی پاکستان کو مجیب کی جھولی میں ڈالنے میں بھی ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔ اور پھر مرکزی حکومت، جس کی باگ ڈور یحییٰ خان کے ہاتھ میں تھی، دوسری سیاسی جماعتوں خاص کر پیپلز پارٹی کے ایما پر عوامی لیگ سے 6 نکات پر کوئی مفید مذاکرات نہ کر سکی۔ ان چیزوں کے علاوہ ہندوستان کی پشت پناہی نے اس جماعت کو علیحدگی کے رستے پر ڈال دیا۔ دیکھا جائے تو ان کے پیش کردہ نکات اٹھارویں ترمیم کے ان آئینی اصلاحات سے زیادہ مختلف نہیں جن کے تحت صوبوں کو زیادہ اختیارات تفویض کیئے گئے ہیں۔

چٹاگانگ میں ہی ایسٹ بنگال رجمنٹ کا ٹرینگ سنٹر تھا جس کا کمانڈنٹ فل کرنل موجمدار (معظم دار) تھا۔ چھوٹے سے قد اور چھریرے بدن والا یہ بنگالی افسر نہایت شاطر لگتا تھا۔ اس کے گھر میں اکثر رات کے وقت بنگالی افسروں کے باہم ملاپ کا ذکر سننے میں آتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ مختلف چھاونیوں پر قبضے کے منصوبے ان ہی ملاقاتوں میں بنتے رہے تھے۔ ہماری کمانڈو بٹالین ان کی اس قسم کی

کارروائی میں ایک بہت بڑی رکاوٹ تھی۔ ایک سازش کے تحت شہر میں ایک سینما کے باہر کچھ بنگالیوں اور ایس۔ ایس۔ جی کے جوانوں کے درمیان جھگڑا کروایا گیا اور پھر اس کو بنیاد بنا کر 3 کمانڈو بٹالین کو وہاں سے ہٹا کر کومیلہ بھجوا دیا گیا۔ اسطرح چٹاگانگ میں صرف ایک غیر بنگالی یونٹ 20 بلوچ رہ گئی تھی جو شاید غیر بنگالی مسلمانوں کے قتل عام کو موثر انداز میں نہ روک سکی۔ فی الحال میں ان حالات کے بارے اپنے بیان کو مؤخر کرتے ہوئے اپنی سرگذشت کی طرف آتا ہوں۔

اپنے کمانڈنگ افسر لفٹیننٹ کرنل شمس کے ساتھ میں زیادہ دیر نہ چل سکا اور 1970 کے اوائل میں مجھے مجبوراً مشرقی پاکستان چھوڑنا پڑا۔ اس کے ساتھ اختلاف کی بنیادی وجہ فنڈز میں ہیرا پھیری میں اس کا ساتھ نہ دینا تھا۔ میں نے ہیڈ کوارٹر ایس۔ ایس۔ جی SSG کو اس بارے میں لکھا اور کہا کہ یا تو مجھے چراٹ پوسٹ کر دیا جائے یا واپس سگنل کی کسی یونٹ میں بھیج دیا جائے۔ کمانڈر ایس۔ ایس۔ جی برگیڈئیر شیر اللہ بیگ مشرقی پاکستان آئے اور انٹرویو کے دوران انہوں نے خرد برد کا جو الٹا سیدھا جواز پیش کیا اس سے میں نے اتفاق نہیں کیا اور ان سے درخواست کی کہ مجھے ایس۔ ایس۔ جی سے واپس بھجوا دیا جائے۔ (مکافات عمل دیکھیے کہ کافی عرصے بعد کرنل شمس کو ایک اخبار میں فراڈ کے سلسلے میں کسی تھانے کی سلاخوں کے پیچھے دکھایا گیا تھا)۔ اس دوران میں نے ملٹری کالج آف سگنلز میں آئندہ ہونے والے ٹیلی کمیونیکیشن انجینئرنگ Telecommunication Engineering Course کورس کے لئے درخواست دی اور انٹری ٹیسٹ میں کامیاب ہو کر مغربی پاکستان چلا آیا۔ انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد میں وہیں پر انسٹرکٹر پوسٹ ہو گیا لیکن بگڑتے ہوئے حالات کے پیش نظر چند ماہ بعد مجھے دوبارہ مشرقی پاکستان جانا پڑا۔ لیکن اس دفعہ یہ نہیں بتایا گیا کہ میں نے وہاں کیا

کرنا اور کہاں جانا ہے۔ پوسٹنگ آرڈر میں صرف ایسٹرن کمانڈ ہیڈکوارٹر میں رپورٹ کرنے کا کہا گیا تھا۔ 1965 کی جنگ میں بھی میں سکول آف سگنلز سے ہی محاذ جنگ پر گیا تھا۔ پوسٹنگ آرڈر 29 نومبر کو ملا اور دوسرے ہی دن میں کراچی چلا گیا۔ ٹرانزٹ کیمپ میں جہاں ہم ٹھہرائے گئے تھے طرح طرح کے افسروں سے واسطہ پڑا۔ زیادہ تر افسروہ تھے جو مغربی پاکستاں میں چھٹیاں گذارنے کے بعد اپنی اپنی یونٹوں میں واپس جا رہے تھے۔ ان میں سے کچھ نے حالات کے مدنظر اپنی چھٹیاں بڑھوالیں تھیں اور اسطرح وہ وہاں جنگ میں شمولیت سے رہ گئے۔

ڈھاکہ آمد اور آغاز جنگ 1971

صبح سویرے ہی ہمیں حاجی کیمپ پہنچا دیا گیا۔ ماحول پر ایک عجیب سی اُداسی اور خاموشی مسلط تھی۔ جانے والوں میں چھ سات افسروں کے علاوہ باقی سب عہدیدار اور سپاہی تھے۔ جہاز کی اَگلی نشستوں پر ہمیں بٹھانے کے لیے کچھ سپاہیوں کو اُٹھایا گیا تو اُن میں سے ایک چودہ پندرہ سال کا نوعمر سا لڑکا رو پڑا۔ سہمے سہمے سے بیٹھے ہوئے باقی بھی تقریباً اُسی کے ہم عمر تھے اور ایرہوسٹس کو میم صاحب میم صاحب کہہ کر باری باری اپنی انگلیاں دکھا کر پیشاب کرنے کی اِجازت مانگ رہے تھے۔ وہ سارے سفر کے دوران خوش اِخلاقی کے ساتھ ہر ایک سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی رہیں۔ شاید اُن کو ہم پر آئندہ بیتنے والے دنوں کا احساس تھا۔ میرے ساتھ ایس ایس جی کے کچھ سابقہ ساتھی بھی تھے جنہیں میری ہی طرح واپس بلایا گیا تھا۔ ان میں

سے میجر نصیب اللہ اور میجر مزمل ایک ائر ہوسٹس کو پاس بٹھائے کافی دیر تک اُس کی قسمت کا حال دیکھتے رہے۔ کاش نصیب اللہ اپنی قسمت کا حال بھی دیکھ سکتا!

جہاز سری لنکا کی طرف سے مشرقی پاکستان کے ساحل کے اُوپر سے گزرا تو حسنِ بنگال کے تصور سے یا پھر جنگ کے حالات سے متاثر ہو کر میری پلکیں بھیگ گئیں۔ بنگال سے میرا رشتہ کوئی اتنا پرانا تو نہیں لیکن پھر بھی بہت گہرا تھا۔ جہاز سے اترے تو ڈھاکہ ایئر پورٹ پر مکمل سکوت تھا۔ میرا چھوٹا بھائی کیپٹن عبدالرحمان بھی ڈھاکہ میں ایک سگنل یونٹ میں تھا۔ آرمی سروس کور کا کیپٹن عنایت جو میرے دوست کرنل غوث کا بھائی تھا رات کے اندھیرے میں مجھے اُس کے کمرے تک اپنی جیپ میں لے کر آیا۔ عبدالرحمان گلے ملتے ہی کہنے لگا کہ تُم بھی یہاں کیوں آ گئے ہو؟ یہاں کے حالات کا صحیح طور پر اندازہ نہیں تھا شاید اِسی لیے اُس وقت اُس کا یہ سوال بڑا عجیب لگا۔ عبدالرحمان کے ساتھ کچھ دیگر نوجوان افسر بھی اُس کے کمرے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ میس چھوڑ کر وہ یونٹ کے اندر جوانوں کے ساتھ رہ رہے تھے۔ رات کو اِکا دُکا رائفل اور مشین گن کے فائر کی آوازیں آتی رہیں۔ میرے اِستفسار پر عبدالرحمان نے بتایا کہ مُکتی باہنی ڈھاکہ کے گردونواح (ٹونگی) کے علاقے میں سرگرمِ عمل ہیں۔ دوسرے دن صبح ایسٹرن کمانڈ ہیڈکوارٹر جا کر میں نے اپنا موومنٹ آرڈر دیا تو انہوں نے مجھے ایس۔ جی کے ایک سابق افسر میجر مشتاق کے ساتھ 14 ڈویژنل ہیڈکوارٹر بھیج دیا۔ یہ جان کر حیرت ہوئی کہ بغیر اِعلانِ جنگ کے ہندوستان ہمارے کچھ علاقے پر قبضہ کر چکا ہے۔

3 دسمبر کی صبح اعلانِ جنگ کے ساتھ ہی بھارتی طیارے ڈھاکہ پر حملہ آور ہو گئے۔ ہر طرف ایک عجیب سا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ ہمارے بالکل سامنے کھجور کے ایک درخت کے ساتھ ایک طیارہ شکن (اینٹی ایئر کرافٹ گن) لگی ہوئی تھی۔

اِس پر متعین جوانوں کی ہمت اور جراَت قابل تحسین تھی ۔مورچے میں بیٹھا ایک گنر Gunner جب دشمن کے ایک دو طیارے گرا چکا تو دشمن کے ایک اور طیارے کو اُس کی پوزیشن کا علم ہوگیا۔وہ ڈائیو مار کر گولیاں برساتا ہوا اُسکی طرف بڑھا لیکن وہ انجام سے بے پرواہ مورچے کے باہر بیٹھا جوابی فائر کرتا رہا۔ ہوائی جہاز نے تیں، چالیس فُٹ کی بلندی سے اُس پر راکٹ گرائے ۔دھواں اور غبار اِس قدر تھا کہ کچھ نظر نہیں آ رہا تھا اور ایسا محسوس ہوا جیسے سب کچھ جل کر راکھ ہو گیا ہے ۔لیکن غبار ہلکا ہوا تو دھندھلاہٹ میں ایک آدمی گن کے پیچھے بیٹھا اپنی آنکھیں پونچھتا ہوا نظر آیا۔ زبان سے بے ساختہ نعرہ تحسین نکلا۔دل اسے دوڑ کر گلے لگانے کو چاہا لیکن درمیان میں کانٹے دار تاریں حائل تھیں ۔

آسمان پر بھی کچھ اِسی قسم کا منظر تھا۔ ہمارے جانباز پائلٹ ایف 86 قسم کے پرانے طیاروں کے ساتھ دشمن کے ایس یو 7 اور مِگ 31 طیاروں پر ٹوٹ پڑے ۔ ایک طیارے کا پیچھا کرتے ہوئے دو مِگ طیارے نظر آئے تو یوں لگا کہ پل بھر میں اِسے گرالیں گے ۔کاش وہ دشمن کی زد سے بچ سکے ! دِل سے بے ساختہ دعا نکلی ۔اس کا انجام یقینی تھا۔ یکایک جہاز ہوا میں سیدھا اُٹھا اور پلک جھپک میں اُن دو جہازوں کے عقب میں پہنچ گیا۔ پہلے ایک اور پھر دوسرا ہندوستانی جہاز لڑکھڑاتا ہوا نظروں سے اوجھل ہوگیا۔اگر اپنی آنکھوں سے نہ دیکھتا تو یقین نہ آتا ۔

سارا دن ہوائی حملے اِسی طرح جاری رہے۔ بالکل ہمارے اُوپر ایک جہاز سے دو بم گرتے نظر آئے تو میں نے عبدالرحمان سے کہا کہ زمین پر لیٹ جاؤ لیکن کسی دھماکے کی آواز نہیں آئی ۔تیں چالیس گز کے فاصلے پر پٹرول کے خالی ٹینک گرے تو اپنی حرکت پر شرمندگی ہوئی ۔ ہندوستانی جہازوں کی پرواز زمین کے اتنے قریب ہوتی تھی کہ پائلٹوں کے چہرے صاف نظر آتے تھے۔ ہمارے دلیر ہواباز

جہازوں کی کم تعداد (شاید ایک سکواڈرن) کے باوجود بے جگری سے لڑتے رہے اور دشمن کے جہازوں کو گراتے رہے۔لیکن ایک دو دنوں کے بعد دشمن کی بمباری کی وجہ سے رن وے ناقابل استعمال ہوگئی اور انجینئرز کے میرے دوست میجر بشیرالدین کی انتھک کاوشوں کے باوجود بحال نہ ہوسکی اور چاروناچار ہمارے جہازوں کو گراؤنڈ ہونا پڑا اور پائلٹوں کو برما کے ذریعے پاکستان بھیج دیا گیا۔ مجھے ایک اچھوتا خیال آیا کہ اگر جہازوں کو ہیلی کاپٹروں کے ذریعے اوپر اٹھا کر بلندی پر چھوڑا جاتا تو وہ اڑ کر برما کی طرف نکل سکتے تھے۔ایسے خیالات کی پرواز پر کسی کو کیا اعتراض ہوسکتا ہے!!

آج ایسٹرن کمانڈ ہیڈکوارٹر جا کر پتہ چلا کہ ہمیں تین مہینے کے لیے رضاکاروں کو گوریلا تربیت دینے کے لیے بلایا گیا تھا۔لیکن وہاں تو 22 نومبر سے باقاعدہ جنگ جاری تھی۔ سیکنڈ کمانڈو بٹالین جا کر اپنے دوست میجر بلال (چند دنوں کے بعد بلال میجر جنرل رحیم جس نے شاید اسے اپنی حفاظت کے لیئے ساتھ رکھا ہوا تھا کے ساتھ گن بوٹ پر ہوائی حملے کے دوران شہید ہوگیا تھا) سے کہا کہ مجھے بٹالین میں پوسٹ کروالو۔ سیکنڈ اِن کمانڈ میجر پیرداد نے وعدہ کیا کہ وہ ایسٹرن کمانڈ جا کر اِس سلسلے میں بات کریگا۔ بِلال سخت مایوس نظر آیا۔اُسے شکایت تھی کہ کوئی کام کا مِشن نہیں دیا جارہا۔اس نے ٹھیک ہی تو کہا تھا۔ہم نے ایس۔ایس۔جی قائم تو کر لی تھی لیکن نہ 1965 کی لڑائی اور نہ ہی 1971 کی لڑائی میں اس کی صلاحیت کے مطابق اس سے کوئی کام لے سکے۔اس کا وہ رول (امریکہ کے اس منصوبے کے تحت کہ اگر روس پاکستان پر قبضہ کرلے تو یہ لوگ گوریلا فورس کی حیثیت سے اس کے خلاف مزاحمت کریں گے) جس کے لیئے امریکہ کی مدد سے اسے تیار کیا گیا تھا ہم بعد میں اس طرح تبدیل نہ کرسکے تھے جو ایک ریگولر کمانڈو فورس کے لیئے ہونا چاہیے

تھا۔ یہ ایک طرح کی سٹریٹیجک فورس ہے جسے ہم پلاٹونوں میں تقسیم کر کے مختلف محاذوں پر بر ڈویژنوں اور بر گیڈوں کے حوالے کرتے رہے ہیں۔ رات کے وقت کیپٹن چیمہ ایجوٹنٹ سیکنڈ کمانڈ و بٹالین اور کیپٹن جمشید مجھے لینے آئے کہ کل رات کسی مِشن پر جانا ہے۔ میں نے صبح اپنا سامان لے کر آنے کا وعدہ کیا۔ دِل تو نہیں چاہتا تھا کہ عبدالرحمان کو ان حالات میں چھوڑ کر جاؤں لیکن یہ بھی تو ممکن نہیں تھا کہ جنگ ہو رہی ہو اور میں ناکارہ پڑا رہوں۔ صبح پتہ چلا کہ یہ مشن ختم کر دیا گیا ہے۔ وہی افراتفری اور پلانگ کا فقدان ہمارے آڑے آ رہا تھا۔

اگلے مورچوں پر

دوسرے دِن 14 ڈیو ہیڈ کوارٹر سے پیغام آیا کہ میں آج رات براہمن باڑیہ چلا جاؤں۔ مجھ سے ایک سینئر سابقہ ایس۔ایس۔جی افسر میجر مشتاق (بعد میں برگیڈئیر) کو بھی ہمارے ساتھ بھیجا گیا۔ رات کی تاریکی میں متعدد افسروں اور جوانوں کے ساتھ ہمیں ڈھاکہ سے نرائن گنج کی جیٹی پر پہنچا دیا گیا۔ بہت سا سامانِ خورد و نوش اور ایمونیشن ہمارے ساتھ جانا تھا لیکن کوئی ذمہ دار افسر نظر نہیں آیا۔ میں آرام کی غرض سے بڑے سے ایک ہال میں ایک خالی میز پر دراز ہو گیا۔ صبح تمام جوانوں کو فالن کیا اور اُن سے کھانے کے بارے میں پوچھا تو جواب ملا کہ یہاں اس کا کوئی بندوبست نہیں ہے۔ لانچوں پر لدے ہوئے راشن سے کچھ نکلوا کر ان سے کھانا پکوایا۔ صبح کچھ افسر دفتروں میں آئے لیکن وہ ہمارے جانے

کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ جنگ کے باوجود معمول کے دفتری اوقات کا لحاظ رکھا جا رہا تھا۔ شام کو کچھ اور افسر اور جوان ہمارے ساتھ جانے کے لیئے بھیجے گئے۔ آرڈیننس کا ایک جے سی او جو سن پینسٹھ کی جنگ میں چھمب جوڑیاں سیکٹر میں ہمارے برگیڈ کا آرڈیننس جے سی او تھا انتہائی اہم سامانِ رسد براہمن باڑیہ اور سلہٹ کے محاذوں کے لیے لے کر ہمارے ساتھ جا رہا تھا۔ کوچ کیلئے رات کا اِنتظار تھا۔ دوبارہ بلائے گئے ایک عمر رسیدہ لیکن چاک وچوبند اور ہاتھ میں میگا فون لیئے ایک مستعد نیوی کے افسر سے پتہ چلا کہ گیارہ فوجیوں اور سامان سے لدی ہوئی لانچوں اور چھوٹے جہازوں کے اس قافلے نے آج رات آشوگنج کیلئے روانہ ہونا ہے۔ دن بھر ہوائی حملے ہوتے رہے لیکن میگھنا کے کنارے کھڑے کسی بھی جہاز کو کوئی گزند نہیں پہنچی۔ البتہ ساتھ ہی ریلوے سائیڈنگ پر ایک ایمونیشن سے بھری گاڑی کو آگ لگ گئی۔ دوپہر کو کھانا میس میں کھایا۔ حیرت ہوئی کہ میس کے ہوتے ہوئے ہمیں ساری رات بنچوں اور میزوں پر سونا پڑا۔ آرڈیننس کے کرنل سلیم بیگ نے جو کافی خوش اخلاق اور ہنس مکھ افسر تھے ہماری خوب خاطر تواضع کی۔ سگنل کا کیپٹن نسیم سی۔ ایم۔ ایچ ڈھاکہ سے محاذ پر اپنے برگیڈ جہاں وہ جی۔ تھری کی حیثیت سے کام کر رہا تھا واپس پہنچنے کے لئے بغیر ڈِسچارج سلِپ لیئے آ گیا تو میں نے روائتی انداز میں سوچتے ہوئے اُسے کہا کہ تمہیں اسطرح نہیں آنا چاہیے تھا۔ میں اِس قافلے کا خود ساختہ کمانڈر بنا ہوا تھا۔ دس پندرہ میل واپِس جا کر وہ ڈسچارج سلِپ لے آیا۔ ہمارے ساتھ ایک گن بوٹ قافلے کی حفاظت کے لیئے جا رہی تھی۔ اس کا کمانڈر لیفٹیننٹ شاھد کریم اللہ (بعد میں نیول چیف) تھا۔ میں رات بھر گن بوٹ میں سکون سے سویا۔ صبح جاگا تو باہر دھند تھی اور لیفٹیننٹ شاھد دوربین کی مدد سے سامنے والے علاقے کا جائزہ لے رہا تھا۔ شاید ساری رات وہ اِسی طرح بیٹھا رہا اور لمبے لمبے

بانسوں کے ساتھ پانی کی گہرائی جانچنے والے ایک بنگالی سولین ملاح کی مدد سے قافلے کی راہ متعین کرتا رہا مبادا کوئی جہاز ریت میں نہ پھنس جائے یا دشمن کی کسی طرح کی کاروائی کی زد میں نہ آجائے۔

سامنے دریائے میگھنا پر بھیراب بازار کے پاس مشرقی پاکستان کا دوسرا بڑا پُل تھا۔کیا خبر تھی کہ اِتنے خوبصورت منظر میں ڈھلا ہوا یہ پُل میرے ہی ہاتھوں تباہ ہوگا۔سورج کی کرنیں دھند پر ہلکی ہلکی سرخی بکھیر رہی تھیں۔دائیں طرف غلے کا ذخیرہ کرنے کے لیے ایک بہت اُونچا گودام (silo) تھا۔جہاز پل سے چند گز دور جیٹی کے ساتھ رُک گئے۔کنارے پر ای۔پی۔سی۔اے۔ایف E.P.C.A.F (ایسٹ پاکستان سِول آرمڈ فورس) کے چند آدمی مورچے سنبھالے بیٹھے تھے۔اِنہیں دیکھ کر ترس آیا۔ساٹھ پینسٹھ سال کی عمر کے سپاہیوں کے ساتھ کچھ ایسے بھی تھے جن کی عمر بمشکل پندرہ سولہ سال تھی۔کافی دیر تک ہمیں اور سامان لینے کیلئے کوئی نہیں آیا۔سب لانچیں کنارے کے ساتھ کھڑی دشمن کے ہوائی حملے کے لیے ایک آسان ٹارگٹ بنی ہوئی تھیں۔اچانک دشمن کے دو جہاز حملہ آور ہوئے لیکن ہماری مشین گنوں اور راکٹوں کے فائر سے ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔دوسری بار جہاز ڈائیو لگائے بغیر ڈھاکہ کی طرف چلے گئے۔ایسا لگ رہا تھا کہ ڈھاکہ پر اس دن شدید ہوائی حملے ہو رہے ہیں کیونکہ دشمن کے لاتعداد ہوائی جہاز اُدھر آجا رہے تھے۔شاید انہی حملوں نے پیپر ٹائیگر نیازی کی ہوا نکال دی تھی۔بمشکل تمام دوسرے کنارے سے اے۔ایس۔سی کا ایک جے۔سی۔او برآمد ہوا۔محاذ جنگ یہاں سے دس پندرہ میل دور براہمن باڑیہ میں تھا لیکن ہمیں فی الحال یہیں رُکنے کے لیے کہا گیا تھا۔آزاد کشمیر رجمنٹ کی ایک کمپنی پُل کی حفاظت پر ماءمور تھی۔بظاہر ڈھیلے ڈھالے سے ایک کپتان (تہذیب) نے کمپنی کی کمان سنبھال رکھی تھی۔ہمارے لیئے

چائے اور کھانے کا بندوبست بھی اُسی نے کیا۔ آرمی سروس کور (ASC) کی ایک پلاٹون کے علاوہ اس وقت کوئی اور یونٹ بھیراب بازار میں موجود نہیں تھی۔ ریلوے کالونی کے کوارٹروں میں جہازوں سے سامان اُتروا کر رکھوایا گیا۔ دوپہر تک ڈویژن کے ٹیک ہیڈ کوارٹر کے چند افسر بھی پہنچ گئے۔

27 برگیڈ کا براہمن باڑیا سے انخلاء

دسمبر کی چھ تاریخ رات کو ڈیو ہیڈ کوارٹر کا باقی عملہ بھی پہنچ گیا۔ کسی کو پتہ نہیں تھا کہ مجھے اور میجر مشتاق کو کون سا کام دیا جانا ہے۔ شام کو مجھے اور آرٹلری کے میجر سعید کو، جو میرے ساتھ ڈھاکہ سے آیا تھا، براہمن باڑیہ کی طرف سے ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ تازہ بنی ہوئی کچی سڑک پر ڈویژن کی گاڑیاں نکال کر لانے کے لیے کہا گیا۔ پسپائی سے پہلے اس سڑک کا کوئی وجود نہیں تھا۔ اِنجینئر کے جوان بُل ڈوزر کی مدد سے بار بار راستہ ٹھیک کر کے گاڑیاں آگے لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اِن کی فرض شناسی پر رشک آیا۔ کئی جگہ سڑک دلدل بن گئی تھی اور گاڑیاں اس کے بیچ میں دھنس گئی تھیں۔ چونکہ سڑک ایک طرف سے کچھ اونچی اور پھسلن زیادہ تھی اس لیئے ڈرائیوروں کو گاڑیوں کا توازن برقرار رکھنا کافی مشکل ہو رہا تھا۔

ایک گاڑی میرے سامنے اُلٹ کر ایک گندے جوہڑ میں گر گئی اور کچھ جوان اور برقعہ پہنے ایک عورت اور شاید ایک دو بچے نیچے آ گئے۔ عورت شاید بنگالی یا بہاری تھی لیکن خاوند مغربی پاکستانی کی کسی انفنٹری یونٹ کا حوالدار تھا۔ بیوی کو

کندھوں پر اُٹھا کر چل پڑا لیکن اس کا زادِ سفر کیچڑ میں ہی رہ گیا۔ کسی کو کسی کی فکر نہیں تھی۔ جو بچ گئے وہ اپنے ہتھیاروں وغیرہ کی، جو کیچڑ میں گر گئے تھے، پرواہ کیے بغیر جانے لگے تو میں نے اُن کو روک کر ہتھیاروں اور زخمیوں کو باہر نکلوایا۔ دو چار جوان اس پریشانی میں تھے کہ کیچڑ سے نکلے ہوئے کمبلوں کو کیسے ساتھ لے جایا جائے۔ ساری رات کی کاوش کے بعد صبح تک پچاس ساٹھ گاڑیاں ہی نکل کر پیچھے جاسکیں۔ ریلوے لائن پر اِنسانوں کی ایک ہی لمبی قطار میں بوڑھے، بچے، عورتیں، فوجی، نیم فوجی بھیراب بازار کی طرف رواں دواں تھے۔ ان میں ادھیڑ عمر کا ایک پٹھان کنٹین کنٹریکٹر سر پر ٹین کا ایک بھاری صندوق اٹھائے جا رہا تھا لیکن اب تھک ہار کر بیٹھ گیا تھا اور صندوق میں سے چیزیں نکال نکال کر پھینک رہا تھا۔ کوئی کسی سے بات نہیں کر رہا تھا ہر ایک اپنی سوچوں میں گُم رواں دواں تھا۔ ایک اِسٹیشن پر ایف ایف بٹالین کا ایک کمپنی کمانڈر اور اس کے افسر میں تکرار ہو رہی تھی۔ کمپنی کمانڈر بیس روپے میں آشوگنج بازار سے کمپنی کے لیے کھانا منگوانا چاہتا تھا لیکن اس کے کمپنی افسر کو شکایت تھی کہ بیس روپے تھوڑے ہیں۔ رات کے اس پہر کون سی دوکان سے روٹی خریدنے کے ارادے تھے؟ بازاروں میں تو ویسے بھی کتے بھونک رہے تھے۔ سویلین تو شہر چھوڑ چھاڑ کر بھاگ گئے تھے۔ میں نے بیچ بچاؤ کیا تو پتہ چلا کہ میجر صاحب اپنی کمپنی سمیت تین میل دور اپنی دفاعی پوزیشن چھوڑ کر کمپنی کو کھانا کھلانے کی فکر میں ہیں۔ اِسی جگہ ایس ایس جی SSG کے کچھ لوگ نظر آئے تو ایک دو کو پہچان کر انہیں اپنے پاس بلایا۔ خوب تپاک سے ملے۔ اِن کے پلاٹون کمانڈر کیپٹن اکبر سے بھی ملاقات ہوئی۔ حیرت ہوئی کہ انہیں ان حالات میں بھی ان کی صلاحیت کے مطابق کوئی کام کیوں نہیں دیا گیا۔ تھوڑی دیر رکنے کے بعد وہ بھی چل پڑے۔ البتہ ان میں ابھی کچھ نظم و ضبط نظر آ رہا تھا۔ انفنٹری کی کسی

یونٹ جو شاید بکھر گئی تھی کا ایک لیفٹیننٹ کرنل اپنے کسی کپتان کو ڈانٹ رہا تھا کہ براہمن باڑیہ سے میرے ائیر کنڈیشنر (سرکاری) کیوں نہیں لائے۔ یہی کرنل بھیراب بازار میں کرنل ٹنل کے نام سے مشہور ہوا کیونکہ اس نے لڑائی کے باقی تمام دن ریلوے کی ایک پلی کے نیچے دبک کر گذارے تھے۔ ماسوائے ایئر کنڈیشنر کے باقی تمام سہولتیں اس نے ٹنل کے اندر ہی مہیا کر لیں تھیں۔ کپتان واپس جانے سے انکار کر رہا تھا۔ گولیوں کے منہ میں بھلا کون ان چیزوں کے لیے جاتا ہے۔

ہم رات کے تھکے ہارے ڈیو ہیڈ کوارٹر پہنچے اور ڈی کیو کو بتایا کہ تقریباً پچاس گاڑیاں نکل آئی ہیں۔ اسے یقین نہیں آیا کہ یہ کیسے ممکن ہوا۔ شاید اِسی لیے تمام افسر اپنی یونٹ کی بڑی گاڑیاں چھوڑ کر جیپوں میں آ گئے تھے۔ پیچھے ہٹنے کی پلاننگ اسٹاف کالج کی سکھلائی کا منہ چڑھا رہی تھی۔ ایس۔ پی کنٹرول پوائنٹ اور ایم۔ پی کا کوئی نشان نظر نہیں آیا۔ ڈویژن کا عملہ؟ شاید یہ اُن کا کام نہیں تھا۔ جب گاڑیاں پھنس گیئں تو ہمیں بھیج دیا گیا کہ نکال لاؤ۔ خیر خوش تھا کہ کرنے کو کوئی کام تو ملا۔ ڈیو والوں کو مشورہ دیا کہ براہمن باڑیہ سے ریلوے انجن لائے جائیں تاکہ ڈھاکہ سے سامانِ رسد و رسائل کا بندوبست ہو سکے کیونکہ بھیراب بازار سے ڈھاکہ تک کسی بھی کچی یا پکی سڑک کا وجود نہیں تھا۔ میرے مشورے پر عمل کرتے ہوئے میرے ساتھ ایک بنگالی ریلوے گارڈ اور ایک لائن مین کے علاوہ انجینیرز کا ایک بنگالی افسر اور بُل ڈوزر ڈرایئور (جس نے شاید ڈیزل انجنوں کا کوئی کورس کیا ہوا تھا) بھیج دیئے گئے۔ براہمن باڑیا میں زبردست جنگ جاری تھی۔ ریلوے اسٹیشن کے پاس 33 بلوچ کی ایک کمپنی مدافعتی جنگ لڑ رہی تھی۔ اسٹیشن پر تین انجن نظر آئے لیکن کیبنوں کو تالے لگے ہوئے تھے۔ عملے کا کوئی آدمی وہاں موجود نہیں تھا۔ تالا توڑا تو اندر بے شمار سوِچوں اور لیوروں سے پالا پڑا۔ انجینئر کا جوان اس قسم کے انجن چلانا

نہیں جانتا تھا۔ایک انجن کے ڈیزل ٹینک پر راکٹ لگنے سے سوراخ ہوگیا تھا جس کی وجہ سے تیل آہستہ آہستہ نیچے گر رہا تھا لیکن انجن کو ابھی تک آگ نہیں لگی تھی۔ ہمارے بالکل سامنے سے ایک مشین گنراور رائفل مین آئے جنہوں نے بتایا کہ ان کا کمپنی کمانڈر زخمی ہوگیا ہے اور وہ سب پیچھے ہٹ رہے ہیں۔ پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر کچھ آدمیوں نے پوزیشن سنبھال رکھی تھی لیکن گھنے درختوں کی وجہ سے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ انڈین ہیں یا پاکستانی۔البتہ مشین گنر کے مطابق انڈین ریلوے لائن عبور کر کے اس طرف آچکے تھے۔ہم نے بہتے ہوئے ڈیزل میں کپڑے بھگو کر انجنوں پر پھینکے تو انہیں آہستہ آہستہ آگ لگ گئی۔

واپسی پر 33 بلوچ رجمنٹ کے کرنل آفتاب اور آرٹلری کے میجر خرم عین بازار میں ایک وائرلیس سیٹ کے پاس بیٹھے نظر آئے۔شاید 33 بلوچ کا عارضی بٹالین ہیڈکوارٹر وہیں پر تھا۔ہمیں دیکھ کر حیران ہوئے کہ یہ لوگ اتنے آگے آکر کیا کر رہے ہیں۔میرے ہاتھ ہلانے پر میجر خرم نے پہچان کر جوابی طور پر ہاتھ ہلایا۔اس کے چہرے پر شدید تھکن کے آثار تھے شاید کئی دنوں سے بیٹری کمانڈر کی حیثیت سے مسلسل آرٹلری فائر کروا رہا تھا۔واپسی پر ہوائی جہازوں نے ہم پرحملہ کیا تو ہم گاڑی روک کر درختوں کے نیچے چلے گئے۔ بنگالی گارڈ اور لائن مین کھلے میدان میں زمین کے اندر گھسنے کی کوشش کر رہے تھے۔ان کی اس مضحکہ خیز پوزیشن پر ہنسی آئی۔ان کو آواز دی کہ ادھر درختوں کے نیچے آجاؤ لیکن باپ رے باپ رے کے وِرد میں انہیں کچھ سنائی نہیں دیا۔ جہاز نے ڈائیو ماری تو ایسا لگا کہ وہ ہماری جیپ پر جھپٹا ہے لیکن چند گز دور کیچڑ میں پھنسی ہوئی گاڑی میں سے شعلے بلند ہوئے۔ میں نہ جانے کس خیال سے بھاگ کر اپنی گاڑی کا سوِچ آف کر آیا۔سب میری اس بے تکی حرکت پر حیران تھے۔بھیراب بازار پہنچا تو پتہ چلا کہ ڈھاکہ تک تقریباً تمام

پُل کئی مہینے قبل مکتیوں نے اڑا دیئے تھے۔ انجن لانے کے لئے بھیجنے سے پہلے ہمیں یہ بات کیوں نہ بتائی گئی؟ خیر انہوں نے بھیجنے سے پہلے ہمیں یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ براہمن باڑیا میں کیا ہورہا ہے۔ غالباً انہیں خود بھی اس چیز کا علم نہیں تھا۔ اسی دن ڈیو کے ڈی۔ کیو نے پیغام بھیجوایا کہ میں نے دو وی۔ پی۔ کمپنیوں (شاید یہ 12 ایف۔ ایف کی وہ کمپنیاں تھیں جو ایسٹرن کمانڈ کے حکم پر ڈھاکہ کے دفاع کے لئے بھیجوائی گئیں تھیں لیکن ان کا بعد میں کوئی پتہ نہیں چلا کہ ان کے ساتھ کیا ہوا) کے ساتھ کوئی دفاعی مورچہ سنبھالنا ہے۔ وی پی نام تو غیر مانوس سا تھا لیکن یہ سوچ کر کہ اسپیشل قسم کی کمپنیاں ہوں گی اسی لیے وی۔ آئی۔ پی VIP سے ملتا جلتا نام ہے۔ پی۔ ایم۔ اے میں سیکھا ہوا ولنرایبل پوائنٹ VP (اہم تنصیب) اس وقت ذہن سے نکل گیا۔ سامان تھیلے میں ڈال کر جانے کے انتظار میں بیٹھا تھا کہ پتہ چلا کہ جی۔ او۔ سی GOC نے کسی اور کو بھیج دیا ہے۔ مجھے بھی اُنہوں نے بلا بھیجا۔ کیپٹن اکبر سے وہ کسی بات پر ناخوش تھے۔ ایس ایس جی کے میجر مشتاق نے یہ کہہ کر کہ میں کمانڈوز کی ٹریننگ بھول چکا ہوں کمانڈو فورس کی کمان سنبھالنے سے انکار کر دیا تھا۔ جی۔ او۔ سی میجر جنرل عبدالمجید لااُبالی سے انسان تھے اور بہت سے لوگ ان کی تند مزاجی کا شکار ہو چکے تھے۔ مجھے ایس ایس جی کے تیس جوانوں کے علاوہ سپیشل مجاہد فورس کے بھی بیس آدمی دیئے گئے۔ میں نے اپنا سامان اُٹھا کر ریلوے کواٹروں کے ایک کمرے میں رکھ دیا۔ باقی فورس وہاں پہلے سے موجود تھی۔ ہم میگھنا کے مغربی کنارے پر تھے اور 27 برگیڈ ہیڈکوارٹرز اور اس کی یونٹیں دریا کے اس پار آشوگنج شہر کے آس پاس دفاعی جنگ لڑتے لڑتے پیچھے آرہی تھیں۔ میں اپنے کچھ جوانوں کے ساتھ دریا کے اس پار گیا تاکہ رات گھات لگانے کے لیے دشمن کی پوزیشن کا اندازہ لگا سکوں۔ لیکن پُل سے دہ تین میل آگے تو نقشہ ہی کچھ اور تھا۔

بہت سے جوان ہماری طرف بھاگتے ہوئے نظر آئے۔ریلوے لائن کے اُوپر کھڑے میجر جنرل مجید چندسٹاف افسروں کے ساتھ حالات کا جائزہ لے رہے تھے۔دشمن کے وائرلیس پیغام کو ہمارے ایک وائرلیس سیٹ پر سنا گیا جس میں کوئی افسراپنے سی۔او کو بتا رہا تھا کہ پاکستانی جرنیل ہمارے ہتھیاروں کی زد میں ہے کیا ہم اس پر فائر کریں۔اس کے جواب میں اسے کہا گیا کہ نہیں ان کو زندہ پکڑنا ہے۔جرنل صاحب نے ایک لانس نائیک کو جواپنی ایل ایم جیLMG کے ساتھ واپس بھاگ رہا تھا روک کر ایک جگہ پوزیشن سنبھالنے کو کہا۔لیکن جونہی جرنیل صاحب دوسری طرف متوجہ ہوئے جوان نے اپنی راہ لی۔آہ!!وہ وقت بھی آ گیا کہ ایک سپاھی بھی جرنیل کے براہ راست حکم کوکوئی اہمیت نہیں دے رہا۔فوج میں تو سیکشن کمانڈر کے حکم پر پوری سیکشن جان کی بازی لگا کر دشمن پر ٹوٹ پڑتی ہے اور یہاں یہ عالم!! کچھ ہی فاصلے پر برگیڈ میجر سرفراز لوگوں کوروک کر ریلوے لائن پر پوزیشن سنبھالنے کا کہہ رہے تھے۔ایک جوان سے ایل ایم جی سے سامنے آتے دشمن پر فائرکروارہے تھے کہ اچانک ایک گولی ان کی گردن میں آ لگی۔شاید ایک اور مردِ مجاہد؟ مگر وہ زندہ تھے۔گولی معجزانہ طور پر ریڑھ اور شہ رگ کو کوئی نقصان پہنچائے بغیر انہیں شدید زخمی کرگئی تھی۔ برگیڈ ہیڈکوارٹر بھی ریلوے لائن کے ساتھ ہی تھا۔ایک اُونچے راستے پر کھڑی ریکائل لیس رائفلRR ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ آتے ہوئے دوٹینکوں پر فائرکررہی تھی۔آر۔اینڈ۔ایس R&S کمپنی کے کیپٹن بلوچ کے ساتھ ایک لمبا تڑنگا جوان کھڑا نظر آیا۔پاس پہنچنے پر برگیڈیر سعد اللہ کو پہچان کرسیلوٹ کیا۔بڑے تپاک سے ملے۔حیرت ہوئی کہ آر۔آرکس اصول کے تحت پوزیشن لیئے ہوئے ہے۔لیکن یہاں اصولوں کو اپنانے کا وقت نہیں تھا۔دشمن کا دباؤ شدید تھا۔کچھ ٹینک ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے دھوئیں کی سکرین

بنا کر پیچھے ہٹ گئے۔ بہت سے جوان ریلوے لائن کے شمال کی طرف سے ہماری طرف بھاگتے ہوئے نظر آئے تو بریگیڈ کمانڈر نے با آواز بلند انہیں واپس جانے کی تلقین کی۔لیکن جوانوں کا کہنا تھا کہ دشمن کے بہت سے ٹینک درختوں کے بیچوں بیچ اس طرف آ رہے ہیں۔میرے کہنے پر کہ اگر راکٹ لانچر ہو تو ٹینکوں کے قریب جا کر ان پر فائر کروں بریگیڈئر صاحب نے چند لوگوں سے پوچھا لیکن کسی کے پاس یہ ہتھیار موجود نہیں تھا۔میرے پاس ابھی تک کسی قسم کا کوئی ہتھیار نہیں تھا۔تھوڑی دیر رکنے کے بعد میں واپس ڈیو ہیڈ کوارٹر آ گیا۔

بھیراب بازار۔شکاری کا جال یا حصار

براہمن باڑیا سے پیچھے آنے کے بعد 27 بریگیڈ نے آشوگنج جو دریائے میگھنا کے مشرقی کنارے پر ایک چھوٹا سا قصبہ تھا میں دفاعی پوزیشن لے لی تھی جس کا میرے خیال میں کوئی جواز نہیں تھا۔اگر معجزانہ طور پر ہندوستانی حملے کو بریگیڈئر سعداللہ اور دو تین سو جوان تتر بتر نہ کر دیتے تو پورا بریگیڈ ہندوستانی فوج کے گھیرے میں آ جاتا اور ان کا دریا کے دوسرے کنارے پر پہنچنا ناممکن ہو جاتا۔زیادہ سے زیادہ ایک کمپنی سے دشمن کی پیش قدمی روک کر باقی بریگیڈ پل کے ذریعے دوسرے کنارے پر واقع بھیراب بازار جا سکتا تھا اور دفاعی کمپنی کے انخلاء کے بعد بریگیڈ اور وہاں پر موجود ڈیو کا ٹیک ہیڈکوارٹر، انجینئر بٹالین، آرٹلری رجمنٹ، سگنل کمپنی اور باقی چھوٹی یونٹیں بھیراب بازار سے ڈھاکہ کے نزدیک نرسندھی اور نراہن گنج

میں دفاعی پوزیشن سنبھال لیتیں تو وہ اس طرح ڈھاکہ کے دفاع کو مضبوط بنا سکتی تھیں۔معجزاتی طور پر دشمن کے حملے کو ناکام بنانے اور اس کے 8 ٹینکوں کو ناکارہ بنانے کے بعد ہندوستانی بہت محتاط ہو گئے تھے اور آشوگج سے ہمارے انخلاء کے بعد انہوں نے دوسرے کنارے کے پاس بھی آنے کی جرأت نہیں کی تھی۔یہی موقع تھا کہ ہم ان دو دنوں میں اپنی تمام فوج کو بھیراب بازار سے رات کے وقت بآسانی ڈھاکہ کے قریب تر لا سکتے تھے۔بھیراب بازار میں بلا جواز رکنے سے ہندوستانی فوج کو موقع مل گیا اور اس نے اپنی دو بٹالین فوج بھیراب بازار اور ڈھاکہ کے درمیان ہیلی کاپٹروں اور کشتیوں کے ذریعے اتار کر کچھ کمپنیاں ہمیں روکنے کے لئیے دفاعی پوزیشن میں لگا کر ڈھاکہ کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔نتیجاتا ڈحاکہ، جس کا حیرت انگیز طور پر دفاع کا کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں کیا گیا تھا، میں موجود ایسٹرن کمانڈ کے کمانڈر لفٹینٹ جرنل نیازی گھبرا کر سرنڈر کرنے پر تیار ہو گیا۔سرنڈر کے بارے میں آگے تفصیلا ذکر آئے گا۔

بہت سے جوان اپنی یونٹوں سے الگ ہو کر بھیراب بازار میں ریلوے کوارٹروں میں چھپے بیٹھے تھے۔اچانک ہم پر ہوائی حملہ ہو گیا۔ٹارگٹ شاید یہی کوارٹر تھے۔دھماکے کی آواز کے فوراً بعد ساتھ والے کوارٹر سے دھواں، گرد و غبار اور چیخیں بلند ہوئیں تو ہم باہر نکل آئے۔ایک زخمی سپاہی اپنے ساتھیوں کو ملبے سے نکال رہا تھا۔دس بارہ سپاہی شہید ہو گئے تھے۔پاس کھڑے جوان سراسیمگی کے عالم میں تھے اور اس کی مدد کو نہیں آرہے تھے۔میں اور کیپٹن اکبر کمرے میں داخل ہوئے تو ہمارے بالکل سامنے بیٹھی ہوئی حالت میں ایک سر کٹی لاش نظر آئی۔شدید زخمی حالت میں ہم ایک سپاہی کو باہر لے آئے۔پہلے والے زخمی سپاہی نے بھی ہمارا ہاتھ بٹایا۔چند لمحوں کے بعد باہر لائے گئے شخص نے جان دے دی لیکن مرنے سے پہلے

اس نے جو کچھ کہا اس سے میرے دل پر عجیب سا اثر پڑا۔ گو فوراُ ہی اپنے آپ پر قابو پا لیا لیکن احساس ندامت باقی رہا۔

میرے خیال میں موت کا ڈر انسانی فطرت کا حصہ ہے فرق ہے تو صرف اتنا کہ اس خوف کی حالت میں انسان کا ردعمل کیا ہوتا ہے۔ چوں مرگ آید تبسم بر لب اوست والی بات کم از کم میرے احاطہ یقین میں نہیں آتی۔ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ زخمیوں کو کہاں لے جائیں۔ ڈاکٹروں کو تو اپنی ہوش نہیں تھی کسی مریض کی کیا دیکھ بھال کرتے۔ سنا تھا کہ مین ڈریسنگ سٹیشن (MDS) میں میٹھی گولیوں اور ٹافیوں کے علاوہ دینے کے لیئے کوئی دوائی نہیں۔ زخمی اور اپاہج اپنی اپنی یونٹوں میں اس خیال سے چلے گئے کہ وہاں ان کا کوئی پرسان حال تو ہوگا، شاید کوئی ساتھی انہیں ایک آدھ چپاتی ہی پکا دے گا۔ ہر کوارٹر میں لاتعداد جوان گھسے ہوئے تھے اور کچھ افسر اور جے سی اوز اپنے اپنے جوانوں کو ڈھونڈ رہے تھے۔ کیونکہ یونٹیں بکھر گئی تھیں اور فوری طور پر دفاعی پوزیشنیں سنبھال نہ سکی تھیں اس لیئے اگر اس وقت ہندوستانی حملہ کر دیتے تو شاید ہم اپنا موئثر طور پر دفاع نہ کر پاتے۔

بھیراب بازار کا پُل اُڑانے کا کام 11 انجینیر بٹالین کو سونپا گیا تھا جس کے کمانڈر چھوٹے سے قد کے ہنس مکھ افسر کرنل ثروت تھے۔ گھبراہٹ کے کوئی آثار ان کے چہرے پر عیاں نہیں تھے۔ مجھ سے پُل اُڑانے کے بارے میں رائے لی تو میں نے انہیں مشورہ دیا کہ پُل اُڑانے کی ذمہ داری ہمیں سونپ دی جائے کیوں کہ انجینئر کے جوان شاید اُسے نہ اُڑا سکیں۔ پہلے بھی وہ براہمن باڑیہ سے آتے ہوئے ایک پُل کو اڑائے بغیر چھوڑ آئے تھے۔ میں نے پُل پر لگے چارج چیک کیئے اور دشمن کے متوقع حملے کے پیشِ نظر کمانڈو کے ایک دو جوان لے کر پُل کے اُوپر ہی سو گیا۔ صبح ہمارے کچھ جوان جنہیں رات دشمن کے علاقے میں گھات لگانے بھیجا تھا

آشوگنج کی طرف سے آئے تو دشمن کی متوقع کاروائی کے پیش نظر انہیں بھی وہیں روک لیا۔

پُل سے ایک ڈیڑھ میل شمال کی جانب بہت سے بنگالی دریا عبور کر رہے تھے۔ ڈویژن والوں کا خیال تھا کہ شاید مکتی بانی یا ہندوستانی اُدھر سے حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے گن بوٹ میں اس گھاٹ پر جا کر تحقیق کرنے کو کہا گیا۔ مگر ماسوائے سویلین اور کچھ جانوروں کے، وہاں اور کچھ نظر نہیں آیا۔ اس خیال سے کہ مکتی گاؤں میں چھپ گئے ہوں گے میں نے دس بارہ جوانوں کے ساتھ گاؤں کے اندر تک جا کر دیکھا لیکن وہاں بھی کوئی مکتی یا ہندوستانی موجود نہیں تھا۔ اس دوران لیفٹیننٹ شاھد گن بوٹ سے ہمیں فائر سپورٹ دینے کے لئیے تیار رہا لیکن گاؤں اور اس سے دو تین سو گز آگے تک کوئی دشمن نظر نہیں آیا نہ ہی ہماری طرف کسی نے فائر کیا۔ کنارے پر کھڑی بہت سی کشتیوں پر پَٹ سَن لدی ہوئی تھی۔ ملاحوں کی چال ڈھال سے اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ مکتی ہیں یا پُر اَمن شہری۔ بہر حال ہمیں دیکھ کر انہوں نے کشتیوں پر پاکستانی جھنڈے لگا لیے تھے۔ دریا کا پاٹ یہاں بہت وسیع تھا اور ڈوبتے سورج کے آگے سپاری اور ناریل کے درخت بہت بھلے لگ رہے تھے۔ حالاتِ جنگ کے باوجود ماحول میں کتنا ٹھہراؤ کتنا سکون تھا۔ دل چاہا کہ کسی تصوراتی حسینہ کے لیے زور زور سے گاؤں لیکن ہم افسروں کے ایسے نصیب کہاں کہ کھلے بندوں اپنے جذبات کا اِظہار کر سکیں۔ ہم رسومات اور فوجی ڈسپلن کی ایک نہ نظر آنے والی ایسی فولادی زرہ بکتر میں مقید ہوتے ہیں کہ بہت کم ان لطیف جذبات کا اظہار کھلے بندوں ہوسکتا ہے۔ البتہ جوان کبھی کبھی رات کی تاریکی میں آگ کے گرداگرد چائے کے مگ لیے اپنے دل کی بھڑاس ماہیا' ہیر وغیرہ گا کر نکال لیتے ہیں۔

ہمیں واپس آئے ہوئے چند گھنٹے ہی گذرے تھے کہ پَٹ سَن سے لدی ہوی وہی کشتیاں دریا کے عین درمیان ہماری طرف آتی ہوئی دکھائی دیں۔ دفعتاً پل کی جانب سے ایم ایم جی کا فائر کھلا اور دیکھتے ہی دیکھتے دوچار کشتیاں بھگدڑ کی وجہ سے اُلٹ گیئں۔ کچھ ملاح چھلانگ لگا کر کنارے کی طرف تیرنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن ان پر بھی گولیوں کی بوچھاڑ جاری تھی۔ دوست دشمن کی پہچان مشکل سہی لیکن نہتے بنگالیوں کے ساتھ اس طرح کا سلوک؟ اور نہیں تو کم از کم وہ ہمارے مسلمان بھائی تھے۔ آرٹلری کا ایک بنگالی کپتان او۔ پی OP کی حیثیت سے شدید تھکن کے باوجود دشمن پر فائر کرواتا رہا تھا۔ اس کی محبّ الوطنی پر کبھی کسی کو شک نہیں ہوا۔ اس کے برعکس انجینئر بٹالیں کا ایک بنگالی کپتان چیک پوائنٹ پر فرار ہوتے ہوئے پکڑ لیا گیا۔ انجینئر بٹالین کا ایک اور کپتان سرنڈر تک سرگرم عمل رہا لیکن اس کے بعد باقاعدہ اجازت لے کر سیولین کپڑوں میں روپوش ہوگیا۔ البتہ کسی بھی یونٹ میں کوئی بنگالی سپاہی یا جے۔سی۔او JCO نظر نہیں آیا۔

بنگالی مجاہدوں کے ایک دستے کی کمان ایک نہایت با ہمت اور جذبہ اِسلام سے بھَرپور نوجوان ھادی کر رہا تھا۔ یہ دستہ کافی عرصے سے بریگیڈ ہیڈکوارٹر کی زیر نگرانی مکتیوں کے خلاف سرگرم عمل رہا تھا۔ دستے میں صرف اُسی کے پاس آٹومیٹک ہتھیار تھا۔ بقول اُسکے کئی مُکتی اس کی گولیوں کا شکار بن چُکے تھے۔ رائفل اُسے خاص طور پر بریگیڈ کمانڈر نے دی تھی۔ اِسکے ساتھی بھی بہت کم عمر کے نوجوان تھے۔ اِنہیں شکایت تھی کہ بمقابل مکتی باہنی اِن کے پاس سنگل شاٹ 303 رائفل ہے۔ آٹومیٹک ہھتیاروں کے مقابلے میں یہ واقعی کم تر ہے۔ براہمن باڑیہ کی دفاعی لائن ہم نے کیوں چھوڑ دی یہ اِنکی سَمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ میں کیسے سمجھاتا میری اَپنی سمجھ میں بھی کچھ نہیں آرہا تھا۔ میں نائب صوبیدار منظور اور کچھ آدمیوں کے ساتھ

سیدھا راستہ چھوڑ کر دریا کے کنارے کنارے پل کی طرف آرہا تھا کہ دریا کے اندر گشت کرتی ہوئی گن بوٹ سے لفٹیننٹ شاہد کریم ہمیں دیکھ کر ہماری طرف آ گیا۔ حیرت ہوئی کہ وہ اکیلی گن بوٹ میں دریا کے اندر ایک آسان ٹارگٹ پیش کرنے کے باوجود مستعدی سے اپنے فرائض بغیر کسی کے حکم کے ادا کر رہا ہے۔ میگھنا کے دوسرے کنارے پر دشمن کے لاتعداد آدمی نظر آئے۔ ایسا لگتا تھا کہ برگیڈ پر سخت دباؤ ہے۔ بہت سے اپنے فوجی بھی پُل کے ذریعے واپس آتے نظر آئے۔ گن بوٹ کی ہیوی مشین گن HMG سے دوسرے کنارے پر فائر کروانے کے دوران پُل اڑانے کا مقررہ سگنل نظر آیا تو تیزی سے پل کے اس کنارے پہنچا۔ میں نے دور ہی سے پُل اڑانے کے لیئے متعین پارٹی کو آواز دی لیکن انجینئرز کے میجر نذر الطاف کھوکھر (کھوکھر سیالکوٹ کے سکاچ مشن اسکول میں میرا ہم جماعت تھا لیکن یہ بات اسے یاد نہیں تھی) کو پل پر بھاگتے ہوئے اپنی طرف آتا دیکھ کر انھیں روک دیا۔ وہ دوسرے کنارے سے جہاں ٹیلیفون لگا ہوا تھا مجھے یہی بتانے آیا تھا کہ ڈِیو ہیڈ کواٹر والے مجھے پُل اڑانے کا حکم دے رہے ہیں کیونکہ ڈر تھا کہ دشمن اس پر قبضہ نہ کر لے۔ پُل ایک دھماکے کے ساتھ اوپر اُٹھا اور ایک سیکنڈ ہوا میں ساکن رہ کر آہستگی سے اسکے دونوں سِرے دریا کی تہہ میں بیٹھ گئے۔ دونوں حصوں کا ایک ایک کنارا ستونوں کے ساتھ ہی اٹک گیا۔ پُل کو اتنا ہی توڑا گیا تھا جتنا کہ حالات کے مطابق ضروری تھا تاکہ لڑائی کے بعد اسکو کم خرچ اور وقت میں بحال کیا جا سکے۔ خبر ملی کہ دوسرے کنارے پر گھمسان کا رن ہے۔ ہماری فوج نے دشمن کی دو بٹالینوں کو مار بھگایا اور ہندوستانی اپنے سات ٹینک چھوڑ کر فرار ہو گئے تھے۔ برگیڈ کمانڈر سعد اللہ اور مٹھی بھر افسروں اور جوانوں نے تاریخ شجاعت میں ایک نیا باب رقم کر دیا تھا۔ اس معرکے کی تفصیل برگیڈیئر صاحب کی کتاب 'ایسٹ پاکستان ٹو بنگلہ دیش' میں

موجود ہے۔ نامساعد حالات اور دشمن کے بے پناہ دباؤ کے تحت برگیڈ کمانڈر نے ایک بٹالین کمانڈر، کچھ افسروں اور سوڈیڑھ سو آدمیوں کو ساتھ لے کر دشمن کی دو بٹالینز پر جو نئے حملے کے لیے صفیں درست کر رہی تھیں، ایک بھرپور جوابی حملہ کر دیا۔ اس اچانک اور غیر متوقع حملے سے ہندوستانی گھبرا گئے اور اپنے بیشتر ٹینک چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ اس کارنامے پر برگیڈیئر سعداللہ کو ہلال جرات (ایچ۔ جے) کا اعزاز دیا گیا۔ گو ان کی یہ کامیابی کسی کرشمے سے کم نہیں تھی پھر بھی اس میں برگیڈ کمانڈر کی لیڈرشپ، بہادری اور خود آگے بڑھنے کی مثال نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ دو PT-76 قسم کے ہلکے اور پانی میں تیرنے کی صلاحیت رکھنے والے ٹینک ہی دوسرے کنارے سے لائے جا سکے باقی یا تو کیچڑ میں دھنس گئے یا حملے کے دوران کسی زیادہ جوش میں آئے ہوئے سپاہی کے گرنیڈ یا راکٹ لانچر کی نذر ہو گئے۔ ایک ٹینک کو ایف۔ آئی۔ یو FIU کا کپتان اور ایک کو ڈیو ہیڈ کواٹر کے G-1 لفٹینینٹ کرنل باسط چلا کر لائے۔ گیریژن میں ٹینک یا اس کا عملہ موجود نہیں تھا۔

اپنے فوجیوں کی واپسی کو آسان بنانے کے لئیے میں نے چند جوانوں کو لے کر پل کے ٹوٹے ہوئے حصے کے درمیان رَسی باندھ دی۔ ٹوٹے ہوئے پُل کے اس حصے کے درمیان دو اڑھائی سو گز کا فاصلہ تھا۔ ایک عرصے سے تیراکی نہیں کی تھی اس لیے درمیان میں پہنچ کر تھک گیا اور بمشکل ستونوں تک پہنچ کر دم لیا۔ دوسرے دن آرڈر ملا کہ پُل کا دشمن کی طرف کا سپین بھی اڑا دو تا کہ دشمن پُل کے اس کنارے تک بآسانی نہ آ سکے۔ جرنل صاحب کے مطابق انجینئر کے جوان بارود لگا آئے تھے اور اب اسے صرف آگ لگانی ہے۔ میں سپیڈ بوٹ پر چار آدمیوں کو ہلکے ہتھیاروں کے ساتھ لیکر دریا کے دوسرے کنارے پہنچا۔ سارا برگیڈ دوسرے کنارے پر جا چکا تھا اور دشمن چند سو گز کے فاصلے پر موجود تھا۔

انجینئر کے جوان دشمن کو آتا اور باقی بریگیڈ کو پیچھے جاتا دیکھ کر بارود وغیرہ پُل کے پاس چھوڑ کر فرار ہو گئے تھے۔ اتنے بڑے پُل کو اڑانے کے لیے چار آدمی تھے اور بہت سی جگھوں پر چارج لگانے تھے۔ صرف ایک آدمی کو پُل سے پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر حفاظت کے لیے بھیج کر باقی تین آدمیوں کے ساتھ مل کر چارج لگانے پڑے۔ ہاتھ بڑی تیزی سے چل رہے تھے۔ دشمن کی قربت کے ساتھ ساتھ اپنی فوج کی عدم موجودگی کا بھی احساس تھا۔ لیکن کمانڈو ٹریننگ آج کام آرہی تھی۔ پندرہ بیس منٹ میں ہم نے تقریباً بیس چارج لگا لیے۔ دشمن ہم سے پانچ چھ سو گز دور آشوگنج میں رک گیا تھا۔ بریگیڈ کے جانے کے بعد وہ پھونک پھونک کر قدم بڑھا رہا تھا۔ چارج لگانے کے بعد ہم ساتھ ہی ایک مورچے میں بیٹھ گئے۔ وقت آہستگی سے گزر رہا تھا یا پھر سوچ کا دھارا ہی کافی تیز ہو گیا تھا۔ یوں محسوس ہوا جیسے فیوز صحیح طریقے سے نہیں جلا۔ چیک کرنے کی غرض سے جونہی مورچے سے باہر جانے لگا تو پُل ایک دھماکے کے ساتھ اڑ گیا۔ اس بے وقوفی کی سزا مجھے ضرور ملتی اگر چارج ایک دو سیکنڈ پہلے نہ پھٹتے۔ دس span میں سے چار اُڑ گئے تھے اس لئیے خیال تھا کہ مشرقی پاکستان کا یہ دوسرا سب سے بڑا پُل مدتوں تک مرمت نہ ہو سکے گا۔ (بعد میں روسی انجینئروں کی مدد سے مسلسل دو سال کی کوشش سے پُل ٹریفک کے قابل ہوا تھا)

سپیڈ بوٹ دوسرے کنارے پر چلی گئی تھی۔ یقیناً ڈرائیور کو اس کنارے پر خطرہ محسوس ہوا ہو گا اس لیے وہ بغیر بتائے رفو چکر ہو گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ڈیو ہیڈ کواٹر کے کسی افسر نے اسے واپس بھیج دیا۔ ڈرائیور کچھ گھبرایا ہوا تھا اور بڑی مشکل سے دوسرے کنارے سے یہاں آنے پر آمادہ ہوا تھا۔ اس لئیے واپسی پر سپیڈ بوٹ میں خود چلا رہا تھا۔ اس سے سٹیرنگ تو لے لیا تھا لیکن میں بھی سپیڈ بوٹ چلانے میں خاص مہارت نہیں رکھتا تھا۔ ہم ابھی دریا کے وسط میں ہی پہنچے تھے کہ ہندوستانی

ہوائی جہازوں نے ہماری پوزیشنوں پر حملہ کر دیا۔ دریا میں تنہا سپیڈ بوٹ بڑا خوبصورت ٹارگٹ پیش کر رہی تھی لیکن ہندوستانی اس طرف متوجہ نہیں ہوئے۔ میں نے اسے تیزی سے کنارے پر لگا دیا۔ پُل پر چارج لگانے کے دوران میری پتلون ایک دھماکے کے سے انداز میں پل کے دونوں سپینوں سے پہلے ہی اپنے دونوں پائنچے پھاڑ بیٹھی تھی۔ شاید ٹانکے کچے تھے کہ ایک پائنچے سے دوسرے پائنچے تک اُدھڑ گئی۔ میں نے دوسرے کنارے پر پڑے کسی جوان کے کمبل کو دھوتی کے انداز میں پہن لیا تھا۔ سپیڈ بوٹ سے نکلا تو ایک عجیب وضع پیش کر رہا تھا۔

لوگ مورچوں میں بیٹھے ہوائی جہازوں کے جانے کا انتظار کر رہے تھے۔ پار سامنے دریا کے کنارے ڈیو ہیڈ کواٹر کی بلڈنگ سے ایک میجر نے مجھے مست ملنگ سمجھ کر نعرہ لگایا" اُوئے جھلے مورچے وِچ ہو جا"۔ سن کر ہنستا ہوا آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات عجیب تھے۔ میرے کندھوں پر کوئی رینک نہیں لگا ہوا تھا پھر بھی کچھ سوچ کر وہ چپ رہا۔ رات کو تھکن سے مجھے ہلکا ہلکا بخار چڑھ گیا۔ ڈیڑھ سال سکول آف سگنلز میں پی ٹی اور پریڈ میں حصہ نہ لینا اپنا رنگ دکھا رہا تھا۔ ہم نہایت ہی چھوٹے سے علاقے میں گھر گئے تھے۔ ایک طرف مادھو پور کا جنگل تھا جو مکتیوں کا ہمیشہ سے ایک مضبوط گڑھ رہا تھا اور باقی تین اطراف میں میگھنا اور چھوٹا براہم پُترا دریا ہمیں دفاع کو بہتر بنانے میں مدد دے رہے تھے۔ ہم ایک طرح کے دفاعی بکس میں مورچہ زن ہو گئے تھے۔ لیکن چاروں طرف دشمن اور مکتی باہنی کی موجودگی اور کسی زمینی راستے کی عدم موجودگی کی وجہ سے باقی فوج سے پوری طرح کٹ کر رہ گئے تھے۔ سوائے اپنی جانیں بچانے کے ہم کسی جنگی پلان کا حصہ نہیں بن سکتے تھے۔ لیکن اس وقت دشمن کی توجہ کا مرکز ڈھاکہ تھا جس پر قبضے کے بعد اس کے خیال میں ہمارا یہاں ٹھہرنا مشکل یا بے کار تھا۔

میرے اپنے خیال میں ۲۷ بر گیڈ کو دشمن نے ایک منصوبے کے تحت یہاں دھکیل کر محصور کر دیا تھا تا کہ وہ ڈھاکہ کے دفاع میں کوئی رول ادا نہ کر سکے۔ کم از کم سلہٹ والے بر گیڈ کو جو اسی ڈویژن کا حصہ تھا براہمن باڑیا لا کر کمیلا تک ایک مضبوط دفاعی لائن بن سکتی تھی۔ یہ ہماری ہائر لیول کی آپریشنل پلاننگ کی ایک بہت بڑی خامی تھی کہ ہم نے یہ سوچ کر کہ مشرقی پاکستان کا دفاع ہندوستان پر مغربی سرحد پر دباؤ کے ذریعے کیا جائیگا وہاں نہ ہی ضرورت کے مطابق فوج رکھی گئی تھی اور نہ ہی کوئی قابل عمل دفاعی پلان بنایا تھا۔ اگر بنگالیوں کو اس چیز کا شکوہ تھا تو وہ اس میں بالکل حق بجانب تھے۔

سننے میں آیا تھا کہ لفٹیننٹ جنرل یعقوب علی نے ایک ایسا پلان پیش کیا تھا جس سے ڈھاکہ کا دفاع کافی عرصے تک موئثر طریقے سے کیا جا سکتا تھا۔ شاید ہماری فوج کو ایسا قابل اور دانش مند جرنیل دوبارہ نصیب نہ ہو۔ میری اُن سے پہلی ملاقات چراٹ میں ہوئی تھی جہاں میں رضا کاروں کو ٹیسٹ کرنے کے نئے طریقے وضع کرنے میں مصروف تھا۔ ڈیڑھ سال بعد 3 کمانڈو بٹالین میں دوبارہ ملاقات ہوئی تو اُنہوں نے مجھ سے پوچھا کہ اُن ٹیسٹوں کا کیا بنا تھا؟ بلا کے حافظے کی بدولت انہیں چار پانچ زبانوں پر عبور حاصل تھا۔

بات دفاعی لائن کی ہو رہی تھی۔ جرنل یعقوب نے جو دفاعی پلان تجویز کیا اور نامنظور ہوا لیکن جب تقریباً وہی پلان ان حالات میں بدیر عمل پذیر کرنے کی سعی کی گئی تو باعث شکست اور رسوائی بن گیا۔ اگر ہندوستان کے حملے کے پیش نظر اُسے اپنا لیا جاتا تو وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستانی ہمیں مہینوں تک شکست نہیں دے سکتے تھے۔ ڈھاکہ کے گرد دفاعی فوج باقی دُنیا سے کٹ کر اگر الگ بھی ہو جاتی تو بھی سامانِ رسد و رسائل اور جنگی سامان اِتنا زیادہ ذخیرہ کیا گیا تھا کہ کئی مہینوں تک کافی

ہوتا۔ جنگ کی صورت میں ڈھاکہ سے سویلین آبادی کے انخلا کے بعد مزید اناج کی ضرورت بھی نہ رہتی۔اسی طرح کا منصوبہ چٹاگانگ کے لیئے بھی بنایا جا سکتا تھا۔ لیکن یہاں تو ہمت اور حوصلے کا فقدان تھا۔ صرف جرنیلوں کی یہ بھڑکیں جی۔ ایچ۔ کیو تک پہنچتی رہیں کہ ہم ایک انچ علاقہ بھی ہندوستانیوں اور مُکتیوں کو نہیں دیں گے۔شاید گورنمنٹ کی بھی یہی احمقانہ پالیسی تھی یا وزیر خارجہ بھٹو کے منصوبے کا حصہ تھا کہ مکتیوں کے پاس کوئی علاقہ نہ جائے مبادا وہ وہاں بنگلہ دیش کا جھنڈا گاڑ دیں۔ بنگلہ دیش کا اعلان ہو بھی جاتا لیکن ہماری فوج دشمن کے قبضے میں تو نہ جاتی۔ ہماری طرح دشمن میں بھی یہ صلاحیت نہیں تھی کہ وہ جنگ کو بہت زیادہ طول دے سکتا اور اس طرح سرنڈر کی جگہ سیز فائر ممکن ہو جاتا۔ ہندوستانی فوج کو ہمیں شکست دینے کے لیئے دو ہفتوں کا ٹارگٹ دیا گیا تھا۔ یو۔این۔او کے دباؤ اور انڈیا کے اتحادی روس کا یو این او کی کسی قرارداد کا ویٹو نہ کرنے کے عندیے کی وجہ سے اس کے لیئے اس سے زیادہ طول دینا ناممکن تھا۔ ہماری فوجی قیادت کی کمزوری تھی کہ وہ صورت حال کا صحیح ادراک نہ کرسکی یا اس میں حکومت کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی کہ دشمن کے مقابلے میں بہت قلیل فوج کے باوجود سرنڈر سے کچھ دنوں پہلے تک فوج کو مشرقی پاکستان کے پورے بارڈر کے دفاع کے لیئے پھیلائے رکھا۔ مشرقی پاکستان کا ہندوستان کے ساتھ تقریباً ساڑھے چار ہزار کلومیٹر بارڈر مغربی پاکستان کے ساتھ اس کے بارڈر سے کوئی ایک ہزار کلومیٹر زیادہ ہے۔کئی انفنٹری یونٹوں کو دفاع کے لیئے تیس تیس کلومیٹر لمبا علاقہ دیا گیا تھا جس کی دفاعی صلاحیت عموماً تین سے چار کلومیٹر سے زیادہ نہیں ہوتی۔

کیپٹن اکبر کو جو صبح سے نظر نہیں آ رہا تھا بلا کر دشمن کے علاقے میں پٹرولنگ کے لیے بھیجا تاکہ اندازہ لگایا جا سکے کہ ہندوستانی اپنی کتنی فوج دریائے

میگھنا کے اس طرف اور چھوٹے براہم پترا کے اس پار لے آئے ہیں۔ ساری رات گھومنے کے بعد وہ مایوس لوٹ آیا کیونکہ بقول اس کے اسکا دشمن کے ساتھ ملاپ نہیں ہو سکا تھا۔ سارا دن دشمن کی گولہ باری جاری رہی۔ اب تو وہ دریا کے دوسرے کنارے پر واقع گندم کے گوداموں (Silos) (جن کی بلندی دواڑھائی سو فٹ تھی) پر نشان انداز OP بٹھا کر ایک ایک آدمی پر فائر گرا سکتا تھا۔ ڈیو کا ٹیک ہیڈ کوارٹر دریا کے کنارے ایک ریسٹ ہاؤس میں تھا۔ حیرت ہے کہ دشمن کے بالواسطہ لمبے رینج کے ہتھیاروں کی زد میں ہونے کے باوجود اس کی طرف سے کوئی قابل ذکر فائر نہیں آیا تھا۔

ڈیو Div کا جی ٹو اپریشن G-2Ops میجر گیلانی کھلی ہوا میں کھڑا جہازوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا کہ دیکھو قادر! دشمن کے ہوائی جہاز میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے کیونکہ میں اور جرنیل کچھ دیر پہلے دشمن کے تیس چالیس گز دور گرائے ہوئے بم سے بچ نکلے ہیں۔ لگتا تھا کہ اِسے شیل شاک (Shell-shock) ہو گیا تھا۔ عجیب بے تکی باتیں کر رہا تھا۔ دن کے وقت ہر دس پندرہ منٹ بعد ہوائی حملہ ہوتا تھا اس لیے میرے لیے کوئی خاص باعثِ دلچسپی یا خوف نہیں رہا۔ پہلے پہل میں بھی بڑی مستعدی کے ساتھ کسی مورچے میں جست لگا تا رہا لیکن بعد میں عموماً حملے کے دوران ادھر ادھر گھومتا رہتا تھا۔ لگتا تھا کہ جوانوں پر اس کا بڑا خوش گوار اثر پڑتا ہے۔ ہر وقت مورچوں میں گھسے رہنے سے احساسِ شکست اور بے بسی شدت اختیار کر لیتی ہے۔ ایسے حالات میں موت سے ڈرنے کے بجائے اسکا انتظار کرنا یا بہتر صورت میں بھول ہی جانا بہتر ہوتا ہے۔ حیرانگی کی بات نہیں میدان جنگ میں بہت سے سپاہی واقعی بھول جاتے ہیں کہ انہیں بھی موت آسکتی ہے۔ ایک جرأت مند جوان نے اپنی مشین گن کا دہانہ دشمن کے ڈائیو مارتے ہوئے جہاز کی طرف کر دیا۔

جہاز لڑکھڑاتا ہوا دور نکل گیا۔شاید آگے جا کر کہیں گر گیا ہو (شکاری حضرات کی ڈینگوں سے اس کا موازنہ نہ بے جا ہوگا)۔

ہم جس جگہ رہ رہے تھے وہ ایک حویلی نما دومنزلہ مکان تھا۔ باورچی خانے میں کم از کم اَسی سالہ ایک بڑھیا اللہ کے آسرے پر پڑی ہوئی تھی ۔کوائف سے لگتا تھا کہ ایک اچھا کھاتا پیتا گھرانا اس گھر میں رہتا ہوگا۔ بڑھیا بیچاری ایک میلی سوتی رنگدار ساڑھی میں ٹوٹی ہوئی بان کی چارپائی پر پڑی رہتی تھی ۔اپنے لیے خود ہی چاولوں کا بھات بنا کر کھا لیتی تھی ۔ہم لوگوں سے ڈرتی تھی اور ہم سے کھانے کے لیے کچھ قبول نہیں کرتی تھی ۔میں نے اس سے بٹن ٹانکنے کے لیے سوئی مانگی تو وہ مجھے سہمی سہمی نظروں سے دیکھتی رہی اور جب میں نے اسے بے شمار الٹے سیدھے اشاروں سے سمجھایا کہ مجھے کیا چاہیے تو اس کے چہرے پر ہنسی کی خفیف سی لہر دوڑ گئی لیکن نفی میں گردن ہلانے کے بعد پھر اپنی سوچوں میں گم ہوگئی ۔ یہ لوگ ہم سے کیوں اس قدر ڈرتے تھے؟ میری موجودگی میں وہ ایک کونے میں دیوار کے ساتھ اس طرح دبک کر بیٹھی رہی جیسے میں اس کے لیے عزرائیل بن کر آیا ہوں ۔شاید:

؎ جن پر تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

اس عورت کے خیال سے ہم ایک دوسرے خالی مکان میں منتقل ہوگئے ۔ یہ مکان بھی کسی امیر کبیر گھرانے کا تھا۔مکین اوپر کی منزل میں اپنا سارا سامان بند کر کے کسی قریبی گاؤں میں چلے گئے تھے۔ ایک کمرے میں ہمارے ایس۔ ایس۔ جی کے جوان اور دوسرے میں میں اور میرے ساتھ بنگالی رضا کار رہ رہے تھے۔ یہ لوگ پکے مسلمان اور پانچوں وقت کی نمازیں پڑھتے تھے۔میں نے ان کے چہروں پر کبھی کوئی خوف و ہراس نہیں دیکھا تھا۔کمانڈو کے جوان تمام نجی اور سخت کام ان سے کرواتے تھے۔میرے ڈانٹنے کے باوجود وہ اس چیز سے مکمل طور پر باز نہیں آئے۔

میں نے بھی نماز پڑھنی شروع کی تو بہت شرمندگی ہوئی۔ صحیح نماز تک یاد نہیں تھی۔ تقریباً ہر کمرے میں قرآن مجید پڑا ہوا تھا۔ ایک آدھ گھنٹے کی تلاوت سے بے حد سکون ملا۔ گیارہ دسمبر کو بہت سے ہیلی کاپٹروں نے ڈھاکے کی سمت میں ہم سے کچھ دور ہندوستانی فوج کو اُتارا۔ جرنیل صاحب کھڑے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ ہندوستانی اپنی ایک بٹالین فوج کشتیوں اور ہیلی کاپٹروں کے ذریعے پہلے ہی وہاں اتار چکے تھے۔ ہمارا آرٹلری فائر ان تک پہنچ نہیں پا رہا تھا۔ شائد بیس، پچیس آدمیوں کے ساتھ ممکن نہیں تھا کہ ان کو تتر بتر کیا جا سکے کیونکہ ہمارے وہاں پہنچنے تک تو وہ اپنے آپ کو آرگنائز کر سکتے تھے۔ اس کے باوجود آرٹلری کی سپورٹ سے باقاعدہ فوج کے ساتھ مل کر ان پر اچانک حملہ کر کے ڈھاکہ کی طرف پیش قدمی کی جا سکتی تھی۔

لیکن بات منصوبہ بندی اور اس پر عمل کی تھی۔ ڈویژن نے جب وہیں دفاعی مورچہ سنبھالنے کی ٹھان لی تھی تو ایسے کسی پلان پر عمل کے لیئے وہ کب تیار ہو سکتے تھے۔ اگر یہ مقصود ہوتا کہ ڈھاکہ کے دفاع کو مضبوط کرنا ہے تو بھیراب بازار میں قلعہ بند ہونے کا کوئی جواز نہ تھا۔ اگر ہندوستانی فوج نہ بھی اتارتے تو بھی ریلوے لائن کے ناقابلِ استعمال اور کسی سڑک کے نہ ہونے اور پورے تیس میل کے علاقے میں مکتیوں کے زور کی وجہ سے ڈھاکہ سے کوئی کمک یا مدد پہنچنی مشکل تھی۔ میگھنا کے دوسرے کنارے پر ہندوستانی فوج کی موجودگی کی وجہ سے جہاز رانی بھی ناممکن تھی۔ بھیراب بازار میں اتنے زیادہ ڈمپ (Dump) بھی موجود نہیں تھے کہ وہاں زیادہ دیر ٹھہرا جا سکے۔ تیسرے چوتھے روز ہی جوانوں نے دوکانوں کو لگے تالے توڑ کر کھانے کا سامان نکالنا شروع کر دیا تھا۔ ہم جس گھر میں رہ رہے تھے وہاں سے مونگ پھلی کی بوریاں نکلیں چار و ناچار انہی کی چوری کرنی پڑی۔ اسکے علاوہ

وہاں سے چینی کی ایک آدھ بوری اور گھی کا ٹین بھی برآمد ہوا۔ جن جہازوں پر ہم خوراک کا سامان لائے تھے وہ کنارے پر لدے کھڑے تھے۔ کچھ سامان رات کے وقت نکال کر یونٹوں میں بانٹ دیا جاتا تھا۔ ہندوستانیوں کی دوسرے کنارے پر موجودگی کی وجہ سے دن کے وقت سامان نکالنا مشکل تھا۔ بارہ دسمبر کو جنرل صاحب نے مجھے کہا کہ براہم پترا کے اس پار دشمن کے بارے میں پتا کرو کہ وہ کہاں تک آ چکا ہے اور اس کی وہاں کتنی طاقت ہے۔ میں شام کے وقت دریا کو عبور کرنے کے لیئے جگہ کے انتخاب کے لیئے گیا۔ ایک بڑی سفید بلڈنگ میں 12 ایف ایف کی ایک کمپنی کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ وہاں چند ہی منٹ پہلے جہازوں نے راکٹوں سے حملہ کیا تھا۔ دھول سے اَٹے ہوئے کمپنی کمانڈر کیپٹن ہدایت سے ملاقات ہوئی۔ حالات کے باوجود اسکے چہرے پر رونق تھی۔ اسے دریا کے اس پار کے علاقے کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔

اس کمپنی سے کچھ اس طرف خیبر سکاؤٹس کی ایک پلاٹون ایک نائب صوبیدار کی کمان میں پوزیشن لیئے ہوئے تھی۔ وہ نہ جانے کہاں سے چینی کی چائے بنا لائے۔ پٹھانوں کی فطری مہمان نوازی یہاں بھی نظر آ رہی تھی۔ انہیں دہ کشتیوں کا بندوبست کرنے کا کہہ کر اپنی باقی فورس کو لینے واپس چلا گیا۔

شاید ہمارے بارے میں کسی مکتی نے ہندوستانیوں کو اطلاع دے دی تھی۔

ریلوے لائن کے دونوں طرف ہمارے ساتھ ساتھ مارٹر کے گولے ہم سے پچاس، ساٹھ اور سو گز کے فاصلے پر پھٹتے رہے۔ انکی مخصوص آواز پر ہم زمین پر لیٹ جاتے اور جونہی وہ پھٹ چکتے تو دوبارہ اٹھ کر چل پڑتے۔ ایسا لگتا تھا کہ کوئی ہندوستانی یا مکتی آرٹلری اور مارٹر فائر کو ہمارے پاس ہی سے Direct کروا رہا ہے کیونکہ گولے بھی ہمارے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ ہماری فورس کے پیچھے پیچھے کچھ

اور فوجی بھی دریا کی طرف جا رہے تھے۔ ان میں دو تین آدمی زخمی ہو گئے لیکن ہمارے تمام آدمی ابھی تک محفوظ تھے۔ مسلسل آدھ گھنٹے کی اس آنکھ مچولی سے تنگ آ کر ریلوے لائن چھوڑ کر ہم نے ایک کچا راستہ اپنا لیا۔ چار پانچ سو گز آگے جا کر جب چیک کیا تو معلوم ہوا کہ ہمارے اٹھارہ جوان کہیں پیچھے رہ گئے ہیں۔ ان کو لانے کے لیے ریلوے لائن پر بہت دور تک آدمی گئے لیکن بے سود۔ حیرت تھی کہ بنگالی رضا کاروں میں سے کوئی بھی پیچھے نہیں رہا۔ دریا کے کنارے 33 بلوچ کے آدمی مورچہ بند تھے۔ ہم نے دو ٹوٹی پھوٹی کشتیاں ڈھونڈ لیں۔ دریا کا پاٹ کافی وسیع تھا شاید تین چار سو گز۔ بنگالی رضا کار کشتیاں چلا رہے تھے۔ کنارے کے نزدیک جا کر پتہ چلا کہ پانی کے تیز بہاؤ کی وجہ سے ہم اصلی جگہ سے بہت نیچے آ گئے ہیں اور ہمارے اور دشمن کی متوقع پوزیشن کے درمیان دریا کی ایک اور شاخ حائل ہوگئی ہے۔ دونوں شاخوں کے درمیان تقریباً تمام علاقہ چھان مارا لیکن دشمن کا نام ونشان نہیں ملا۔ رات کے تقریباً دو بج گئے تھے لیکن ناکام لوٹنے کو دل نہیں مانا۔ ایک جگہ کمبل کے اندر گھس کر نقشہ دیکھ کر فیصلہ کیا کہ دریا کی اس شاخ سے دوسری طرف کا علاقہ بھی دیکھا جائے۔

پانی کافی گہرا تھا۔ گزرگاہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے لکڑی کا ایک شکستہ پل نظر آیا۔ کمانڈو کی روائیتی احتیاط اختیار کیے بغیر ہم نے ایک جمگھٹے کی صورت میں پل عبور کیا۔ میں اور کیپٹن اکبر آگے آگے تھے۔ پل سے گزرنے کے بعد بھی راستے کے دونوں طرف پانی تھا۔ کچھ ہی فاصلے پر ریلوے لائن جا رہی تھی۔ جہاں راستہ اور لائن ملتے تھے وہاں پنجابی میں کسی کی گفتگو سن کر ہم رک گئے۔ آواز کسی اونچی جگہ سے آئی تھی اس لیے یہ تعین کرنا مشکل تھا کہ سنتری کہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں اور اکبر ذرا قریب کھسکے تو سنتری دبی اور گھبرائی ہوئی آواز میں کون کون پکارنے لگا۔

سوچا کیوں نہ ان ہی چند آدمیوں سے اس پوزیشن پر حملہ کر دوں ۔ دشمن کی تقریباً ایک بٹالین اس علاقے میں موجود تھی اس لیے یہ جاننا مشکل تھا کہ دریا کے اس کنارے جہاں اس کی مین پوزیشن ہو سکتی تھی وہ کتنی نفری کے ساتھ موجود ہے ۔ اچانک حملے سے دشمن میں ابتری تو پھیل سکتی تھی لیکن اتنے تھوڑے آدمیوں کے ساتھ بغیر کسی فائر سپورٹ کے دشمن کی اتنی زیادہ تعداد کو مار بھگانا اس صورت میں ہی ممکن تھا اگر ہمیں پہلے سے اس کی پوزیشن کا کچھ کچھ علم ہوتا۔ ہم تو اندھا دھند دشمن کے بالکل سامنے پہنچ گئے تھے اور وہ ہماری موجودگی سے باخبر ہو چکا تھا۔ میرے ساتھ صرف آٹھ دس کمانڈوز اور سولہ سترہ بنگالی رضا کار تھے۔ باہمی مشورے سے طے پایا کہ یہیں سے دشمن کی پوزیشن پر فائر گرایا جائے اور چاروں اطراف سے پانی اور دشمن میں گھری اپنی فورس کو نکال لیا جائے۔ ہم نے دشمن کے مورچوں پر ذرا پیچھے ہٹ کر مشین گنوں، راکٹ لانچروں اور رائفلوں سے ایک ساتھ فائر کرنا شروع کر دیا تاکہ اس کے جوابی فائر سے اس کی طاقت اور پوزیشن کا اندازہ لگایا جاسکے۔ اچانک دشمن کے تمام ہتھیار کھل گئے اور ٹریسر راؤنڈ پھول جھڑیوں کی طرح ہمارے ادھر اُدھر سے گزرنے لگے۔ دشمن کے مارٹر بھی فوراً حرکت میں آ گئے اور نالے اور ریلوے پل پر فائر گرانا شروع کر دیا۔ پانچ دس منٹ کی فائرنگ کے بعد میں نے اپنی فورس کو واپسی کا آرڈر دیا اور ان کے نکلنے کے دوران میں اپنی رائفل سے دشمن پر مسلسل فائر کرتا رہا۔ نائب صوبیدار منظور نے مجھے آواز دی کہ صاحب واپس آ جائیں فائر کے شعلوں سے آپ کی پوزیشن کا دشمن کو پتہ لگ جائے گا۔ میں نے بلند آواز میں withdraw (پیچھے ہٹنے کا) کہا تاکہ کوئی آدمی پیچھے نہ رہ جائے۔ چند گز پیچھے ایک حوالدار اور بنگالی رضا کار کھڑے نظر آئے۔ بظاہر کمزور اور مریل سے ایک رضا کار کے بازو میں گولی لگی تھی لیکن اس نے منہ سے اُف تک

نہیں کی اور آرام سے کھڑا حوالدار سے پٹی بندھوا رہا تھا۔ کچھ لوگوں میں ابھی تک انسانی ہمدردی اور بھائی چارے کا جذبہ موجود تھا۔ انہیں ساتھ لے کر واپس آیا۔ تین چار سو گز کے فاصلے پر دریا کے کنارے ایک گاؤں کے پاس باقی سب پہنچ چکے تھے۔ گاؤں میں متعین دشمن کی ایک کمپنی کی طرف سے ہماری طرف اکا دُکا فائر آیا۔ اس پوزیشن کے بارے میں ہمیں علم نہیں تھا۔ ہم گاؤں سے الگ ہو کر ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ ہو لیئے۔ چھوٹے براہم پترا کو ایک ٹوٹے ہوئے ریلوے پُل کے ذریعے عبور کیا۔ لوہے کے بنے ہوئے اس پُل کا آخری سپین span اس طرح ٹوٹا تھا کہ ایک سرا ہماری پوزیشن کی طرف دریا کے خشک کنارے پر اَٹک گیا تھا۔ اونچی ڈھلوان کو پھسلن کی وجہ سے عبور کرتے ہوئے کافی دیر لگی۔ دوسرے کنارے پر پہنچتے ہی 12 ایف ایف کے سنتریوں نے ہمیں چیلنج کیا تو میں اور اکبر ہاتھ اٹھائے ان کے پاس چلے گئے۔ مشین گن کے مورچے میں ایک نائب صوبیدار اور دو تین جوان بیٹھے ہوئے تھے۔ نائب صوبیدار نے پاس ورڈ (password) پوچھا۔ پاس ورڈ شاید ان کی بٹالین میں استعمال ہوتا ہو تو ہو پوری گیریژن کے پاس ورڈ کا ہمیں علم نہیں تھا نہ ہی ہمیں کوئی اور پاس ورڈ دیا گیا تھا۔ اسے لاکھ سمجھایا کہ ہم آپ ہی کی فوج کے آدمی ہیں۔ ڈیو اور بریگیڈ سٹاف کے تمام سینئر افسروں کے نام بھی فرداً فرداً لیئے لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ سخت گھبرایا اور ڈرا ہوا لگ رہا تھا۔ ان لوگوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان کے سامنے کی طرف سے اپنے لوگ بھی آ سکتے ہیں۔ تنگ آ کر جو اسے ڈانٹا تو وہ جوشیلے انداز میں یہ کہتے ہوئے اٹھا کہ ٹھہر جا میں بتاتا ہوں تیری میجری کو اور تیزی سے مشین گن کے پیچھے فائرنگ پوزیشن لے لی۔ اس کا ارادہ بھانپ کر میں نے اس کے منہ پر زور سے ایک تھپڑ رسید کیا تو وہ چیختا چلاتا یہ کہتا ہوا کہ میں بریگیڈئر اور جرنل صاحب کے

پاس جا کر شکایت لگاؤں گا غائب ہوگیا۔ باقی سپاہیوں نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔شاید ان کو پہلے سے ہی یقین ہو چکا تھا کہ ہم پاکستانی ہیں۔ واپس پہنچ کر جی۔ ون (G-1) کرنل باسط اور آرٹلری کے کرنل یعقوب کو دشمن کی پوزیشن کے بارے میں بتایا تو اس پر اور اس کے توپخانے پر کافی دیر تک آرٹلری فائر گرایا جاتا رہا۔ میں نے جرنل صاحب سے ایک مرتبہ کہا تھا کہ سر! ہم کیوں ایک جگہ مورچہ بند ہو کر بیٹھ گئے ہیں۔ کیوں نہ ہم دشمن کے حصار کو توڑ کر ڈھاکہ کی فوج کی مدد کریں جہاں چاروں طرف سے دشمن کا دباؤ بڑھ رہا ہے۔ یہاں بیٹھنے سے ہمیں فوجی نقطۂ نگاہ سے کوئی فائدہ تو نہیں۔شاید میری اسی تجویز کی بنا پر مجھے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر بلایا گیا۔ وہاں جرنیل مجید کے علاوہ بریگیڈیئر سعداللہ موجود تھے۔ تجویز پر غور وغوض کے بعد طے پایا کہ میں اسی رات 12 ایف ایف کی دو کمپنیوں اور اپنے آدمیوں کے ساتھ ڈھاکہ کی سمت براھم پترا کے اس پار دشمن کی بٹالین پر حملہ کروں۔ آرڈرز کے لیئے جگہ اور شام کے پانچ بجے کا وقت بتا کر میں اپنی فورس کے پاس واپس پہنچا تو تھوڑی دیر کے بعد پیغام ملا کہ ڈیو ہیڈ کوارٹرز میں جرنل صاحب یاد فرما رہے ہیں۔ وہاں گیا تو پتہ چلا کہ حملہ ملتوی کر دیا گیا ہے۔ بریگیڈیئر سعداللہ نے بوجوہ اس واقعہ کو اپنی کتاب میں ذرا مختلف انداز میں پیش کیا ہے۔لگتا ہے انہوں نے میرے جانے کے بعد جرنل صاحب سے جو اس سلسلے میں بحث کی اس میں مجھے بھی شامل سمجھ لیا تھا۔ حملے کے مختلف مراحل جو انہوں بیان کئے ہیں وہ عام حالات میں تو درست ہیں لیکن جیسا کہ ان کے اپنے پیشتر ازیں بیان کردہ ایکشن سے ثابت ہوتا ہے کہ کبھی کبھی بہت کم فوج اور نامکمل معلومات اور روائتی ترتیب سے ہٹ کر بھی کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے۔ جرنل صاحب بغیر کوئی معقول وجہ بتائے کہنے لگے کہ ہم یہیں ٹھیک ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ میری فورس کو میگھنا کے اُس پار دشمن پر شب خون

مارنے کی اجازت دی جائے۔ لیکن جب میں نے یہ کہا کہ اگر ہم واپس نہ آسکے تو اگرتلہ کے پاس جنگلوں سے ہوتے ہوئے چٹاگانگ چلے جائیں گے تو ہمیں اس کی اجازت نہیں دی گئی۔ جرنل مجید اس بات پر ہی مطمئن تھے کہ ہم آج رات دشمن کی پوزیشن پر ایک اور چھاپہ ماریں۔ EPCAF کے میجر جاوید کو دوبارہ دریا کے اس پار Firm Base بنانے کو کہا گیا تھا لیکن خیبر رائفلز کے جوانوں نے رازدارانہ انداز میں بتایا کہ وہ اسی کنارے پر اپنے جوانوں کے ساتھ آرام کر رہا ہے اور دریا کے اس پار نہیں گیا۔ اس مرتبہ ہم نے دریا ذرا کافی آگے جا کر عبور کیا تاکہ پار اترنے کے بعد ہماری راہ میں اس کی کوئی شاخ حائل نہ ہو۔ راستے میں ایک گاؤں سے اکا دکا فائر آیا تو اسے گھیرا ڈال کر جب ایک گھر کے اندر داخل ہوئے تو دو آدمی بھاگ پڑے جنہیں ہم نے دوڑ کر پکڑ لیا۔ سخت گھبرائے ہوئے تھے اور بار بار ہمارے پاؤں پڑ رہے تھے۔ گھروں کے اندر بے چاری عورتیں دبک گئی تھیں۔ ہم نے ان دو آدمیوں کو ساتھ لینے پر ہی اکتفا کیا اور دشمن کی پوزیشن کی طرف چل پڑے لیکن وہاں تو خالی مورچوں کے علاوہ کچھ نظر نہیں آیا۔ اِدھر اُدھر بے تکا فائر گرایا لیکن جوابی فائر ندارد۔ تھوڑی دیر علاقے کا جائزہ لینے کے بعد واپس ہولیئے کیونکہ رات ڈھلنے والی تھی۔ راستے میں بنگالی رضا کاروں کے کہنے پر پکڑے ہوئے آدمیوں کو چھوڑ دیا کیونکہ ان کے مطابق وہ مکتی نہیں تھے۔ ان سے پوچھ گچھ کے دوران اتنا پتہ چلا کہ دشمن نے کافی تعداد میں اپنی فوج مختلف جگہوں پر متعین کر رکھی ہے۔ انہیں آزاد کیا تو از راہ تشکر انہوں نے ہمارے پاؤں پکڑ لیئے۔ واپسی پر دریا کے دوسرے کنارے پر سکاؤٹس کا حوالدار کھڑا نظر آیا۔ بے چارہ ساری رات ہماری واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ ایک ہی ماحول اور حالات لیکن چہرے مختلف!

By the morning the first patrol led by Major Qadir had brought us very good information. Minimum of a battalion was in our immediate South with one battalion headquarter at Daulatkandi Railway Station.

Major Qadir had come to us as a bonus of war. We had received some replacements of our casualties before the war. They had reached Bhairab Bazar. Some men were as old as sixty the others were young boys. Too young to shave. Some of them had done no training, they had not even fired. That did not worry us as long as we got some time to train them. We used to train our razakars in 10 days; firing thrice, 3 rounds each time. Of course their level of training was never too high. But Qadir was pure gold in that dust of old and untrained manpower. He was a very highly trained, couragous and well motivated officer. He had prepared and laid the additional charges for blowing up the Meghna bridge.

The following day the enemy gained contact with us. Now the situation was something like this. Between the fork of old Brahamputra one company 12 FF was occupying one bridge and the area towards its South. The enemy were occupying the second bridge and the area towards its North. Thus the area between the two branches of the river was being shared by the enemy and us. The contact was almost as intimate as it used to be at Kasba.

In the following night we lost one officer, one JCO and some men. While patrolling to discover the enemy dispositions they had bumped into an unknown enemy locality. The attrition of

بریگیڈیئر سعداللہ ہلال جرأت کی کتاب ایسٹ پاکستان تو بنگلہ دیش سے ماخوذ

دوسرا باب

سرنڈر اور قید

صبح ڈیو ہیڈ کوارٹر پہنچا تو جی۔ او۔ سی نظر آئے۔ مجھے پاس بلا کر کہا کہ قادر ہم نے سرنڈر surrender کر دیا ہے۔ اپنی حالت بیان سے باہر تھی۔ مجھے ستارہ جرأت (SJ) کا اعزاز ملنے کی بھی خبر دی۔ شدتِ جذبات سے آنسو تھے کہ رو کے نہیں رکتے تھے۔ منہ سے بس اتنا نکل سکا کہ سر ہم لوگ تو فی الحال یہاں کچھ عرصے تک لڑ سکتے ہیں ہمیں سرنڈر نہیں کرنا چاہیے۔ واپسی پر بہت سے افسر اور جوان نظر آئے۔ تاثرات کئی قسم کے تھے لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ چند ایک چہروں پر اِطمینان کی لہر دوڑ رہی تھی۔ ان میں سے دو چار تو کھلے بندوں خوشی کا اظہار بھی کر رہے تھے۔ کچھ آوازیں اس طرح کی بھی سنائی دیں کہ چلو اچھا ہوا کم از کم زندہ سلامت اپنے وطن تو پہنچ جائیں گے۔ احساسِ ندامت؟ شاید میں اپنی بڑائی بیان کر رہا ہوں لیکن دیکھنا تو یہ ہے کہ ان حالات میں کیا ہمارا رویہ یہی ہونا چاہیے تھا؟ قید ہو جانے یا اس کے امکان کی صورت میں جاپانیوں کی خودکشی ایک انتہائی قدم سہی لیکن کسی بہادر فوج کے ایک معمولی سے معمولی سپاہی کو بھی دشمن کے آگے ہتھیار

ڈالنا گوارا نہیں ہوتا چہ جائیکہ اس پر خوشی کا اظہار کرے۔ میں نے اِنجینئر کے کیپٹن شیراز جو میرا رشتہ دار بھی ہے اور کیپٹن جہاں زیب کو فرار کے لیے آمادہ کر لیا اور انہیں یہ کہہ کر کہ میں انہیں رات کو لینے آؤں گا اپنی فورس کے پاس چلا گیا۔ سب جوان خاموش تھے اور کوئی کسی سے نگاہ نہیں ملا رہا تھا۔ بنگالی رضا کار سہمے ہوئے تھے۔ ان کی تو ساری دنیا ہی لٹ گئی تھی۔ میں نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا کہ تمہیں بھی اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ وہ ہمارے ساتھ فرار ہونے کے لیے تیار تھے بلکہ اپنے آدمیوں سے کچھ زیادہ ہی۔ ان میں سے تین چار کو نوکا ڈھونڈ کر لانے کے لیے کہا تا کہ میگھنا کا وسیع پاٹ رات کے اندھیرے میں پار کیا جا سکے۔ پلان اپنے آدمیوں کو بتایا کہ ایک دن براہمن باڑیہ کے آس پاس کے علاقے کے اندر چھپ کر گزاریں گے اور اس کے بعد اگرتلہ کے جنوب میں واقع جنگلوں میں سے ہوتے ہوئے ہندوستانی اور دوبارہ پاکستانی علاقے سے ہوتے ہوئے برما چلے جائیں گے۔ کل دو اڑھائی سو میل کا سفر بنتا تھا۔ زیادہ مشکل چالیس میل کا وہ میدانی علاقہ تھا جو ہمارے اور پہاڑی علاقے کے درمیان پڑتا تھا۔ ایک رات میں تقریباً ایک میل چوڑے دریا کو عبور کر کے دشمن کے علاقے میں زیادہ سے زیادہ پندرہ، بیس میل تک جایا جا سکتا تھا۔ دشمن اور مکتی بشمول لوکل آبادی اتنے زیادہ تھے کہ سارا وقت جھاڑیوں اور فصلوں میں چھپ کر گزارنا بھی کافی مشکل مرحلہ تھا۔ فرار کے بارے میں اس اطمینان کے ساتھ کہ ہر کمانڈو کی یہی آرزو ہو گی سب کی رائے معلوم نہیں کی۔ صوبیدار منظور اور چند این سی اوز کو ہدایت دے کر انجینئر بٹالین پہنچا تو جو دو افسر ساتھ جانے کے لئے تیار ہوئے تھے اب راضی نہیں تھے۔ ان کے سی۔ او CO نے انہیں منع کر دیا تھا۔ لاکھ سمجھایا کہ ایسے حالات میں اس قسم کا حکم ماننا ضروری نہیں لیکن کوئی بھی میرے ساتھ چلنے کو تیار نہیں ہوا۔ واپس آیا تو میری اپنی

فورس نے بظاہر کوئی تیاری نہیں کی تھی۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ ہر کوئی سمجھتا ہے کہ فرار ناممکن ہے۔ کہنے لگے کہ سر عافیت اسی میں ہے کہ جہاں اتنے ہزار آدمی قید ہوئے ہیں ہم بھی ان کے ساتھ ہی رہیں۔ یہ سن کرتن بدن میں آگ لگ گئی۔ تمام جوانوں کو اِکھٹا کر کے انتہائی جوشیلے انداز میں تقریر کی اور اسکے بعد ایک دفعہ پھر پوچھا کہ اب کون کون جانے کے لئے تیار ہے۔ مگر ایک دو آدمیوں کے علاوہ کوئی بھی فرار کے لیئے آمادہ نہیں ہوا۔ سب نظریں جھکائے بیٹھے رہے۔ سوچا کیا ہی اچھا ہوتا اگر میری اپنی کمپنی ٹیپو یا ابراھیم کے آدمی میرے ساتھ ہوتے۔ یہ دیکھ کر کہ لوگ جانے کے لیے تیار نہیں میں آنسوؤں کو ضبط نہ کرسکا اور کمرے میں جا کر زور زور سے دھاڑیں مار کر رویا۔ تین چار سینئر این۔ سی۔ او NCO میرے پاس شرمسار سے آئے اور کہنے لگے کہ صاحب ہم لوگ بہت گنہ گار ہیں ہم چاہتے ہیں کہ سلامتی کے ساتھ وطن واپس پہنچ جائیں۔ یہاں جان دینے کے لیے کوئی تیار نہیں سب کہتے ہیں کہ ہندوستانیوں کی قید میں جا کر مغربی پاکستان تو پہنچ جائیں گے۔ فرار کی صورت میں راہ کی دشواریوں کے علاوہ موت بھی تو آسکتی ہے۔ ہمارے چاروں طرف ہندوستانی سنتری متعین کر کے ہمیں تھوڑی سی جگہ میں محصور کر دیا گیا۔ ہندوستانی سنتری اور افسروں کو اتنے قریب دیکھ کرتن بدن میں آگ سی لگ جاتی تھی۔ ایک آدھ پاکستانی افسر ابھی سے ہندوستانی افسروں سے دوستی کر کے ان کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف رہنے لگے۔

جی او سی کو کسی جگہ باقاعدہ سرنڈر کی تقریب کے لیئے ایک ہیلی کاپٹر پر لے جایا گیا۔ واپسی پر سب لوگوں کو ایک سکول کی عمارت میں اکھٹا کر کے انہوں نے تقریر کرتے ہوئے یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ ہم نے تو ہتھیار نہیں ڈالے بلکہ ایسٹرن کمانڈ ہیڈ کوارٹر کا حکم مانا ہے۔ اعزاز لینے والوں کے کارناموں کا بھی ذکر

کیا۔ اس کے بعد بریگیڈیئر سعد اللہ نے بھی پر جوش اور حوصلہ افزا تقریر کی۔ ہماری موجودہ حالات کو صبغت اللہ سمجھ کر برداشت کرنے کی تلقین کی۔

بریگیڈیر سعد اللہ کو بھی اعزاز ملا۔ سوچا مجھے کس بات کا اعزاز ملا ہے۔ میں نے تو کوئی غیر معمولی کام سرانجام نہیں دیا۔ فخر کی بجائے شرم محسوس ہوئی کہ انجام کار ہم نے اپنے ازلی دشمن کے سامنے ہتھیار ڈال کر مسلمانوں کی صدیوں کی فتوحات اور روایات پر پانی پھیر دیا ہے۔ مسلمانوں کی روایات میں کٹ مرنا تو تھا لیکن آخری وقت تک لڑے بغیر ہتھیار ڈالنا کبھی نہیں سنا تھا۔ شکست کی کتنی ہی وجوہات پیش کی جائیں سب کی سب غیر معقول ہیں۔ اگر غیر معقول نہ سہی پھر بھی ایک مسلمان کو پیش کرتے ہوئے ضرور شرم آنی چاہیے۔ سننے میں آیا تھا کہ مارچ میں بہت سی مغربی پاکستانی عورتوں کو ننگا کر کے میس میں کھانا کھلانے پر مامور کیا گیا تھا اور اسی طرح میمن سنگھ میں ننگی عورتوں کی پریڈ کرائی گئی اور چٹا گانگ میں لوگوں کا خون نچوڑ کر بلڈ بنک بھرے گئے تھے اور نہتے پاکستانی فوجیوں کو قتل کر کے ان کی لاشوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے گئے تھے۔ لیکن کیا اس کا ردِ عمل یہی ہونا چاہیے تھا جب کہ اصلی مجرم ہندوستان بھاگ گئے تھے۔ ہر انسان حالات، اپنے جذبات کو قابو میں رکھنے کی صلاحیت اور ایمان کے مطابق اپنے ردعمل کا اظہار کرتا ہے۔ نجانے میں ان حالات کو دیکھ کر کیا کرتا۔ گو جذبہ انتقام وقتی ہوتا ہے لیکن اس طرح کے طرزعمل کے لیئے لوگ کوئی نہ کوئی جواز ڈھونڈ لیتے ہیں۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ زیادہ تر بنگالی ہم سے بہت بہتر مسلمان تھے۔ یہ اور بات ہے کہ انتہائی جذباتی ہونے کی وجہ سے مجیب الرحمٰن اور اس کی پارٹی، جس کی باگ ڈور ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی، کے چکموں میں آ گئے۔

اب تو فکرِ شکم تھی۔ بند دوکانوں کے تالے توڑ کر آٹے دال کا بندوبست دو

چار دن تو چلا لیکن اب کہیں کہیں نوبت بھوک اور فاقوں تک پہنچ چکی تھی۔ بنگالی چینی اور مرغی دونوں سو روپے سے زائد میں بیچ رہے تھے۔ ابھی تک ہتھیار ہمارے پاس ہی تھے چونکہ ہندوستانیوں کو تشویش تھی کہ مکتی ہم پر حملہ نہ کر دیں۔ وہ اس طرف سے مطمئن تھے کہ ہم ان کے خلاف ہتھیار استعمال نہیں کریں گے۔ کچھ لوگوں نے اپنے ہتھیار اس نیت سے گڑھوں اور کنوؤں میں پھینک دیئے اور بہت سوں نے گھروں میں چھوڑ دیے کہ ممکن ہے کہ یہ آئندہ آنے والی حکومت کے خلاف استعمال ہوسکیں۔ ڈھاکہ لے جانے کے لیئے ہمیں چھوٹے چھوٹے گروپوں میں بانٹ دیا گیا۔ میں اپنی فورس کے آگے آگے جا رہا تھا جب بریگیڈیر سعد اللہ نے جو چاک و چوبند کھڑے تھے ہماری سلامی لی۔ ان کے چہرے پر ایک عجیب سا تاثر تھا۔ ان کی مسکراہٹ یہ پیغام دینے کی کوشش کر رہی تھی کہ ہمت اور صبر کا دامن نہ چھوڑنا۔

ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ ہر میل ڈیڑھ میل کے فاصلے پر مکتی باہنی کے دس دس آدمی متعین تھے۔ شاید ہماری حفاظت کے لیے انہیں ہندوستانیوں نے مقرر کر رکھا تھا۔ وہ ہم سے بات چیت یا فقرے کسنے سے احتراز کر رہے تھے۔ ویسے نفرت کے علاوہ ہمارے لیے ان کے پاس اور کون سا جذبہ ہو سکتا تھا۔ نفرت بہر حال ہمدردی سے بہتر ہوتی ہے۔ راستے میں لوگوں کے ہجوم ہم پر طرح طرح کے آوازے کستے رہے۔ سر ندامت سے جھکانے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ ایک جگہ ایک بظاہر پڑھے لکھے بنگالی نوجوان نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا کہ How do you like it? (اب کیسا لگ رہا ہے؟) میں نے بھی اس سے یہی سوال کیا تو اِس پر وہ طیش میں آ گیا اور کچھ بکنے لگا۔ میرے قریب سے کمانڈوز کا ایک نائیک صف چھوڑ کر پتھر ہاتھ میں لیئے اُس کے پیچھے دوڑا۔ ایک دو اور بنگالی لڑکے بھی اس نوجوان کے ساتھ ساتھ گاؤں کی طرف بھاگ

گئے ۔ ہمارے ساتھ ساتھ ہندوستانی سپاھیوں نے بھی اُنہیں موٹی موٹی گالیاں دیں ۔تقریباً سولہ میل کا فاصلہ پیدل طے کیا۔ ہم جب بھی کسی جگہ تھوڑی دیر کے لیے رکتے تو بنگالی کیلوں کے ٹوکرے لیکر پہنچ جاتے ۔ ہندوستانیوں کو تو مفت دینے کی پیشکش کرتے لیکن ہمیں کسی قیمت پر بھی دینے کو تیار نہیں تھے ۔ اِس علاقے میں ہندوؤں کا بہت زیادہ اثر تھا۔ ہم نرسندھی سے سولہ میل اس طرف ایک جگہ رُک گئے ۔ٹرین نے ہمیں یہاں سے ڈھاکہ لے کر جانا تھا۔ ہمیں چاروں طرف سے لوگوں کے ایک ہجوم نے گھیر لیا۔ وہ ہمیں طرح طرح کے نعرے لگا کر تنگ کر رہے تھے لیکن اُدھیڑ عمر کا ایک باریش بنگالی ان کو پتھر مار مار کر بھگانے کی کوشش کرتا رہا۔ یہاں ہمیں ٹرین کے ڈبوں میں ٹھونس دیا گیا۔ منزل؟ کئی ایک کے خیال میں واہگہ لیکن اندھے کے ہاتھوں بٹیر کے مصادق ہماری قسمت بنئے کی تجوری میں بند ہو چکی تھی ۔

ڈھاکہ میں ہمیں کُرمی ٹولہ کے ہوائی اڈے کے ساتھ بنے ہوئے ائیر فورس کے کوارٹروں میں رکھا گیا۔ جس جگہ ہم ٹھہرائے گئے وہاں کسی باذوق ایئر فورس کے سارجنٹ کا گھر تھا۔ فرش پر کئی جگہ خون کے دھبے نمایاں تھے۔ کتابوں اور ٹوٹے پھوٹے فرنیچر کے علاوہ وہاں کچھ اور سامان موجود نہیں تھا۔ نجانے اس پر کیا بیتی ہوگی ۔ زندگی میں پہلی بار پچاس جوانوں کے ساتھ لیٹرین اور غسلخانہ شیئر کرنا پڑا۔ میرے پاس چھوٹا سا ایک 32 بور کا پستول تھا جسے میں نے تین حصوں میں کاٹ کر مختلف حصوں کو مختلف چیزوں میں چھپا دیا تھا۔ میری عدم موجودگی میں میرے ایک سپاھی نے ان میں سے ایک حصے کو ساتھ کے ایک کنویں میں پھینک دیا۔ 11 انجینئرز کے افسر بھی اسی کیمپ میں آ گئے تھے ۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر وقت اچھا گذر جاتا تھا۔ کیمپ کمانڈنٹ گورکھا کیپٹن تھا پا بہت خوش اخلاق تھا لیکن جس رجمنٹ (6 سکھ لائٹ انعنٹری) سے اس کا تعلق تھا وہ زیادہ تر نچلی ذات کے سکھوں پر مشتمل تھی ۔ باقی

افسروں کا رویہ نہایت تحقیر آمیز تھا۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اُونچی ذات کے سکھ نیچی ذات کے سکھوں سے کس قدر نفرت کرتے ہیں۔ ہمیں اپنی اپنی یونٹوں میں جو ڈھاکہ چھاؤنی کے مختلف کیمپوں میں تھیں بھیجا گیا۔ میں نے اپنی یونٹ اس غرض سے 3 سگنل بٹالین لکھوادی تھی کہ اپنے بھائی کیپٹن عبدالرحمان کا ساتھ ہو سکے۔ رضا کار ہمارے ساتھ رہنا چاہتے تھے لیکن ان حالات میں یہ ممکن نہیں تھا کیونکہ بنگالیوں کو ہم سے الگ کیا جا رہا تھا۔ ماسوائے ایک رضا کار کے جس کی ایک بہن مغربی پاکستان میں تھی اور رنگ گندمی تھا باقی کیمپ چھوڑ کر روپوش ہو گئے۔ ویسے بھی ان کا ہمارے ساتھ اپنی قسمت منسلک کرنا حماقت ہی تو ہوتی۔ لیکن ان کے اپنے بھی تو ان کی جان کے دشمن تھے۔ ہمارا ساتھ دینے والے ہر بنگالی کو حقارت کی نظر سے دیکھا جا رہا تھا۔ لیکن یہ تو عظیم لوگ تھے جنہوں نے فقط اسلام کے تحفظ کے لیے ہمارا آخری دم تک ساتھ دیا۔ اور نہیں تو وہ ہمیں شکست کے دنوں میں بھی تو چھوڑ سکتے تھے۔ ہمارے ساتھ جتنے بھی رضا کار تھے ان کی عمر بمشکل پندرہ سے بیس سال تھی۔ لیکن حالات نے انہیں جوان بنا دیا تھا۔ کئی ایک کے رشتہ داروں کو مُکتیوں نے بالکل ختم کر دیا تھا۔ ایک دوسے میں نے پوچھا کہ تم اپنے گھروں کو کیوں نہیں چلے جاتے تو ضبط نہ کر سکے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ کہنے لگے صاحب! اب گھر میں رکھا ہی کیا ہے؟ ماں باپ، بہن، بھائیوں سب کو مکتیوں نے قتل کر دیا تھا۔ پاکستان سے محبت کا صلہ!

کیا سرنڈر ناگزیر تھا؟

حال ہی میں نے ہندوستان کے ایک جرنل جیکب جو سب سے پہلے ڈھاکہ پہنچا تھا اور نیازی کو سرنڈر کرنے کا کہا تھا کا انٹرویو سنا تو حیران رہ گیا۔ اس نے بتایا کہ سرنڈر کے وقت ڈھاکہ کے اردگرد صرف تین ہزار ہندوستانی فوجی پہنچے تھے جبکہ وہاں ہمارے اپنے تقریبا چوبیس ہزار فوجی موجود تھے۔ اس سے قبل میرا خیال تھا ہتھیار اس لیئے ڈالے گئے تھے کہ ہندوستانی فوج کے ایک بہت بڑے حصے نے چاروں طرف سے ڈھاکہ کو اس وقت گھیرا تھا جب ہمارے پاس دفاع کے لیئے بہت کم فوج رہ گئی تھی، اس میں تو کوئی شک نہیں کہ باوجود انڈیا کے بھرپور حملے کی پلاننگ اور بعض علاقوں میں باقاعدہ جنگ کی ابتدا کے ہم نے ڈھاکہ میں اس طرح کی صف بندی نہیں کی تھی کہ ہم موئثر طور پر اس کا دفاع کرسکیں۔ ہندوستانیوں سے تعداد میں نہایت کم ہونے، ٹینکوں کی کمی اور ناکافی ائرسپورٹ کے اور وہ بھی دو تین دنوں کے بعد ختم ہونے کے باوجود ہماری فوج نہایت دلیری سے متعدد معاذوں پر ان کم وسائل اور اپنی صلاحیت سے کئی گنا زیادہ علاقے کا دفاع کئی دنوں تک کرتی رہی تھی۔ اگر ہم نے غلط منصوبہ بندی کے تحت اتنی کم تعداد کو پورے بارڈر پر پھیلا کر اس کی دفاعی صلاحیت کمزور نہ کر دیا ہوتا اور پھر اسے پیچھے ہٹنے کی اجازت

ہندوستانی فوج کے بھرپور حملے کے پیش نظر بہت پہلے دے دی جاتی تو اس طرح کی ذلت آمیز شکست سے بچ سکتے تھے۔

جب اس وقت بھی پورے بارڈر پر پھیلی ہوئی یونٹوں کو اکھٹا کر کے انہیں دشمن سے مقابلے کے لئیے موئثر دفاعی پوزیشنوں پر نہ لایا گیا تو میلوں لمبے علاقوں میں خالی جگھوں Gaps میں سے بنگالیوں کی رہنمائی میں دراندازی کر کے ہندوستانی فوج نے ان کے عقب آکر گھیر کر باقاعدہ پلاننگ کے تحت لڑائی اور بعد میں ہماری پسپائی کو بہت مشکل بنا دیا تھا۔ان حالات میں بہت کم یونٹیں صحیح اور سالم حالت میں ڈھاکہ پہنچ پائی تھیں۔لیکن سرنڈر سے قبل سوائے ان چند ایک کے جو شہید یا قید ہو گئے تھے تقریبا تمام فوجی پلاٹونوں اور کمپنیوں کی صورت یا چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں شمال مغربی معاذوں سے وہاں اکھٹے ہو گئے تھے اور بہت سے اپنی اپنی یونٹوں سے بھی جا ملے تھے۔

میں اپنی بڑائی بیان تو نہیں کرنا چاہتا لیکن یہ ضروری ہے کہ میں ان امکانات پر تبصرہ کروں جس کی وجہ سے ہم سرنڈر کی ذلت سے بچ سکتے تھے۔میں اس سے پہلے بیان کر چکا ہوں کہ بھیراب بازار میں میں نے جنرل مجید سے کہا تھا کہ سر ہم یہاں آکر کیوں بیٹھ گئے ہیں ہمیں ڈھاکہ کی طرف پیش قدمی کر کے اس کے دفاع کو مضبوط کرنا چاہئیے ۔اس پر جنرل عبدالمجید نے مجھے دشمن کی اس پوزیشن جو چھوٹے براہم پترا کے اس پار ہمیں ڈھاکہ سے کاٹنے کے لگائی تھی پر 12/13 دسمبر کی رات حملہ کرنے کا مشن دیا تھا اور جس کے لئیے مجھے اپنے تیس کمانڈوز کے علاوہ انفنٹری کی دو کمپنیاں بھی دینے کا کہا گیا تھا۔لیکن جنرل مجید نے مجھے اسی دن شام کو بلا کر کہا تھا کہ وہ حملہ ملتوی کر دیا گیا ہے کیونکہ میرے خیال میں ہم یہیں ٹھیک ہیں۔اگر اس وقت ہمیں اجازت دے دی جاتی تو ہم ڈھاکہ کی جانب بڑھتے ہوئے دشمن کو جس

نے اسی راستے سے ہوتے ہوئے بعد میں ڈھاکہ پر دباؤ بڑھا کر نیازی کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا تھا روک سکتے تھے۔ حملہ نہ کرنے کی وجوہات کا تو اس وقت مجھے پتہ نہ لگا لیکن جب پاکستان آ کر بریگیڈیئر سعداللہ کی کتاب پڑھی تو انہوں نے جو اس کے بارے میں لکھا ہے وہ زیادہ درست نہیں ہے کیونکہ جس میٹنگ کا انہوں نے حوالہ دیا ہے میں اس میٹنگ میں موجود ہی نہیں تھا۔ لگتا ہے کہ شاید انفنٹری کی یونٹوں نے اپنی کمپنیاں میرے زیرکمان کرنے پر اعتراض کیا ہوگا اسی لئے اس حملے کو ملتوی کر کے انفنٹری کو یہ کام سونپا گیا ہو لیکن یہ کام وہ سرنڈر ہونے تک انجام نہ دے سکے۔ شاید ان کے خیال میں یہ بات درست ہو کہ دشمن کی ایک بٹالین پر دو کمنیوں کے ساتھ حملہ کرنے سے کامیابی کی امید کم ہے خاص کر جب اس کی کمان ایک کمانڈو افسر نے کرنی تھی۔ بنیادی طور پر میرا تعلق سگنل کور سے تھا اور ایس ایس جی میں روائتی طریقے سے حملہ کرنے یا کوئی دفاعی پوزیشن منظّم کرنے کی کوئی ٹرینگ نہیں دی جاتی۔ ملٹری اکیڈمی اور اسکول آف انفنٹری اور ٹیکٹس میں بھی کتابی اور کچھ ایکسرسائزوں کے دوران کی ٹرینگ ایک حد تک ہی کافی ہوتی ہے۔ لیکن میرا ارادہ روائتی حملے کی بجائے دشمن کے عقب جس کی میں دو دن قبل ریکی کر چکا تھا میں جا کر اچانک حملہ کرنے کا تھا۔ چونکہ دشمن اتنی تیزی سے وہاں ابھی تک مستحکم دفاعی پوزیشن نہیں قائم کر سکا تھا اور اس سے قبل آشوگنج میں ایک ذلت آمیز شکست سے دوچار ہو چکا تھا اس لیئے ہمارے آپریشن کی کامیابی کافی حد تک ممکن تھی۔ بھیرب بازار میں بیٹھے رہنے سے دشمن کے خلاف کچھ کاروائی کرنا بہر حال زیادہ بہتر تھا۔ 27 بریگیڈ کے کمانڈر بریگیڈئر سعداللہ جنہوں نے اپنی کتاب میں مجھے نہایت اچھے الفاظ میں یاد کیا ہے نے اسی کتاب میں میری تجویز کو بہت ہی مختلف انداز میں بیان کیا ہے۔ دو دن بعد جب حملے کی تیاری کی جا رہی تھی تو سرنڈر کا اعلان ہو

گیا۔ ہم نے بلا وجہ چھ دن بھیراب بازار میں ضائع کئے اور اس ایک وجہ کے علاوہ وہاں کافی تعداد میں موجود ہماری فوج کی عدم صف بندی اور افرتفری کی بدولت ہندوستانی فوج بلا روک ٹوک ڈھاکہ میں داخل ہوگئی۔

برگیڈ کے کمانڈر برگیڈئیر سعداللہ کی کتاب پڑھنے سے واضع ہو جاتا ہے کہ انہوں نے بھیراب بازار کو ایک نا قابل شکست قلعہ بنانے کی ٹھان لی تھی۔ میں حیران ہوں کہ اگر مجھ جیسے ایک جونئیر اور غیر انفنٹری افسر کو یہ خیال آ سکتا تھا کہ بھیراب بازار میں بیٹھے رہنے سے ہم آئندہ لڑائی میں کوئی خاطر خواہ رول ادا نہیں کر سکتے اور ہماری ڈھاکہ کی طرف پیش قدمی اس کے دفاع میں مدد دے سکتی ہے تو اسٹاف کورس اور وار کورس سے فارغ التحصیل تجربہ کار برگیڈئیر اور جنرل اس کا صحیح ادراک کیوں نہیں کر سکے۔ میرے خیال میں ایسٹرن کمانڈ ہیڈکوارٹر نے بھی انہیں کسی دفاعی منصوبے کا حصہ نہیں بنایا تھا بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس طرح کا کوئی پلان سرے سے موجود ہی نہیں تھا۔ جی ایچ کیو نے بھی انہیں ان کے حال پر چھوڑ کر پلانگ سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا تھا اور وہاں پر ہونی والی جنگی صورت حال سے جو ایسٹرن کمانڈ انہیں بتا رہا تھا اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ سرنڈر نا گزیر ہو گیا ہے اور جس کا انتظار نیو یارک میں بیٹھا ہوا بھٹو کر رہا تھا۔

بحر حال برگیڈ نے مزید دو دن ضائع کرنے کے بعد 14/15 دسمبر کی رات کو حملے کا پلان بنایا لیکن حملہ کرنے والے کمانڈر میجر ذوالفقار کے پلان پر اعتراض کرنے پر اسے اگلے دن کے لیئے ملتوی کر دیا گیا۔ اس کے باوجود 15/16 کی رات کو کوئی حملہ نہ ہوا اور مجھے دوبارہ دشمن کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کے لیئے بھیج دیا گیا اور جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں اس وقت تک ہندوستانی اپنے مورچے خالی کر چکے تھے جنہیں لگتا ہے سرنڈر کے بارے میں علم ہو چکا تھا۔ میں نے جو کچھ لکھا

ہے اس کا مطلب یہ نہ لیا جائے کہ میں نے اپنے آپ کو خدانخواستہ بریگیڈ کمانڈر اور جنرل عبدالمجید سے لڑائی کی پلانگ کے سلسلے میں بہتر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔انہیں ہوسکتا ہے جنرل نیازی نے وہیں رکنے کا آرڈر دیا تھا لیکن اگر ایسا تھا تو 15/16 کی رات مجھے پٹرولنگ کے لیئے کیوں بھیجا گیا تھا؟

لفٹیننٹ جنرل کمال متین الدین نے اپنی کتاب میں حیران کن طور پر سرنڈر کی وجوہات میں اس بریگیڈ کا اس سلسلے میں کوئی تذکرہ نہیں کیا حالانکہ ڈھاکہ پہنچنے والی فوج اسی طرف سے ہی پہنچی تھی اور شاید اس میں انہی یونٹوں کے لوگ شامل تھے جنہیں آشوگنج میں 27 بریگیڈ کے ہاتھوں ذلت آمیز شکست ہوئی تھی۔ جنرل صاحب نے صرف اتنا لکھا ہے کہ ہندوستانی مشرق کی طرف سے ایک بہت بڑی فوجی قوت سے حملہ کر کے مختصر ترین راستے سے ڈھاکہ پہنچے۔ بہت بڑی فوجی قوت جوانہوں نے بتائی اور سب سے پہلے ڈھاکہ پہنچی وہ تو ہندوستانی جنرل جیکب کے مطابق صرف 3000 فوجیوں پر مشتمل تھی۔افسوسناک بات تو یہ ہے کہ باوجود آشوگنج میں ہماری ایک قلیل تعداد میں فوج سے شکست کھانے کے دشمن اسی سیکٹر سے ہی باقی فوج سے پہلے ڈھاکہ پہنچنے میں کامیاب ہوگیا اور ہم جیت کی خوشی میں بھیراب بازار میں رک کر قلعہ بندی میں مصروف ہو گئے۔ بھارتی فوج کی یہ نہایت درجے کی احمقانہ حرکت ہوتی اگر وہ بھیرب بازار پر حملہ کر کے بلاوجہ نقصان اٹھانے کے علاوہ وقت ضائع کرتی کیونکہ وہ اسے آسانی سے بائی پاس کر کے ڈھاکہ کے قریب رائے پور یا نرسندی کے علاقے میں پہنچ سکتی تھی۔ بھیراب بازار سے ویسے بھی کوئی سڑک ڈھاکہ کی طرف موجود نہیں تھی اور ریلوے لائن ناکارہ ہوچکی تھی۔اس نے کمال ہوشیاری اور نہایت سرعت کے ساتھ چھاتہ بردار فوج ہمارے عقب میں اتار کر ہمیں بلاک کیا اور کشتیوں اسٹیمروں کے ذریعے میگھنا کے اس پار اتر کر بغیر کسی مزاحمت کے ڈھاکہ

کی طرف پیش قدمی کی۔ چاہیے تو یہ تھا کہ ہم بھیراب بازار میں کچھ دستے متعین کرتے اور جن اسٹیمروں اور کشتیوں پر ہم بریگیڈ کو آشوگنج سے نکال کر بھیراب بازار لائے تھے اور جن میں وہ گیارہ بارہ اسٹیمر جو نرائن گنج سے ہم اپنے ساتھ لائے تھے شامل تھے انہی کے ذریعے 10 دسمبر ہی کو ڈھاکہ سے قریب رائے پور یا نرسندی پہنچاتے۔ اس طرح دشمن کے لیئے میگھنا سے پار اتر کر ڈھاکہ کی طرف پیش قدمی ناممکن ہو جاتی۔ اگر وہ بھیراب بازار پہنچ بھی جاتے تب بھی کسی زمینی راستے کی عدم موجودگی میں ڈھاکہ کی طرف ایک بڑی تعداد کے ساتھ اس کی پیش قدمی ناممکن تھی۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے ڈھاکہ کے نواح میں اس وقت صرف 3000 ہندوستانی ڈھاکہ کے نواع میں پہنچ پائے تھے اور ان کے مقابلے میں ہمارے تقریباً 24000 فوجی وہاں موجود تھے جن میں کچھ وہ بھی انفنٹری یونٹیں شامل تھیں جو جمال پور اور میمن سنگھ کے معاذوں سے پسپا ہو کر ڈھاکہ پہنچیں تھیں۔ متعدد یونٹیں جن میں سگنل کی تین بٹالین، انجینئر کی دو بٹالین (یاد رہے کہ سگنل اور انجینئر کوروں کا ثانوی رول انفنٹری کا ہوتا ہے اور وہ اسکی مکمل طور پر اہل ہوتیں ہیں)، آرمی سروس کور، آرڈیننس کور، لائٹ اینٹی ائیر کرافٹ بٹالین اور بے شمار اضا کار اگر کسی دفاعی پلان کے مطابق ہندوستانی فوج کا مقابلہ کرنے کے لئے ڈٹ جاتے تو کئی ہفتوں تک ہندوستانی ڈھاکہ کی طرف پیش قدمی نہ کر سکتے۔ ڈھاکہ کی گلیوں اور مکانوں کے اندر تو ہم مہینوں تک لڑ سکتے تھے جس کے مدنظر ہندوستان سیز فائر پر جلد ہی راضی ہو جاتا خاص کر جب اندرا گاندھی نے اپنی فوج کو امریکہ کے دباؤ کے تحت صرف دو ہفتوں کا وقت دیا تھا۔

عجیب بات جو حال ہی میں مجھے لفٹیننٹ جنرل کمال متین الدین کی کتاب ٹریجڈی

آف ایررز Tragedy of Errors کے پڑھنے کے بعد پتہ چلی کہ شمال میں بھارتی بارڈر سے لیکر ڈھاکہ کے درمیان کوئی بڑی دریائی رکاوٹ نہ ہونے کے باوجود اس راستے کا موثر دفاع نہیں کیا گیا تھا۔ میجر جنرل جمشید کو ایک ایڈہاک Ad hoc بریگیڈ اور چند دوسری معاون یونٹیں دے کر یہ ذمہ واری سونپی گئی تھی۔ یہ بریگیڈ میمن سنگھ کے علاقے میں بریگیڈئیر عبدالقادر کے زیر کمان تھا۔ جب دشمن کا دباؤ بڑھا اور اس کے پیچھے سے گھیرا ڈال لیا گیا تو بغیر کسی قابل ذکر مزاحمت کے انہوں نے غیر منظّم طریقے سے پسپائی اختیار کی اور چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں انفرادی طور پر ڈھاکہ پہنچنے کی کوشش کی لیکن ان کے راستے میں موجود ہندوستانی فوج اور مکتی باہنی کی وجہ سے بہت سے لوگ مارے گئے اور بریگیڈ کمانڈر سمیت بہت سے جوان اور افسر قید ہوئے۔ جو کسی طور ڈھاکہ پہنچنے میں کامیاب ہوئے وہ تتر بتر ہو کر جہاں جگہ ملی وہیں دبک گئے۔

یہ بات سمجھ سے بالا تر ہے کہ جب انڈیا نے نومبر کے وسط سے ہمارے بارڈروں پر مکمل تیاری کے ساتھ اپنے سات ڈویژن بھیج کر چند علاقوں پر باقاعدہ حملے شروع کر دیئے تھے اور بعض جگہوں پر سرحد کے کافی اندر آ گئے تھے تو ہم نے کیوں ایک ایک انچ کے دفاع کے لیئے اپنی یونٹوں کو ایک ایک سیکشن کے حساب سے پورے چار ہزار کلومیٹر بارڈر پر پھیلائے رکھا۔ اس طرح ہم نے نہ صرف چھوٹی پوسٹوں کا دفاع کرنے میں قیمتی جانیں اور روا قت گنوایا بلکہ ہندوستانی فوج کو موقع دیا کہ وہ ہماری دفاعی پوزیشنوں کے اطراف سے ہو کر (بائی پاس) ان کے عقب میں پہنچ کر حملے کر سکے۔ جب ان یونٹوں نے گھیرا توڑنے کی کوشش کی تو انہیں زیادہ تر شکست سے دوچار ہونا پڑا اور ہمارے جوان ایک غیر منظّم اور افراتفری کے عالم میں شہید ہوئے۔ ہمارا یہ موقف کہ تھوڑا سا علاقہ بھی بنگالیوں کے قبضے میں نہ جانے

دیا جائے تا کہ وہ وہاں بنگلہ دیش کا اعلان کر کے حکومت کی تشکیل نہ کرسکیں فوجی لحاظ سے نہایت احمقانہ تھا اور جو ہماری شکست کا شاخسانہ ثابت ہوا۔اس پالیسی اوراس طرح کا ھوا کھڑا کرنے میں جناب زندہ شہید کا مشورہ بھی کافی اہمیت کا حامل تھا کیونکہ خارجی امور پر وہ یحیٰ خان کے مشیر کا رول ادا کر رہا تھا۔

اس پہ طرہ یہ کہ 3 دسمبر کو ہم نے ہندوستان کے خلاف اعلان جنگ کر کے مغربی پاکستان میں ایک نیا معاذ کھول دیا تا کہ مبینہ طور پر مشرقی معاذ پر دباؤ کم کیا جاسکے لیکن اس کے لیئے پوری تیاری نہیں کی گئی تھی اور نہ ہی اس مرحلے پر ہندوستان کو مغربی معاذ کی فکر ہوسکتی تھی کیونکہ اس نے پہلے ہی سے اس کے موئثر دفاع کا بندوبست بلکہ حملے کی تیاری کر رکھی تھی۔اس طرح ہندوستان کو کھل کر مشرقی پاکستان میں فوج کشی کرنے کا جواز مل گیا اور امریکہ اور دوسرے مما لک کی طرف سے جنگ بندی کے لیئے ہندوستان پر دباؤ میں کمی آ گئی۔اس وقت کے ائیر چیف نے یحیٰ خان کو واضع طور پر بتا دیا تھا کہ ائیرفورس جنگ کے لئے مکمل طور پر تیار نہیں ہے۔ نتیجاً نہ صرف پہلے ہی ہلے میں ہم نے بہت سے ہوائی جہاز تباہ کروا دیئے بلکہ پاکستان کا کشمیر اور کئی دوسری جگھوں پر بہت سا اہم علاقہ ہندوستان کے قبضے میں چلا گیا۔اس میں کارگل کا وہ علاقہ بھی شامل تھا جسے دوبارہ حاصل کرنے کی غرض سے اس کی اہمیت کے پیش نظر پرویز مشرف نے ناکام فوج کشی کی تھی۔

کیا ہم سات مہینوں تک ان سب چیزوں سے بے خبر رہے تھے اس لیئے ہم نے اس بارے میں کوئی حکمت عملی نہیں اپنائی ؟ جب سب کچھ ہاتھ سے نکلتا دکھائی دیا تو گھبرا کر آخری مہینوں میں کچھ فوجی یونٹیں مشرقی پاکستان بھجیں جن میں ٹینک رجمنٹس شامل نہیں تھیں۔ان یونٹوں میں سے چند ایک کو ایڈ ہاک برگیڈوں کے زیر کمان کر کے دو مزید ایڈ ہاک دویژن بنائے گئے اور جلد بازی میں بارڈروں کی طرف بھیج

دیئے گئے۔ان کے پاس ٹینکوں کے علاوہ توپ خانے کی یونٹیں بھی نامکمل تھیں۔مزید برآں ان کے پاس ان علاقوں اور ان حالات میں جنگی کاروائیاں کرنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا اور نہ ہی انہوں نے ان علاقوں کو پہلے سے دیکھا تھا۔ان کے پاس انٹیلیجنس اکھٹی کرنے کا بھی کوئی قابل اعتماد ذریعہ نہیں تھا۔پہلے سے موجود (اگر واقعی موجود تھے) خفیہ ایجنسیوں کے کچھ ذرائع ان ڈویژنوں کے حوالے نہیں کیئے گئے۔ان ایجنسیوں کا کچھ حال جو میں نے سنا اس کا بھی ذکر یہاں مناسب ہوگا۔ہمارے ڈویژن کے ساتھ جو فیلڈ انٹیلیجنس یونٹ FIU تھی اس کی کمانڈ ایک میجر صاحب کر رہے تھے اور ہمارے ساتھ بھیراب بازار میں موجود رہے تھے۔ان کے بارے میں مشہور تھا کہ انہوں نے راکٹ لانچر کا صحیح اسعمال کرتے ہوئے کئی بنکوں کے سیف توڑے تھے۔راکٹ لانچر ان کے ہاتھ کیسے لگا تھا اس کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا لیکن ان کی پیشہ ورانہ قابلیت کے مدنظر یہ حصول ان کے لیئے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔اس صورت حال میں نئے آنے والوں کو ایک بہانہ مل گیا کہ ہمیں ہندوستانی فوج کی کارروئیوں اور پیش رفت کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلتا۔لیکن یہ عذر وہ ڈویژن اور برگیڈ جو کافی عرصے سے وہاں موجود تھے اور جنہوں نے مکتیوں کے خلاف پورے صوبے میں کاروئیاں بھی کی تھیں پیش نہیں کر سکتے۔اس کے علاوہ ملٹری انٹیلیجنس اور آئی ایس آئی کو مشرقی معاذ پر ہندوستانی فوج کی تیاریوں کا، جس کے بارے میں جنرل مانک شاہ کا کہنا تھا کہ وہ چھ مہینوں سے اس میں مصروف تھے، کیوں علم نہیں ہوا اور اگر ہوا تھا تو پھر فوجی قیادت اور گورنمنٹ نے اس کے صورت حال سے نپٹنے کے لیئے کوئی تیاری کیوں نہیں کی تھی؟

اس وقت ڈھاکہ میں نیازی کے علاوہ تین جنرل موجود تھے لیکن کسی نے بھی

دفاع کو منظم کرنے میں کوئی کردار ادا نہیں کیا اور بے حس و حرکت بیٹھے رہے۔ڈھاکہ کے شمال مغرب میں دریائے براہم پترا کے پار باوجود ابتداہی پسپائی کے ایک اچھی خاصی دفاعی لائن قائم ہوچکی تھی اور ہندوستانی کسی طورا تنی لمبی سپلائی لائن اور مورچہ زن پاکستانی فوج سے آگے بڑھ نہیں سکتے تھے۔اوراگروہ اس دفاعی لائن کوتوڑنے میں بھی کامیاب ہوجاتے تو براہم پترا کہ اس پار دفاعی پوزیشن کو ہفتوں تک ختم نہیں کیا جا سکتا تھا۔سلہٹ، چٹا گانگ، چاند پوراورکھلنا میں ہمارے بریگیڈ ایسٹرن کمانڈ کی طرف سے سرنڈر کا حکم ملنے کے باوجود ایک دن بعد تک ہندوتانی فوج سے ڈٹ کر مقابلہ کرتے رہے تھے۔کئی کمانڈراورافسریہ آرڈر ملنے پر پھوٹ پھوٹ کر روئے۔کھلنا بریگیڈ کمانڈر بریگیڈیئر محمد حیات ستارہ ءجرأت جو اس سے قبل ایس ایس جی کی ایک بٹالین کمانڈ کر چکے تھے کے بارے میں کرنل شجاعت ،جس کی یونٹ اسی بریگیڈ کے تحت تھی، نے اپنی کتاب میں اس بریگیڈ کے اسٹاف کیپٹن حفیظ ملک (بعد میں بریگیڈئیر) جوقید کے دوران ٹرین سے فرارکی کوشش کے وقت ہمارے ساتھ موجود تھا اوراس کے بعد رانچی میں بھی ہمارے ساتھ قید رہا کے حوالے سے یوں رقم طراز ہے۔

" 16 دسمبر کو بریگیڈ ہیڈکوارٹر میں جنرل سرنڈرGeneral surrender کا حکم موصول ہوا۔اسے دکھانے بریگیڈ کمانڈر کے مورچے میں گیا۔اسے پڑھتے ہی ایسے لگا جیسے انہیں سکتہ طاری ہوگیا ہے۔چندلمحوں کے بعد اٹھ کر مورچے (Bunker) کی دیوار پراپنا سر دے مارا اور رونا شروع کر دیا۔ان کوسخت دھچکا لگا۔وہ ایک دلیرافسر تھے۔IMA/PMA کے کمیشنڈ تھے۔دلیرانہ کارکردگی کی بنیاد پر 1965 کی ہندو پاک کی جنگ میں ستارۂ جرأت کا اعزاز حاصل کیا۔"

اگلے مورچوں پرلڑائی میں مشغول بریگیڈوں کا سرنڈر کے بارے میں میرے

چھوٹے بھائی کیپٹن عبدالرحمان تمغۂ جراُت نے اپنے قید سے فرار کی کہانی جس کی تفصیل آگے آئے گی میں کچھ اس طرح بیان کیا ہے۔عبدالرحمان کا تعلق بھی سگنل کور سے ہے اور سرنڈر کے بارے میں ہندوستانی کمانڈروں سے بات چیت کے وقت وہ ایسٹرن کمانڈ کے نیٹ کے کمانڈ اسٹیشن پر موجود تھا۔

" ہمارے وائرلیس نیٹ پر چونکہ تمام ڈویژن اور برگیڈ بھی تھے اس لیئے انہوں نے جب یہ پیغامات سنے تو انہوں نے مجھے برا بھلا کہا اور کئی ایک نے گالیاں دینی شروع کر دیں کہ تم یہ کیا کہہ رہے ہو اور کدھر سے یہ لنک (کلکتہ کے ساتھ) لگا لیا ہے اور کس نے تمہیں حکم دیا ہے سرنڈر کا وغیرہ وغیرہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔شام کو کلکتہ سے جس سے ہمارا رابطہ قائم ہوا تھا پوچھا گیا کہ کیا انسٹرومنٹ آف سرنڈر(Instrument of Surrender) پر دستخط ہو گئے ہیں کہ نہیں؟ جس کے جواب میں میں نے کہا کہ ہمیں پتا نہیں۔انہوں نے اصرار کیا تو میں نے کہا انتظار کریں اور میں برگیڈئیر باقر (چیف آف سٹاف ایسٹرن کمانڈ) کے پاس گیا اور انہیں بتایا کہ وہ سرنڈر کے بارے میں بار بار پوچھ رہے ہیں۔ وہاں کلکتہ میں جنرلسٹ انتظار کر رہے تھے۔انہوں نے کہا کہ جب دستخط ہو گئے تو بتا دیں گے۔ جب دستخط ہو گئے تو میں نے انہیں وائرلیس پر بتا دیا۔ چونکہ جی ایچ کیو کے علاوہ ڈویژن اور برگیڈ بھی ہمارے نیٹ پر موجود تھے اس لیئے انہوں نے جب سنا تو بہت شور مچایا اور ماننے سے انکار کیا۔"

جو کچھ میں نے اوپر بیان کیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے پاس سرنڈر کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا اور اس ذلت سے صرف اور صرف جی۔ ایچ۔ کیو اور ایسٹ پاکستان میں موجود جرنیلوں کی نااہلی اور ذوالفقار علی بھٹو کی ہوس اقتدار نے ہمیں دوچار کیا تھا۔اگر بھٹو پولینڈ اور روس کی جنرل اسمبلی میں پیش کی گئی قرادادکو

رد نہ کرتا تو بھی ہم سرنڈر سے بچ سکتے تھے۔ اگر وہاں کی سیاسی قیادت سے کوئی سمجھوتا نہ ہوسکتا تو بغیر سرنڈر کے ہم پاکستان واپس آسکتے تھے اور ہماری تاریخ پر یہ سیاہ دھبہ لگنے سے رک سکتا تھا۔

... North of the Old Brahamputra river. ... that we could

I held an order group on the 15th morning for an attack at first light 16th December. Major Naeem, 33 Baluch would lead the attack. Our two tanks would support. "Sir, why not put in a Brigade attack", suggested Major Qadir. I felt very pleased with his implied criticism. It showed that the desire to close in with the enemy to destroy him was strong. The fire of his enthusiasm lit up many other faces. "Qadir but don't you know the mechanics of a brigade attack. When Major Naeem crosses the old Brahamputra river some one else would secure the crossing site. While Naeem goes for his objective, I would be ferrying more troops across the old Brahamputra. Based on Naeem's success and the enemy reaction I will develop further operations". Qadir was mollified. He had stimulated a vigorous chain of thought.

... tanks to a position

بر گیڈیئر سعد اللہ ہلال جرأت کی کتاب ایسٹ پاکستان ٹو بنگلہ دیش سے اقتباس۔

میں اس میٹنگ میں جس کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے موجود نہیں تھا۔ اس سے تین دن پہلے مجھے جنرل مجید کی طرف سے دشمن پر حملہ کرنے کا کہا گیا تھا جو بعد میں ملتوی کر دیا گیا تھا۔

کچھ دن ڈھاکہ میں

ڈھاکہ چھاونی میں واقع عبدالرحمان کے کیمپ میں پہنچا تو وہ سامنے سے کچھ ساتھی افسروں کے ساتھ وہ میری سمت میں آتا ہوا نظر آیا۔ دیکھتے ہی دوڑ کر میرے ساتھ لپٹ گیا۔ شدتِ جذبات سے اس کے منہ سے کوئی لفظ نہیں نکلا۔ میری طرف سے بہت فکر مند تھا۔ سرنڈر کے دن وہ سگنل سینٹر میں تھا اور ہندوستانیوں کے آنے کے بعد اس کی گھر والوں سے بات چیت ہو گئی تھی۔ چھاؤنی میں ایسا لگتا تھا جیسے حالات معمول پر ہیں۔ ہندوستانی بہت کم نظر آتے تھے۔ ہمارے جوان اپنے افسروں کے زیر کمان ابھی تک روزمرہ کے کاموں میں مشغول رہتے تھے لیکن کبھی کبھی جوانوں اور ان کے اپنے افسروں میں ترش کلامی بھی ہو جاتی تھی۔ جوان ہتھیار ڈالنے کی ساری ذمہ داری افسروں پر ڈالتے تھے۔ کچھ تو بہت جذباتی ہو گئے تھے۔ یہاں کچھ لوگوں میں اب بھی سرنڈر کے حوالے سے غم و غصے کی لہر پائی جاتی تھی۔ شاید جنگ کے محاذ سے دوری کی وجہ سے انہوں نے جنگ ختم ہونے پر اطمینان کا وہ اظہار نہیں کیا جو دشمن میں گھری ہوئی فوجوں نے کیا تھا۔ بہر حال مجموعی طور پر لوگ آئندہ آنے والے حالات سے بے خبر مطمئن نظر آتے تھے۔ میرا زیادہ وقت کمانڈو بٹالین میں گزرتا تھا۔ جوان توڑ پھوڑ میں لگے رہتے تھے اور انڈین اس بات پر کافی مشتعل

ہو جاتے تھے۔ ہندوستانی سپاہی جو کیمپ کے نزدیک کسی ایک جگہ پر ٹھہرے ہوئے تھے رات کو بیرکوں میں پھرتے رہتے تھے اور لوگوں سے ان کی گھڑیاں ریڈیو اور دیگر قیمتی اشیاء ہتھیانے کی کوشش کرتے تھے۔ ایک سنتری نے کمانڈو بٹالین کے ایک جوان سے گھڑی مانگی تو اس نے اپنی کلائی اسکے آگے کر دی کہ خود کھول لو۔ جونہی اس نے ہاتھ بڑھایا تو اس نے اپنا دوسرا ہاتھ مار کر اس کی کلائی کی ہڈی توڑ کر اس کی رائفل چھین لی۔ اس واقعہ کے بعد وہ لوگ محتاط ہو گئے تھے۔

ہندوستان کے ٹرانسپورٹ طیارے ہر وقت فضا میں نظر آتے تھے۔ لگتا تھا کہ وہ ڈھاکہ کے فوجی ڈیپوؤں سے سارا سامان جنگ اور قیمتی اشیاء نکال کر اپنے ملک لے جا رہے تھے۔ عبدالرحمان کے پاس ایک ٹرانسسٹر ریڈیو تھا جسے ہندوستانی سو روپوں میں بیچ کر ہم نے آپس میں پچاس پچاس روپے بانٹ لئے تھے تاکہ آئندہ فرار کے بعد کام آ سکیں۔ آہستہ آہستہ لوگوں کو ہندوستان میں واقع کیمپوں میں لے جایا جا رہا تھا۔ یہاں کیمپوں میں پاکستانی سویلین اور بہاری اکٹھے کر دیئے گئے تھے۔ جن غیر فوجی لوگوں کے پاس کچھ زیادہ رقم تھی انہوں نے ہوائی جہاز کے ٹکٹ لے رکھے تھے۔ شاید ریڈ کراس اور ہندوستانیوں نے انہیں براہِ راست پاکستان بھیجنے کا یقین دلایا تھا۔ ان میں لالکرتی کا ہمارے بچپن کا دوست عبدالمجید بھی شامل تھا۔ بہت سے لوگ بے سروسامان کھلے آسمان کے نیچے بیوی بچوں سمیت پڑے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں چاروں طرف پردے کے لیے چادریں تنی گئیں تھیں۔ کچھ غیرت مند بھائی اور باپ شرم کو بالائے طاق رکھ کر ہمارے جوانوں سے اپنی بہنوں، بیٹیوں سے شادی کرنے کی التجا کر رہے تھے تاکہ وہ باعزت طور پر پاکستان جا سکیں۔ یہاں انہیں یقین تھا کہ بنگالی انتقام کی ہوس میں شاید انہیں قتل کر دیں یا بے حرمتی کریں۔ کئی جوانوں نے اسی جذبہ کے تحت ان سے شادی کر لی اور کئی رنگیلوں

نے پاکستان میں بیویوں کی موجودگی کے باوجوداوراس خیال سے شادیاں رچالیں کہ کیا مذائقہ ہے جو کچھ دن اچھے گزر جائیں ! کمانڈو کے ایک این سی او نے جو ویسٹ پاکستان میں تین بیویوں کے گیڑ میں تھا یہاں بھی شادی رچالی۔

شکستہ مانس بریلی کو

ہمیں بتایا گیا کہ جنوری کی چار پانچ کی صبح ہمارا یہاں سے بریلی کیمپ 58 کی طرف کوچ ہے۔ہمیں سوائے ایک سلیپنگ سوٹ اوردوجوڑے وردی اوربستر کے کسی چیز کو ساتھ لے جانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ میں نے اورعبدالرحمان نے تکیوں اورسلیپنگ بیگ میں کپڑوں کا ایک ایک جوڑا سی لیا اورباقی کپڑے اور سامان بانٹ دیا۔صبح منہ اندھیرے سب کو فالن کرکے ایک ایک چیز کی تلاشی لی گئی۔ ہندوستانی سپاہیوں کے وارے نیارے ہو گئے۔ بہت سی چیزیں اپنی جیبوں میں ٹھونس رہے تھے۔ کچھ افسروں کے اٹیچی کیس اورصندوق ایک طرف پڑے ہوئے دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ان کو اتنا سامان ساتھ لے جانے کی اجازت کیسے دی گئی ہے۔شاید اس اجازت کی اطلاع ہم تک جو جوانوں کے ساتھ رہ رہے تھےنہیں پہنچ پائی تھی۔

ڈھاکہ اسٹیشن پر ہندوستانی بٹالین کا کمانڈنگ افسراور ایسٹرن کمانڈ سگنلز کے بریگیڈیر عارف رضا ہمیں الوداع کہنے آئے۔ ہمارے افسروں کو ان کے ٹرانسسٹروں اورباقی قیمتی اشیاء کی رسیدیں دی گئیں جبکہ جوانوں کو کوئی رسید نہیں

دی گئی۔ ویسے سب کو یقین تھا کہ یہ محض دکھاوا ہے۔ گاڑی تین چار اسٹیشنوں سے گزر کر نرائن گنج پہنچی ۔ راستے میں بنگالی گالیاں دیتے اور بیہودہ نعرے لگاتے رہے۔ کئی ایک نے تو ہمیں پتھر بھی مارے۔ شاید ہماری ذلت کی یہی موزوں ابتدا تھی۔ نرائن گنج کے جیٹی پر تو ایک ہجوم اکٹھا ہوگیا۔ ہندوستانیوں نے انہیں بمشکل قابو میں رکھا۔ وہ شالا افسر ہے اس لیے اکڑ اکڑ کر چلتا ہے! یہ فقرہ مجھ پر کسا گیا۔ شاید ٹھیک ہی کہہ رہا تھا کہ مجھے اکڑ اکڑ کر نہیں چلنا چاہیے لیکن؟ لیکن وغیرہ تک کی سوچ اپنے دماغوں میں نہیں آ رہی تھی۔ پابازنجیر ہونے کے ساتھ ساتھ شاید دماغ بھی ماؤف ہو چکا تھا۔ جیٹی پر لگے ایک جہاز میں ہم سب کو ٹھونسا گیا۔ ہمارے ساتھ 7 سگنل بٹالین کے افسر اور سپاہی بھی تھے اور جہاز پر تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ ہماری نگرانی کے لیئے ہمارے ساتھ گورکھا رجمنٹ کی ایک کمپنی رکھی گئی تھی۔ افسر فرسٹ کلاس میں ہونے کے باوجود دو کمروں میں بیس کے قریب ٹھسے ہوئے تھے جبکہ گنجائش صرف چار کی تھی اس لیئے ہم نے باہر عرشے پر بستر بچھا لیے۔ کھانا اپنے جوانوں نے ہی پکایا۔ جو کچھ افسروں کے حصے میں آیا اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ جوانوں کو کیا ملا ہوگا۔

کچھ دور اندیش افسروں کے پاس کھانے پینے کا کافی سامان موجود تھا۔ نہ جانے کن سوچوں میں گم جوان ہم سے دانستہ اپنی نظریں نہیں ملا رہے تھے۔ شاید ہندوستانیوں کے تحقیر آمیز رویے نے ان کی ساری خوش فہمیاں دور کر دی تھیں۔ اب ہندوستانیوں کے لہجے میں ترشی اور سختی آ گئی تھی۔ ڈھاکہ بہت پیچھے رہ گیا تھا جہاں انہیں کچھ خطرہ تھا اور پھر وہ ریڈ کراس کی موجودگی میں بُرا تاثر بھی نہیں دینا چاہتے تھے ورنہ ان کے ارادے کافی خطرناک لگ رہے تھے۔ ہمارے جوانوں کی اپنے افسروں کی تعظیم اب دور کی شے معلوم ہوتی تھی۔ برے حالات، خوشی غم میں

ساتھ دینے کا جذبہ تو دنیا کی ہر فوج میں ہر وقت اور ہر حال میں موجود رہتا ہے تو پھر ہمارے سپاہیوں کو کیا ہو گیا تھا۔ شاید چونتیس سال کی آزادی کے باوجود جوانوں اور افسروں کے درمیان ابھی تک وہ وسیع خلیج حائل تھی جو انگریز اپنے خاص مقاصد کیلئے قائم کیئے ہوئے تھا۔

میگھنا اور براھم پُترا کے سنگم میں سے جب جہاز گذر رہا تھا تو ایسا لگا جیسے ہم ایک وسیع سمندر میں سفر کر رہے ہوں۔ 1969 کا وہ وقت یاد آ رہا تھا جب میں اسٹیمر میں بیٹھ کر براہم پترا عبور کر رہا تھا۔ کتنا مسحور کن سماں تھا۔ جہاز کے عرشے پر ڈیک چیر پر بیٹھے پانی کی ہلکی پھوار دریا میں ڈوبتے سورج کا عکس، ساتھ سے گزرتے کسی نوکے میں بیٹھے ملاح کا اُونچی آواز میں گانا اور گھر کی جانب لوٹتے ہوئے تیز تیز چپو چلانا اور دور کنارے پر اُفق کی سرخی کے سامنے ناریل اور سپاری کے درختوں کی قطاریں، لیکن اب تو ان چیزوں کے ہوتے ہوئے بھی ایک ہولناک وحشت تھی جو سارے ماحول پر چھائی ہوئی تھی۔

جہاز فرید پور کے پاس کسی گمنام سی جیٹی کے ساتھ لگا دیا گیا۔ خدا خدا کر کے پاؤں کو حرکت کرنے کی مہلت ملی۔ یہاں ہم سے بیلٹیں اور ٹوپیاں لے لی گئیں حالانکہ یہ جینوا کنونشن کی خلاف ورزی تھی۔ لیکن وہ تو صرف مہذب قوموں کے لیے ہے۔ یہاں پر متعین ہندوستانی سپاہیوں کا رویہ اور بھی دل جلانے والا تھا۔ افسروں کا سامان ٹرکوں پر لاد دیا گیا اور جوانوں اور جے سی او صاحبان کا سامان انہیں خود اٹھانے کو کہا گیا۔ فرید پور ریلوے اسٹیشن دو، تین میل کے فاصلے پر تھا۔ کچھ جے۔سی۔اوز عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے اپنا سامان اٹھائے ہانپ رہے تھے لیکن ہندوستانی انہیں اور تیز چلنے کی تلقین کر رہے تھے۔ ہمارے آگے آگے یونٹ کے سی۔او کرنل کیانی کو جب دو ہندوستانی سپاہیوں نے ناشائستہ الفاظ میں تیز چلنے کو کہا

تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے انہیں ڈانٹتے ہوئے کہا کہ اگر ہم سے بات کرنی ہے تو اپنے افسروں سے کہو۔ وہ کچھ بڑ بڑا کر پیچھے ہٹ گئے۔

راستے میں حسبِ معمول فقرے کسے جاتے رہے لیکن ڈھاکہ کے مقابلے میں بہت کم۔ یہاں لوگوں میں تجسس زیادہ تھا۔ انہیں شاید یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی لوگ ہیں جن کے بوٹوں کی چاپ سن کر وہ گھروں کے اندر دبک جایا کرتے تھے اور آج وہ کس کسمپرسی کے عالم میں ہیں۔ ایک بوڑھے باریش بنگالی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ پاس سے گزرے تو اس نے آہستہ سے خدا حافظ کہا۔ آنکھیں بے اختیار چھلک گئیں۔ فرید پور سے گزرے تو لڑکیاں گھروں سے نکل نکل کر ہندوستانیوں کو مبارک دے رہی تھیں۔ کچھ تو ہنس ہنس کر ان سے باتیں بھی کر رہی تھیں۔ مجھ سے یہ دیکھا نہیں گیا۔ شہر کے بیچ میں کئی اور لوگوں نے اسلامُ علیکم، خدا حافظ کہا۔ اسٹیشن پہنچتے پہنچتے رات ہوگئی۔ گاڑی میں ہم سے پہلے ہی کافی لوگوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ٹھونسا جا چکا تھا۔ ہمارے جوانوں کو فالن کر کے تلاشی لی گئی۔ تمام پیسے (ہندوستانی اور پاکستانی) جمع کر کے ایک کِٹ بیگ میں ڈال دیے گئے۔ شاید چوالیس ہزار روپے جمع ہوئے تھے۔ جوانوں نے بچے کھچے سِکے پھینک دیئے۔ ہندوستانی سپاھی لالٹینوں کی روشنی میں انہیں تلاش کرتے رہے۔ ہمارے پیچھے کھڑے سپاہیوں میں ہل جل دیکھ کر جو میں پیچھے گیا تو ایک ہندوستانی سپاھی کو ان سے گھڑیاں ہتھیانے کی کوشش میں مصروف پایا۔ اُسے ڈانٹا اور اپنے سپاہیوں سے کہا کہ تم لوگ کیوں بھیڑ بکریوں کی طرح جو کچھ وہ مانگتے ہیں دے رہے ہو۔

زادِ سفر کے طور پر پکا پکایا کھانا دیا گیا جو کچے پکے چاولوں، دال اور جلی ہوئی روٹیوں پر مشتمل تھا۔ ایک دیگچہ بھروا کر ہم نے بھی رکھ لیا اور روٹیاں کٹ بیگ میں ڈال دیں۔ جوان ایک ایک کمپارٹمنٹ میں چالیس چالیس کے حساب سے

ٹھونسے گئے تھے۔ہمیں سیکنڈ اور فرسٹ کلاس میں رکھا گیا لیکن دروازے مقفل کر دیئے گئے ۔ چونکہ کھڑکیوں کے اُوپر سلاخیں تھیں اسلیئے انہیں کھلا رکھا گیا۔ٹرین کا کمانڈر ایک لمبا تڑنگا بنگالی میجر شرما تھا۔ بقول اسکے اِس کے بھائی کو پاکستانی فوجیوں نے کُھلنا میں نہایت اذیت دے کر مارا تھا۔اس لیے اس کا رویہ ہمارے ساتھ بہت ناگوار تھا۔ میں نوجوان افسروں کے کمپارٹمنٹ میں تھا جب کہ دوسرے کمپارٹمنٹ میں کرنل اور میجر تھے۔ میں نے راستے میں سلاخیں ٹیڑھی کرنے کی بے سود کوشش کی ۔ افسر میرے بھاگنے کے حق میں پر جوش نہیں تھے لیکن بظاہر میرا ساتھ دینے کے لیئے تیار تھے۔ رات کو اُٹھ کر سیفٹی کے ہینڈل کے چپٹے سرے سے دروازے کا قفل کھولنے کی کوشش کی تو عبدالرحمان کی آنکھ کھل گئی ۔ وہ اُوپر برتھ پر سویا ہوا تھا۔اسے شک پڑ گیا کہ میں بھاگنے کی کوشش میں ہوں ۔ کہنے لگا کہ میں نے بھی تمہارے ساتھ جانا ہے۔سوچا کہ اگر ٹرین سے چھلانگ لگاتے وقت اُسے کچھ ہو گیا تو گھر والوں کو کیا جواب دوں گا۔اس بات پر ندامت ہوئی کہ وہ سوچتا ہو گا کہ مجھے اکیلا چھوڑ کر جا رہا تھا۔

مغل سرائے کے بہت بڑے جنکشن پر ٹرین کچھ دیر کے لیے رکی تو بہت سے لوگ ہمارے کمپارٹمنٹ کے پاس ہمیں دیکھنے آئے ۔ ہم میں سے کسی نے پڑھنے کیلئے ایک جوان لڑکے سے اخبار مانگی جو اس نے بڑے شوق سے آگے بڑھا دی ۔ یکا یک اس کے چاروں طرف لوگوں کا ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ مُکہ ، جوتا ، تھپڑ جو کسی کو سوجھا اُسکے بدن پر آزمایا گیا۔ ہندوستانی عوام میں ہمارے خلاف شدید نفرت دیکھنے میں آئی ۔کلکتہ سے شمال کی طرف کسی اسٹیشن پر گاڑی رکی تو ایک ہندوستانی بنگالی نے جو اپنی بیوی کے ساتھ پلیٹ فارم پر کھڑا تھا کھڑکی کے اندر جھانکا اور پاکستانی فوجیوں کو پہچان کر مخصوص نعرہ لگایا۔ (شالا مرغی لے گا ،لڑکی لے گا) ۔کسی منچلے نے اُسکی

بیوی کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ وہ لے گا۔ اُسے کچھ سُجھائی نہیں دے رہا تھا کہ کیا کرے۔ اُسکی بیوی شرم سے زمین میں گڑھی جا رہی تھی۔ہٹلر کی ساتھی گوئبل کا پروپیگنڈا ہندوستانی پروپیگنڈے کے سامنے ہیچ لگا۔ شاید ہمارے پرانے کرم فرما انگریز کا بھی اس میں غیبی ہاتھ ہولیکن .شہنشاہ وقت یحییٰ خان اور محمد شاہ نیازی نے بھی تو اسے تقویت دینے میں کافی مدد دی ۔

میجر شرما ساتھ والے کمپارٹمنٹ میں تھا۔ایک اسٹیشن پر گاڑی رکی تو کھڑکی کے ساتھ بیٹھے چند افسروں سے باتیں کرنے کے دوران اس نے کافی ڈھینگیں ماریں۔ کہنے لگا کہ اب تو تم پر عیاں ہوگیا ہے نا کہ ایک ہندوستانی سپاہی ایک پاکستانی سپاہی سے بدرجہا بہتر ہے۔ میں کمپارٹمنٹ کے دوسرے گوشے میں بیٹھا ان کی باتوں میں حصہ نہیں لے رہا تھا۔نوجوان افسر اُسے کہہ رہے تھے کہ یہ تو حالات کا تقاضا تھا ورنہ تمہیں بھی پتہ ہے کہ کون بہتر ہے۔اس کے جواب میں اس نے کہا کہ اگر یہ بات ہے تو مجھ سے باکسنگ کر کے دیکھ لو۔ اس نے بتایا کہ وہ آرمی باکسنگ چمپئین رہ چکا ہے اور اب نیشنل کوچ ہے۔ ویسے جسامت اور چال ڈھال سے واقعی باکسر لگتا تھا۔ عام بنگالیوں کے برعکس اس کی رنگت بھی ہلکی گندمی تھی۔ گو پی ایم اے کی Novices Boxing باکسنگ (ایس۔ایس۔ جی میں باکسنگ نہیں سکھائی جاتی تھی) کا مقصد کیڈٹوں کا خون گرم رکھنے کا بہانہ اور ان کی ہمت اور جرأت کا جانچنا ہوتا تھا لیکن مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے اُسے کہا کہ اچھا آ جاؤ۔ مجھے غور سے دیکھا اور کچھ سوچ کر کہا کہ اگلے اسٹیشن پر۔ اگلے اسٹیشن پر کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر کہا کہ ہم سلاخوں کے بیچ میں سے ہی لڑلیں گے۔ پھر کہا کہ تم مجھے خطرناک آدمی لگتے ہو اس لیے تمہیں ہتھکڑی لگانی پڑے گی۔ پھر پینترا بدل کر کہنے لگا کہ میں اب بوڑھا ہوگیا ہوں۔ پوچھنے پر عمر چونتیس سال بتائی۔ بہرحال اس کا رویہ اسکے بعد کافی بہتر

ہو گیا۔ اگلے اسٹیشن پر ہم سے بلیڈوں کا ایک پیکٹ مانگا اور اس کے عوض کیلوں کا ایک گچھا بھیج دیا۔

ایک اسٹیشن پر گاڑی روک کر خلافِ معمول ہمارے جوانوں کے لیے کھانا پکوانے کے لیے ہمارے لانگری اور کچھ جوانوں کو باہر نکالا گیا۔ دو افسروں کو بھی کام کی نگرانی کے لیے باہر نکلنے کی اجازت دی گئی ۔ ہمارے کمپارٹمنٹ سے عبدالرحمان باہر جانے لگا تو میں نے اُسے کہا کہ جونہی موقع ملے اسٹیشن پر کھڑے لوگوں کے ہجوم میں گھس کر فرار ہو جانا۔ اس کے ساتھ دو گورکھے سپاہی تھے۔ آدھ گھنٹے کھلی فضا میں رہنے کے باوجود اسے کوئی موقع ہاتھ نہ آیا یا پھر اس کا مجھے چھوڑ کر جانے کو دل نہ چاہا۔

تین چار دنوں کے مسلسل سفر کے بعد گاڑی بریلی اسٹیشن پر آ کر رک گئی ۔ گنتی کے وقت ہندوستانیوں کو ایک ڈبے سے ایک آدمی کے فرار کا پتہ چلا۔ 3 سگنل بٹالین کا ایک لانس نائیک لکھنو کے قریب جہاں گاڑی رات کے آخری حصے میں رکی تو لیٹرین میں لگے کموڈ کو اکھاڑ کر فرار ہو گیا تھا۔ اسکے کمپارٹمنٹ کے باقی جوانوں کو گورکھے ٹیلیفون کے تاروں سے بنے ہوئے ہنٹروں سے مار رہے تھے۔ میں نے پاس بیٹھے ہوئے افسروں سے کہا کہ یہ آپ کی یونٹ کے جوان ہیں آپ احتجاج کیوں نہیں کرتے۔ میجر شرما اور انڈین جے سی او وہاں موجود نہیں تھے۔ میجر سلام اختر نے اُٹھ کر سی او CO سے کہا کہ سر آپ ہندوستانیوں سے احتجاج کریں۔ لیکن سی او نے کہا کہ ان کو یہی سزا ملنی چاہیے کیونکہ میں نے انہیں فرار ہونیکی کسی کوشش سے منع کیا تھا۔ لیکن غیرت کی وہ آگ جو مجھ میں سُلگ رہی تھی اس مردِ مجاہد میں بھڑک اُٹھی ۔ میجر سلام ہندوستانی سپاہیوں کو ایک طرف دھکیلتا ہوا مارنے والے گورکھوں کی طرف بڑھا اور ان سے چیختے ہوئے پوچھا کہ انہیں کیوں مار رہے ہو؟ اپنے

افسروں کو بلاؤ۔ اتنی دیر میں میجر شرما کہیں سے نمودار ہوا اور میجر سلام کو اپنے کمپارٹمنٹ میں بلا کر چائے اور بسکٹ پیش کیے۔ میجر سلام نے اس کی پیش کش اس شرط پر ٹھکرادی کہ پہلے مارنا رکواؤ اس کے بعد چائے پیوں گا۔اس کے فورا بعد گورکھوں نے اپنے ہاتھ روکے اور میجر سلام اختر نے شرما کے ساتھ بیٹھ کر اس کے کمپارٹمنٹ میں چائے پی۔ میجر سلام کے سامنے نظریں عقیدت سے جھک گئیں۔ گو وہ میری یونٹ کے جوان نہ سہی پاکستانی تو تھے۔ میں نے پہل کیوں نہ کی؟ تمام نوجوان افسر جنہیں اس سے پہلے کے حال ہی میں امریکہ پلٹ اپنے سیکنڈ ان کمانڈ میجر سلام اختر سے متعدد شکایات تھیں اب ان کے مداح بن گئے تھے۔

برقعے میں ملبوس کچھ عورتیں اور کچھ مرد کھڑے کرب کے عالم میں یہ واقعہ دیکھ رہے تھے۔ بے چارے ہندوستانی مسلمانوں کو ہم ساتھ بے شمار امیدیں وابستہ تھیں لیکن اب اپنے اُوپر ڈھائے جانے والے ظلم وہ کس طرح برداشت کریں گے۔ایک مضبوط پاکستان ہی ان کی عزت و ناموس کا ضامن تھا۔ لاٹھیوں سے ہانکے جانے والے اس گلے سے ان کی کیا توقعات ہوسکتی تھیں؟

کیمپ 58 میں چند دن

ہمیں بند ٹرکوں میں ڈال کر بریلی کے جنگی قیدیوں کے کیمپوں میں لایا گیا۔ تنگ کمروں اور چاروں طرف کانٹے دار تاروں کو دیکھ کر ذہن کو خفیف سا جھٹکا لگا۔ بیچارہ ذہن ہی تو تھا اور پھر یہ کوئی پہلا جھٹکا تو نہیں تھا۔ یہ تو غنیمت تھی کہ نیم مردہ

ذہنوں میں ابھی تک کچھ کچھ احساس باقی تھا۔ایک ایک کمرے میں پانچ پانچ افسر ٹھہرائے گئے ۔پہلے سے موجود کچھ افسروں کو پہچان کران سے حال احوال پوچھا۔کھانا لایا گیا تو بالٹی میں اُبلی ہوئی گاجروں اور پانی میں ناچاقی کی صورت دیکھنے کو ملی ۔اکڑی اور جلی چپاتیوں کے ساتھ پیٹ نے اس آمیزش کو بھی خوش آمدید کہا کیونکہ ٹرین میں کِٹ بورے سے پیٹ بھرنے کے لیئے خشک اور جلی ہوئی روٹیاں نکلنی شروع ہو چکی تھیں ۔ دال اور چاول خراب ہونے کی وجہ سے پھینک دیئے گئے تھے ۔ ذخیرہ اندوز افسر دوسرے ڈبے میں تھے اس لئے ہم ان کی چیزوں سے استفادہ نہ کرسکے تھے۔گو بیرک اور پھر پورے کمپاؤنڈ کے گرداگرد تاریں تھیں لیکن یہاں سے نکلنا نسبتاً آسان لگ رہا تھا لیکن اگلے ہی دن ہم سب کو ایک دوسرے کیمپ میں منتقل کردیا گیا۔ پہلا کیمپ P.O.W (جنگی قیدی) ہسپتال کے طور پر استعمال ہو رہا تھا اس لیے وہاں حفاظتی اقدام بھی اتنے زیادہ نہ تھے کہ تھوڑی تگ ودو کے بعد نکلا نہ جا سکے ۔ نیا کیمپ؟ ایسا لگتا تھا جیسے مختلف بڑے بڑے پنجروں کو اکٹھا کر دیا گیا ہو۔ چاروں طرف اُونچے اُونچے سنتری ٹاوراور تاروں کی تین تین قطاریں ، سرچ لائٹیں اور بیچ میں سنتری اور کتوں کی گشت ہر وقت جاری رہتی تھی ۔

ہم فرار کے بہترین مواقع گنوا کر اپنے آپ کو ایسے حالات میں لے آئے تھے کہ اسکے تمام راستے تقریباً مسدود ہو چکے تھے ۔لیکن شاباش ہے ان سپوتوں خاص کر میجر حضور حسنین ستارہ جرأت پر جنہوں نے ہمارے جانے کے بعد اس کیمپ سے بھی فرار کی کئی ناکام مگر دلیرانہ کوششیں کیں ۔ میجر حضور حسنین ایس ایس جی کے ان لوگوں میں شامل تھے جنہیں 1965 کی جنگ میں بغیر کسی پیشتر پلاننگ کے چھتریوں کے ذریعے انڈیا کے پنجاب میں واقع ہوائی اڈوں کے نزدیک ان کو تباہ کرنے کے لئے اسطرح گرا گیا تھا کہ ان کے بقول وہ آپس میں کہیں بھی اکٹھے نہیں ہو سکے

تھے۔کوئی کاروائی کیئے بغیر میجر حضور حسنین اور دو تین اوروں کے جو واپس پہنچنے میں کامیاب ہوئے باقی سب پکڑے گئے۔اس طرح ہماری فوج کا ایک اہم جز و لڑائی میں کوئی قابل ذکر کردار ادا نہ کرسکا تھا۔

ساتھ والا کیمپ ہمارے کیمپ کے مقابلے میں بہت وسیع تھا۔اس کے ایک سرے پر کھیت ہونے کی وجہ سے اس میں رکھے گئے افسروں کی پوزیشن قابلِ رشک لگ رہی تھی۔ہم پانچ افسروں نے اپنا سامان ایک کمرے میں رکھا لیکن ہمارے باہر نکلتے ہی دوبارہ بلائے گئے ایک عمر رسیدہ میجر ڈاکٹر نے اس پر قبضہ کرلیا۔اس کا ایک بیٹا بھی کسی کیمپ میں قید تھا۔ ہر وقت زیب تن کیئے ہوئے گریٹ کوٹ کی وجہ سے منفرد نظر آتا تھا۔مُلا نصیر الدین کی دیگ کی طرح صبح سویرے سورج کی پہلی کرن کے انتظار میں کمرے کے باہر بیٹھ جاتا۔ہاتھ میں چائے کا خالی گلاس بھی اس چیز کی غمازی کرتا تھا کہ اُسے تپش کی اشد ضرورت ہے۔جنوری کے مہینے میں بریلی میں بلا کی سردی پڑتی ہے۔چائے اور کھانا ہمارے جوان دوسرے کیمپ کے اندر واقع لنگر سے لاکر تقسیم کرتے تھے۔ کھانا برابر برابر ہر کمرے میں بانٹنے کی ڈیوٹی ہمارے ایک جونیئر افسر کے سپرد تھی۔بوڑھے ڈاکٹر نے راستے میں گھات لگائی ہوئی ہوتی تھی۔ چائے کا گلاس بھروا کر چند ساعتوں میں غٹا غٹ پی جاتا تو بانٹنے والے ترس کھا کر دوسری بار آگے بڑھائے ہوئے گلاس کو بھر دیتے تھے۔کچھ لوگوں نے تالے کے باوجود اسکے صندوق سے کافی کچھ اُڑا لیا تھا۔میں نے اپنے اور عبدالرحمان کے 50، 50 روپے فالس سیلنگ کے تختے اُکھیڑ کر انکے نیچے چھپا دیئے۔ ٹاٹ کی فالس سیلنگ میں ایک پھٹی ہوئی جگہ سے اپنے سویلین کپڑے اندر پھینک کر ٹاٹ میں پیوند لگا دیا۔کیمپ کی زندگی سے لوگ آہستہ آہستہ مانوس ہو رہے تھے۔ بیرکوں کے شروع میں تھوڑی سی کھلی جگہ میں والی بال کا نیٹ لگا یا گیا تھا۔

کچھ لوگ مختلف ٹولیوں میں کمبل بچھائے تاش کھیلتے رہتے تھے۔ آہستہ آہستہ نمازیوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا گیا لیکن میں اس وقت تک گنہگاروں کی صف میں ہی تھا۔کیمپ کمانڈنٹ میجر آلوالیہ بارہ بجے والے سکھوں کی مکمل تصویر تھی۔ انگریزی میں پیدل ہونے کے باوجود وہ کبھی کبھی ڈُڑکی لگانے کی کوشش کرتا تھا۔کرنل افضل نے بجلی کے بارے میں شکایت کی تو کہنے لگا I think fuse taken place somewhere ایک دوسری شکایت کے جواب میں جو جست لگائی تو فرماتے ہیں Il told commandant he shut me۔ایک دن اسکی چال میں واضع اکڑ نظر آئی۔ تمام کیمپ کو تین کھلی قطاروں میں فالن کر کے جو لیکچر دینے کی کوشش کی تو اس کا اثر کانوں سے زیادہ ہمارے پیٹوں پر پڑا۔ بے چارے کو ہم سے ریڈ کراس کے چند جعلی فارم بھروانے کے لیے کہا گیا تھا۔ زیادہ سوالات ہماری فوج کی کارکردگی اور تنظیم سے متعلق تھے۔ میں نے اپنا نام نمبر اور رینک بھر کر جو فارم واپس کیے تو وہ طیش میں آ گیا۔ میرے اصرار پر کہ اس کے علاوہ میں کچھ نہیں لکھوں گا کہنے لگا (اُسی بارہ بجے والے انداز میں) اچھا ہر سوال کے آگے لکھ دو کہ میں کچھ نہیں لکھنا چاہتا۔

شاید ہمارے فرار کے مواقع کم کرنے کی نیت سے ایک ہی یونٹ کے افسروں کو مختلف بیرکوں میں بانٹنے کے لیے باہر کھڑا کیا گیا تو ان کا ارادہ بھانپتے ہوئے جب 3 سگنل کے آٹھ افسروں کو دو گروپوں میں کھڑا ہونے کے لیے کہا گیا تو میں عبدالرحمان کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ میں، عبدالرحمان، لیفٹیننٹ مشتاق اور کیپٹن پرویز کرنیلوں والی بیرک میں شِفٹ کر دیئے گئے۔ اس بیرک کو وائیٹ ہاؤس white house کا نام دیا گیا تھا۔ ایک کمرے میں ساتھ ساتھ بہت سی چارپائیاں لگی ہوئی تھیں جن کے درمیان بمشکل چھ چھ انچ جگہ خالی تھی۔ جگہ اور بستر

کی کمی کی وجہ سے مجھے اور عبدالرحمان کو ایک ہی چارپائی پر سونا پڑا۔ اس کے باوجود فروری کی سردی اتنی شدید تھی کہ صبح تقریباً ایک بجے آنکھ کھل جاتی اور پھر پہروں جاگنا پڑتا۔ مجھے اب بھی یہ سوچ کر جھرجھری محسوس ہوتی ہے کہ ہم اس سخت سردی میں کھلے آسمان کے نیچے نلکے کے ٹھنڈے پانی سے کیونکر غسل کر لیتے تھے۔

کرنل افضل کی انفرادی توجہ کی وجہ سے یہاں نفسانفسی کا وہ عالم نہیں تھا جو باقی بیرکوں میں دیکھنے میں آتا تھا۔ صبح سویرے کیپٹن آصف اور میجر درانی کی زیرنگرانی ایک بالٹی میں اَمرشن راڈ لگا کر چائے بنتی اور بقدرِ حصہ سب اپنی چائے پی کر پی ٹی کے لیے باہر میدان میں نکل جاتے۔ کرنیل چند چھوٹے کمروں میں تین تین چار چار کے گروپوں میں رہ رہے تھے۔ آصف کیتلی میں چائے ڈالے انہیں انکے بستروں میں ہی دے آتا تھا۔ نہ جانے میرے ساتھ وہ کیوں رعایت برتتا اور میرے منع کرنے کے باوجود مجھے بھی چائے بستر میں ہی دے جاتا تھا۔ بڑی بڑی مونچھوں کے ساتھ یہ چھوٹی سی چیز ہر جگہ موجود نظر آتی۔ ہم لوگ چونکہ ان کے روزمرہ کے معمولات routine سے ابھی آگاہ نہیں تھے اسلیئے صبح کی پی ٹی کے لیے نہیں اٹھتے تھے۔ کرنل افضل کو پتہ لگا تو انہیں یہ چیز سخت ناگوار گزری۔ دوسرے تیسرے دن خود ہی کچھ محسوس کر کے ہم بھی ان میں شامل ہو گئے۔ کبھی کبھار میں انہیں پیراپیٹی Para PT کروا دیتا تھا۔ باقی بیرکوں اور اس بیرک میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ کھانے کی بانٹ بہت منظّم طریقے سے ہوتی اور ہر ایک کو اپنی اپنی چارپائی کے پاس ہی بالٹی میں سے اس کے حصے کا سالن اور چپاتیاں مل جاتیں تھیں۔ ہمیں یہاں آنے پر ہماری خستہ حالی کے مدنظر چینی کی پلیٹیں دی گئیں۔ ہم چاروں ایک ہی بڑی ڈش میں سالن ڈلوا کر چارپائی پر بیٹھ کر کھانا کھاتے۔

ایک دن ہندوستانیوں نے یہ مژدہ سنایا کہ ہمیں پچاس، پچاس روپے

کو پنوں کی صورت میں الاؤنس دیا جائیگا ۔ ان کے مطابق یہاں دیئے گئے پیسے پاکستان میں ہماری تنخواہ سے منہا کر لئیے جائینگے ۔ یہ شاید ریڈ کراس کی مداخلت سے ممکن ہوا تھا ۔ یار لوگوں نے کینٹین سے منگوانے کے لیے چیزوں کی لمبی لمبی لسٹیں دے ڈالیں ۔ ان میں کاجو ، مہارانی صابن ، اِنڈیا کنگ سگریٹ وغیرہ سرِ فہرست تھے ۔ اچار اور جیم آ جانے کی وجہ سے کھانے کا ذائقہ بدرجہا بہتر ہو گیا تھا ۔ ویسے بھی سالن میں اب کبھی کبار گوشت کی بوٹیاں نظر آتی تھیں ۔ ہمیں اعتراض تھا کہ گوشت صیح طور پر ذبح نہیں ہوتا اس لیے ہندوستانیوں سے کہہ دیا گیا کہ ہم گوشت نہیں کھائیں گے ۔ اس پر گروپ کمانڈر نے کیمپ میں آ کر ہمیں یقین دلانے کی کوشش کی کہ گوشت حلال ہی ہے کیوں کہ انکی اپنی فوج میں بھی تو مسلمان ہیں ۔ اسنے ہمیں یہ پیشکش بھی کی کہ اگر ہمیں اس کی بات کا یقین نہیں تو ایک افسر ہر روز آنکھوں پر پٹی باندھ کر ذبح خانہ میں جا سکتا ہے ۔ لیکن ہمارے یہ کہنے پر کہ ہمیں آپ پر یقین ہے فرار کی اُمید کی جو ہلکی سی کرن نمودار ہوئی تھی یکدم بجھ گئی ۔ ہماری بیرک سے فرار کافی مشکل تھا ۔ سڑک کے عین سامنے ہونے کی وجہ سے یہ کیمپ ہر وقت سنتریوں اور راہ چلتے لوگوں کی توجہ کا مرکز تھا ۔

کرنل افضل 6 یل ایل اے کے کمانڈنگ افسر تھے ۔ یہ وہی 6 ۔ ایل ۔ ایل ۔ اے (6 LAA) تھی جس کی طیارہ شکن توپوں نے ڈھاکہ میں دشمن کے جہازوں کے دانت کھٹے کیے تھے ۔ اپنی جراَت اور بیباکی کی وجہ سے باقی کرنیلوں سے وہ منفرد نظر آتے تھے ۔ تقریباً ان سب سے جونیئر تھے لیکن پھر بھی انہیں کیمپ سینئر چن لیا گیا تھا ۔ سینئر کرنیل انھی کے زیر کمان رول کال کے لیے فالن ہوتے تھے ۔ کرنل افضل اکثر ہمارے درمیان بیٹھ کر خوش گپیوں میں مصروف رہتے تھے ۔ میں اپنی کم گوئی اور محفلوں سے عمومی احتراز کی وجہ سے ان کی باتوں میں کوئی حصہ نہیں لیتا

تھا لیکن اپنی چارپائی پر بیٹھا یا لیٹا ان کی باتوں سے محظوظ ہوتا رہتا تھا۔ کچھ کرنیل قید کے دوران ایک عجیب مخلوق بن کر رہ گئے تھے۔ جونیئر افسروں کی فلاح و بہبود کے علاوہ ان میں ڈسپلن قائم رکھنے کی ذمہ داری یکسر فراموش کر بیٹھے تھے۔ اپنے اپنے نان نفقہ کی فکر میں ایک الگ ہی دنیا بسا رکھی تھی۔ بیوی بچوں کا اکثر ذکر چھیڑتے رہتے تھے۔ ایک عجیب مایوسی اور لاچاری کی کیفیت میں پڑے رہتے اور فرار یا ہندوستانیوں سے اپنا حق مانگنے کے سخت خلاف تھے۔

بات کرنل افضل کی ہو رہی تھی۔ ان کے علاوہ لڑائی اور قید کے دنوں میں مجھے برگیڈیر سعد اللہ اور کیپٹن شجاعت کی شخصیتوں نے بے حد متاثر کیا۔ شروع شروع کے دنوں میں جب غیر یقینی کا عالم تھا بہت کم لوگوں نے ہندوستانیوں کے ساتھ برتاؤ کے دوران باوقار رویہ اپنایا۔ مجھے یاد ہے کہ جب کیمپ میں ایک جرنیل کے آنے پر سب لوگوں سے کہا گیا کہ اپنی نظریں نیچی رکھیں تو کرنل افضل نے انکار کر دیا تھا۔ اور ساتھ ہی اپنے تمام افسروں کو بھی منع کر دیا تھا۔ میری بدقسمتی تھی کہ میں ان کے زیادہ قریب نہ ہو سکا تھا۔ ویسے میرے بارے میں کچھ لوگوں سے کہا کہ اس آدمی کی آنکھوں میں ایک عجیب سا جذبہ ہے۔

وائٹ ہاؤس اپنے محل وقوع کے اعتبار سے فرار کے لیے غیر موزوں تھا اس لیے ہم نے یہ کہہ کر کہ یہ بہت گنجان ہے دو کمروں والی ایک چھوٹی سی بیرک جو ایسی کوششوں کے لیے نہایت موزوں تھی منتقل ہونے کی اجازت لے لی۔ یہ لیٹرینوں کی طرف کیمپ کے ایک کونے میں واقع تھی۔ کیمپ میں دس، بیس دن گزارنے کے باوجود بہت کم لوگوں کو اس کی موجودگی کا علم تھا۔ چھ بجے کے بعد ہر بیرک کے گرداگرد تاروں کی باڑھ میں لگے دروازے کو گنتی کے بعد مقفل کر دیا جاتا تھا۔ رفع حاجت کے لیے ایک چھوٹا سا گڑھا بنایا گیا تھا جس کے گرداگرد ٹاٹ کا

پردہ تھا۔لیکن اس بیرک میں ایسا کوئی انتظام نہیں تھا۔ ہمارا ارادہ تھا کہ اسی طرح کی ایمرجنسی لیٹرین سے سرنگ کا آغاز مناسب رہے گا۔لیکن ہمارے کئی دفعہ کہنے کے باوجود ہمارے وہاں سے جانے تک یہ لیٹرین نہ بن سکی۔

قید کی پہلی عید بھی اسی کیمپ میں آئی۔اس دن وردی کی بجائے جو ہم دن رات پہنے رکھتے تھے سویلین کپڑے جو ایک جگہ بکسوں کے اندر سٹور میں بند تھے نکال کر پہننے کے لیے ملے۔ہم نے بھی ٹاٹ کی چھت سے عارضی طور پر اپنے کپڑے نکال کر پہن لیے۔نماز کے وقت ہر کسی کا عجیب سا حلیہ بنا ہوا تھا۔کسی نے وہی بوسیدہ وردی جو اس نے قید ہوتے وقت پہن رکھی تھی اور کئی ایک نے بوسکی کی مڑی تڑی قمیض اور لٹھے کی شلوار بمع اسی ڈھب کی شیروانی زیب تن کی ہوئی تھی۔ گلے ملتے وقت لوگ بڑے جذباتی ہو گئے خاص کر کرنل عباسی جو میرے کورس میٹ میجر جنرل ظہیر عباسی کے بڑے بھائی تھے اپنے آنسو ضبط نہیں کر سکے۔گوشت کی متوقع آمد سے انتڑیوں میں خوشگوار بَل پڑ رہے تھے لیکن عین کھانے کے وقت چنے کی دال نے منہ چڑھایا۔عبدالرحمان اپنے کمپنی کمانڈر کے صندوق سے پس انداز کیا ہوا سوہن حلوے کا ایک ڈبہ اُڑا لایا اور بیرک میں لا کر بانٹ دیا۔ مجھے معلوم ہوا تو اسے سختی سے ڈانٹا۔ حیران و پریشان اس نے میری طرف دیکھا اور پھر دوسری بیرک کے کسی کمرے میں بیٹھ کر روتا رہا۔ مجھے پتہ لگا تو اُسے جا کر گلے لگایا۔قید کی وجہ سے ہمارا جذباتی لگاؤ بہت زیادہ ہو گیا تھا۔ویسے بھی عمروں میں کم فرق کی وجہ سے بچپن ہی سے ہم دوستوں کی طرح رہے تھے۔

کیمپ میں کام کرنے والے مزدوروں اور سنتریوں میں ایک مسلمان مستری نے چپکے سے ہمارے کمرے میں آ کر ہمیں اپنے گھر کا پتہ لکھوایا۔فرار کی صورت میں وہ ہماری ہر طرح کی مدد کرنے پر آمادہ تھا۔غریب اور مسکین صورت کے اس آدمی

کی جرأت قابلِ تحسین تھی ۔ کچھ افسروں نے ہندوستانی حوالدار سے راہ ورسم پیدا کر لی تھی اور اس کے ذریعے چھپے ہوئے انڈین نوٹ مختلف النواع چیزوں میں تبدیل ہوتے رہے ۔شراب کے عادی کچھ افسر بھی اس خفیہ کاروبار سے مستفید ہوتے رہے ۔ گو چیزوں کی قیمت دس بیس گُنا زیادہ تھی لیکن پھر بھی کچھ لوگ انہیں منگوانے کے لیئے تیار تھے اور اس طرح پاکستانی کرنسی جو کئی لوگوں کے پاس ہزاروں کے حساب میں تھی اونے پونے چلتی رہی ۔

کیمپ کے گرد و پیش کا جائزہ لینے کی غرض سے بیماری کا بہانا بنا کر میں ایم ۔ آئی ۔ روم ۔ تک گیا۔ یہ جان کر کہ میرا تعلق سگنلز سے ہے انڈین سگنل کے ایک میجر نے ہماری سگنل کور کے بارے میں کئی سوال پوچھے ۔ کافی عمر رسیدہ تھا اور شاید لڑائی کی وجہ سے اسے دوبارہ بلایا گیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ قبل از تقسیم ہند وہ موجودہ پاکستان میں گھوما پھرا ہے ۔ٹھیک ہی کہتا ہوگا لیکن اس وقت اسکا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا کہ وہ ہماری سگنل کور کے بارے میں قیدیوں سے معلومات حاصل کرے ۔ جب میں نے اسے کہا کہ مجھے سکول آف سگنلز کے محل وقوع کے بارے میں کچھ علم نہیں تو اس نے حیرانگی کا اظہار کیا۔ یہ ممکن تو نہیں کہ ہندوستانیوں کو اس عام سی چیز کا علم نہ ہو لیکن اپنے منہ سے غیر اہم معلومات فراہم کرنا بھی وطن کے ساتھ غداری کے مترادف لگتا تھا۔ ہمارے کئی ایک ساتھی ہندوستانیوں کی پوچھ گچھ جو کیمپ سے باہر کسی مقام پر کی جاتی تھی کے بعد ڈھینگیں مارتے نظر آتے تھے کہ ہم نے ہندوستانیوں کو خوب بے وقوف بنایا۔لیکن میرا خیال تھا کہ ہمیں انہیں صاف صاف کہہ دینا چاہیے تھا کہ ہم کسی قسم کی انفارمیشن نہیں دیں گے یا کم از کم یہ کہہ دیں کہ ہمیں اس کے بارے میں علم نہیں ۔ان چھوٹی چھوٹی اور بظاہر بے ضرر اور اپنی دانست میں غلط باتیں دشمن کی خفیہ ایجنسیوں کے لیئے نہایت مفید ثابت ہوتی ہیں ۔

گو میدانِ جنگ میں ہم مات کھا گئے تھے لیکن ہندوستانیوں پر ہمارے رویے سے یہ تو واضع ہوتا کہ یہ محض حالات تھے ورنہ اس فوج کا ہر مردِ اپنے وطن کیلئے ہر طرح کی قربانی دینے کیلئے تیار رہتا ہے۔ میں بھی اس نئے محاذ کا ایک ادنیٰ سپاھی بننا چاہتا تھا۔ جو شکست و ذلت کا بدنما داغ ہماری قوم کے ماتھے پر کلنک کے ٹیکے کی طرح اُبھرا تھا اسے مٹانے کا حالاتِ قید میں اس سے بہتر طریقہ اس کے سوا ہمارے پاس کوئی نہیں تھا کہ ہم بلند کردار، ہمت، صبر اور استقلال کے جذبے سے لبریز اس نئے محاذ پر دشمن کو نیچا دکھائیں۔ ہمارے جوانوں میں یہ جذبہ تو موجود تھا مگر اسے صیحح راہ پر لگانے کی ضرورت تھی۔ میں نے پہلے کسی جگہ ذکر کیا تھا کہ لڑائی کے دوران کوئی جوان میرا فیلڈ جیکٹ اٹھا کر لے گیا تھا۔ وہ اب ہمارے کیمپ میں کھانا لانے پر ماءمور تھا۔ ساتھ کے کیمپ میں سے کھانا پک کر یہاں بانٹا جاتا تھا۔ ایک دن وہ کھانا لے کر آیا تو کم پڑنے پر واپس دوسرے کیمپ میں مزید کھانا لینے کے لیئے جانے لگا تو سنتریوں نے اسے گیٹ پر روک لیا۔ وہ ان سے تکرار کر رہا تھا کہ ہمارے صاحبوں کیلئے کھانا کم پڑ گیا ہے میں ضرور جاؤں گا۔ سنتری نے کوئی الٹی سیدھی بات کی تو اس کی رائفل چھین کر اس کی ٹھکائی کر دی۔ سبحان اللہ!

ہمارے کیمپ میں افسر چونکہ گنجائش سے بہت زیادہ تھے اور ریڈ کراس کے نمائندہ ٹیم کی پہلی دفعہ کیمپ میں آمد تھی اس لیے ہمارے کیمپ سے چالیس اور ساتھ والے کیمپ سے بیس افسروں کو کہا گیا کہ رضا کارانہ طور پر میرٹھ میں ایک نئے کیمپ میں جانے کے لیے اپنے نام لکھوائیں۔ ہمارے کیمپ کے سارے افسروں کو فالن کر کے کیمپ سینئر نے نام مانگے تو میں نے بہت سے لوگوں کے پاس جا کر کہا کہ اپنا نام لکھوا دیں تاکہ راستے میں فرار کے کسی موقع سے فائدہ اٹھایا جاسکے۔ کرنل افضل کے گروپ سے کیپٹن آصف ہمارے ساتھ جانے کو تیار ہو گیا۔ ہمارے کمرے کے

سارے افسر اور 3 سگنل بٹالین کے باقی افسروں میں سے صرف لیفٹیننٹ شمس ہمارے ساتھ جانے کے لیئے راضی ہوا۔ 27 بریگیڈ کے ڈی۔ کیو DQ میجر ولی جو پی۔ ایم۔ اے کی فرسٹ ٹرم میں ہمیں مرغی کی ٹانگ کھانے کا درست طریقہ بحثیت کمپنی سپورٹ سارجنٹ بتاتے تھے کے علاوہ باقی سب افسر بھی تیار ہوگئے۔ آہستہ آہستہ آرڈیننس کے بھی کافی افسر ہمارے ساتھ آن ملے۔ کیمپ سے چار سینئر کرنیل بھی ساتھ جانے تھے۔ قرعہ اندازی میں کرنل رشید کے کمرے کا نام آیا اور اسطرح تقریباً بیس افسر ایک طرف کر لیئے گئے۔ آصف سے کرنل افضل خفا تھے کہ وہ انہیں کیوں چھوڑ کر جا رہا ہے۔ وہ اسے اپنے بچوں کی طرح چاہتے تھے۔ ویسے وہ ہمارے فرار کے منصوبے سے کافی متاثر تھے۔ اپنے پورے گروپ کی کوششوں کے باوجود آصف نے اپنا نام نہیں کٹوایا۔ ان لوگوں نے مجھ سے کہا کہ تم بھی اپنا نام کٹوا دو تا کہ آصف نہ جائے۔ لیکن ہم اتنے اچھے موقع کو کیسے گنوا سکتے تھے۔ جتنا سفر کے دوران بھاگنے کا موقع ملتا ہے کیمپ میں کسی حالت میں بھی میسر نہیں آتا۔ جانے سے پیشتر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ فوجی ٹرکوں پر جانا ہے یا ٹرین پر۔ میں نے کسی کی ڈائری سے انڈیا کا چھوٹا سا نقشہ نقل کر لیا تھا لیکن اس پر صرف ریلوے لائنیں ظاہر کی گئیں تھیں سڑکیں نہیں دکھائی گئیں تھیں۔ اس کے مطابق میرٹھ تقریباً تیس میل دہلی سے شمال مشرق کی طرف بنتا تھا۔

اسی رات ہمیں ساتھ والے کیمپ میں فلم دکھائی گئی۔ ایک کیمپ سے دوسرے کیمپ تک کا فاصلہ تاروں کے ساتھ ساتھ دو تین سو گز بنتا تھا۔ بالکل دیہاتی ماحول میں پکچر دیکھی۔ پکچر سے زیادہ ہم نے دوسرے کیمپ کے افسروں سے باتیں کرنے میں وقت گزارا۔ اگلی صبح کرنل افضل کو بھی حکم ملا کہ وہ آگرہ جانے کے لیے تیار ہو جائیں۔ ہندوستانیوں کے خیال میں وہ افسروں کو ان کے ساتھ غیر دوستانہ

رو یہ رکھنے کی ترغیب دیتے رہتے تھے۔آگرہ قلعہ کے اندر واقع مغلیہ عہد کی جیل ایسے تمام قیدیوں کے لیے کالے پانی کی حیثیت رکھتی تھی۔کرنل افضل کوتشویش تھی کہ میں کوئی ایسا قدم نہ اُٹھاؤں جس سے سب کی جان کو خطرہ ہو۔انہوں نے آصف کا خیال رکھنے کا بھی کہا۔ کیمپ کے باہر دو سویلین بسیں ہمیں لے جانے کے لیئے تیار کھڑی تھیں۔ہمیں دو گروپوں میں بانٹنے کے لیے جو فالن کیا گیا تو ہم میں سے کوئی بھی سات افسروں کے اس چھوٹے گروپ میں جانے کے لیے تیار نہیں ہوا جس نے دوسرے کیمپ کے کچھ افسروں کے ساتھ مل کر دوسری بس میں بیٹھنا تھا۔چونکہ ہم میں سے کافی لوگ میرے ساتھ اس منصوبے میں شامل تھے اس لیے کوئی بھی الگ نہیں ہوا۔گودس بارہ افسر فرار کے لیے تیار نہیں تھے لیکن انہوں نے بھی دوسری بس میں جانے سے انکار کر دیا۔ ہندوستانیوں نے سات افسروں کو جو ایک ساتھ ایک طرف کھڑے تھے الگ کر دیا۔خوش قسمتی سے میں عبدالرحمٰن، آصف اور سگنل کے باقی تین افسر اور کیپٹن خلیق ایک ساتھ دوسری بس کے لیئے چن لیئے گئے۔فرار کے لیئے آمادہ ہو کر ساتھ جانے والے ہمارے کیمپ کے باقی افسر اب ہمارے ساتھ نہیں تھے۔

بریلی سے میرٹھ اور فرار کی کوشش

سب ساتھیوں نے اشک بار آنکھوں سے رخصت کیا۔آرٹلری کے میجر محبوب بھٹی بہت جذباتی ہو کر پھوٹ پھوٹ کر روئے۔عبدالرحمٰن کا سی. او CO اس بات پر

خوش نہیں تھا کہ میں اس کے علاوہ اس کے تین اور افسروں کو ورغلا کر لے جا رہا ہوں۔ میں نے اور عبدالرحمٰن نے وردی کے نیچے سویلین قمیضیں پہن رکھی تھیں۔ پتلونیں بیگ میں اس لیئے رکھیں کہ جانے سے پہلے تلاشی کے دوران اگر نیچے پہنے ہوئے کپڑے دیکھ لیے گئے تو ہندوستانی ہمارا ارادہ بھانپ لیں گے۔ قمیض سردی سے بچنے کے بہانے بھی پہنی جا سکتی ہے۔ بوٹوں کی جگہ میں نے کالی چپل پہن رکھی تھی۔ عبدالرحمٰن کے پاس چھوٹے بوٹ اور چپل نہیں تھے اس لیے اس نے بڑے فوجی بوٹ پہنے ہوئے تھے۔ آصف کی وردی کے نیچے شلوار قمیض تھی۔ ہمارا باقی سامان جو دو تھیلوں پر مشتمل تھا چھت پر رکھ دیا گیا۔ دوسری بس میں ساتھ والے کیمپ کے افسر منصوبے سے واقف نہیں تھے۔ بعد میں سوار ہونے کی وجہ سے ہم سب کو پچھلی نشستیں ملیں۔ دوسرے کیمپ سے آیا ہوا عبدالرحمٰن کا ایک دوست آفتاب بھی پچھلی سیٹوں پر بیٹھا ہوا تھا۔

عین آخری وقت دوسری بس سے دو کرنیل ہماری بس میں آ کر اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ ان کی ساتھ کی سیٹ پر تین ہندوستانی سپاہی بیٹھے ہوئے تھے۔ سب سے پچھلی نشست پر ایک جے سی او JCO اور تین سپاہی تھے۔ ان سب کا تعلق کسی جاٹ رجمنٹ سے تھا۔ جے سی او کے علاوہ تین عہدیدار اور باقی کم عمر نئے سپاہی لگتے تھے۔ اگلی نشست پر دو این سی او NCO اور ایک سپاہی اور باقی تین سپاہی جے سی او (صوبیدار) کے ساتھ پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ پارٹی کا انچارج کیپٹن لمبو (Lambo) نسلاً گورکھا اور کسی دوسری رجمنٹ سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ اگلی بس میں سوار تھا اور اس کے ساتھ صرف چار سپاہی تھے۔ میں نے راستے میں بس میں سوار دوسرے کیمپ کے افسروں سے پوچھا کہ وہ فرار کے لیے تیار ہیں تو ان میں سے چند ایک نے آمادگی کا اظہار کیا۔ ان میں کیپٹن سجاد، کیپٹن رشید، کیپٹن مہتاب اور کیپٹن

سلیم (سارے نام فرضی ہیں) شامل تھے ۔لیکن انہیں یقین نہیں تھا کہ ہم فرار کی کو شش کریں گے ۔کیپٹن سجاد نے تو یہاں تک کہا کہ ہم نے بڑے بڑے دیکھے ہیں جو ایسے خالی خولی منصوبے بناتے ہیں ۔ ہمارے ساتھ پچھلی سیٹوں پر کیپٹن فاروق اور صدیقی بیٹھے ہوئے تھے ۔انہوں نے صاف بتا دیا تھا کہ وہ فرار کیلئے تیار نہیں ۔ ہم کل تقریباً 12 افسر اس منصوبے میں شامل تھے ۔ آہستہ آہستہ کرنیلوں کے سوا جو اگلے سنتریوں کے بالکل پیچھے بیٹھے ہوئے تھے باقی سب سے بھی اس بارے میں ان کے پیچھے بیٹھے ہوئے افسروں کے ذریعے پوچھ لیا گیا تھا۔

منصوبے کے مطابق میرٹھ اور دہلی کے درمیان کسی جگہ سنتریوں سے ہتھیار چھین کر بس کو قابو کر کے سویلین کپڑے پہن کر چھوٹی چھوٹی پارٹیوں کو وقفے وقفے سے راستے میں اتارنا اور پھر بس کو چھوڑ کر اپنے طور پر نیپال یا کسی دوسری طرف سے پاکستان پہنچنا تھا۔ اس پر عمل پیرا ہونے کے لیے مرشد، سلیم اور میں نے اگلے تین سنتریوں کو قابو کرنا تھا۔ سلیم اگلے سنتریوں کے بالکل پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے میجر کفیل اور میجر غفور اس بات پر آمادہ نہیں تھے کہ وہ سنتریوں کو قابو کرنے میں ہماری مدد کریں ۔ ہم چونکہ بس کے نصف سے بھی پیچھے بیٹھے تھے اس لیے ہمارے وہاں پہنچنے تک سنتری چوکنے ہو سکتے تھے ۔ ان کے علاوہ بس کا کنڈکٹر بالکل آگے بیٹھا ہوا تھا اور اس کا منہ ہماری طرف تھا۔ بس کا ڈرائیور ایک ہٹا کٹا سکھ تھا۔ سنتریوں کے ساتھ ساتھ اس کو بھی قابو کرنا ضروری تھا۔

شام کے وقت کچھ دیر کے لئے ایک جگہ رک کر ہمیں چائے پلانے کے لئیے بسوں سے نیچے اتارا گیا۔ یہاں ہم نے منصوبے کی تفصیلات دوبارہ طے کر لیں ۔ پتہ چلا کہ میرٹھ کل پچیس میل رہ گیا ہے اور یہاں سے سڑک دہلی جانیوالی جی ٹی روڈ سے الگ ہو کر سیدھی میرٹھ پہنچتی ہے ۔ پچھلے گروپ کا انچارج عبدالرحمان تھا۔ اسکے

ساتھ تقریباً نو افسر تھے جن میں سے چار افسروں کو خاص طور پر ایک ایک سنتری کو قابو کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ عبدالرحمٰن کو صوبیدار (جے۔ سی۔ او) اور مہتاب کو موٹے نائیک اور خلیق اور کیپٹن سجاد کو باقی دو سپاہیوں کو اور باقی پانچ افسروں کو ان کی مدد کرکے ہتھیار چھیننے پر مامور کیا گیا تھا۔ کیپٹن فاروق دوسری بس میں چلا گیا تھا اور اس کی جگہ سگنل کا کیپٹن مقبول جو بھیراب بازار میں سگنل کمپنی کا ٹو آئی سی 2IC تھا دوسری بس سے فرار میں حصہ لینے کے لیئے آ گیا تھا۔ بس رائے بریلی، مراد آباد اور کچھ اور بڑے شہروں سے گزری تو غربت ہمارے شہروں کے مقابلے میں بہت زیادہ لگی۔ چند مسلمان اپنی داڑھیوں سے پہچانے گئے۔ ان کی حالت باقی لوگوں سے نسبتاً زیادہ دگرگوں لگ رہی تھی۔ چونکہ ابھی شام کے چار ہی بجے تھے اس لیے راستے میں اندھیرا پڑنا ناممکن نظر آیا اس لیئے سکھ ڈرائیور کو پنجابی میں کہا کہ وہ گاڑی بے تحاشا تیز چلا رہا ہے جس کی وجہ سے کچھ افسروں کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ کہنے لگاؔ بادشاہو کوئی گل نہیں کہو وتے بالکل ہی نہیں چلاندےؔ۔ میرا خیال تھا کہ آہستہ چلانے سے ایک تو اگلی گاڑی اور ہماری بس میں فاصلہ بڑھ جائے گا اور دوسرا یہ کہ ہمیں اندھیرا پڑنے کی امید رہے گی۔ ہماری گاڑی آہستہ آہستہ جا رہی تھی لیکن میرٹھ چھ سات میل کے فاصلے پر رہ چکنے کے باوجود سورج ابھی تک نہیں ڈھلا تھا لہٰذا میں نے اُسی وقت منصوبے پر عمل پیرا ہونے کا فیصلہ کیا۔

میں جب چپکے چپکے لوگوں کو حملے کے لیئے تیار رہنے کے لئے کہہ رہا تھا تو پیچھے بیٹھے ہوئے سنتریوں کو شک گذرا۔ وہ اپنے ہتھیار سیدھے کر کے چوکنے ہو گئے لیکن کچھ ہی دیر بعد پھر باتوں میں لگ گئے۔ عبدالرحمٰن سے کہا تھا کہ جب میں بس کے درمیان میں جا کر سر پر ہاتھ پھیروں تو تم لوگ اپنی کاروائی شروع کر

دینا۔کیپٹن ارشاد جو پہلے میری طرح بس کی راہداری کی طرف بیٹھا ہوا تھا اٹھ کر کھڑکی کی طرف چلا گیا تھا۔ایسے لگتا تھا کہ وہ سنتریوں پر حملے کے لیے آمادہ نہیں ورنہ اس جگہ سے اس کا میرے سنتریوں پر فوراً جھپٹنا ناممکن تھا۔ایم۔پی کے کپتان ایاز طوسی نے چائے پینے والی جگہ سے اپنے لیے کچھ انڈے اور مٹھائی لی تھی۔اپنے آپ کو حملے کے لیئے بہتر پوزیشن میں لانے کے لیئے میں اٹھ کر اس کے پاس کھڑا ہوگیا اور اونچی آواز میں اس سے مٹھائی مانگی۔

پیچھے ایک سویلین بس آرہی تھی جسے ہماری بس والا کراس کرنے کا موقع نہیں دے رہا تھا۔ چونکہ دیر ہونے کا خدشہ تھا اس لیئے اسی وقت حملے کا اشارہ دیا اور خود لپک کر آگے بیٹھے ہوئے تینوں سنتریوں کو بازوں میں جکڑ لیا۔جھٹکے کی وجہ سے ایک سپاہی کی رائفل کی نالی جو ڈرائیور کو لگی تو اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور فوراً بریک لگائی اور بس چھوڑ کر باہر نکل گیا۔ساتھ ہی کنڈکٹر نے بھی بس سے جست لگا دی۔بس میں کچھ گڑ بڑ دیکھ کر پیچھے آتی ہوئی ایک سویلین بس ذرا آگے جا کر رک گئی۔ڈرائیور اور کنڈکٹر دوڑ کر اس میں سوار ہوئے تو بس فوراچل پڑی۔

درمیان والے سنتری نے اپنی سٹین گن جسے میں چھیننے کی کوشش کر رہا تھا بس کے فرش پر پھینک دی اور پھر ٹھوکر لگا کر کھلے دروازے سے باہر گرادی۔کیپٹن ارشاد اور کیپٹن سلیم میرے ساتھ حملے کے وقت موجود نہیں تھے۔ میں اکیلا ہی تینوں سنتریوں کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتا رہا۔میں سوچ رہا تھا کہ نجانے پچھلے سنتریوں سے ابھی تک ہتھیار کیوں نہیں چھینے جا سکے؟ ابھی تک تو ان کو میری مدد کیلیئے پہنچ جانا چاہیے تھا۔ مجھے پتا نہیں چل رہا تھا کہ پیچھے کیا ہو رہا ہے۔سنتریوں کے ساتھ اتنا الجھا ہوا تھا کہ مڑ کر دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔اچانک کچھ لوگوں نے مجھے پیچھے کھینچنا شروع کر دیا تو سنتری مجھ سے چھٹ کر نیچے اتر گئے۔کرنل اقبال نے اونچی آواز میں کہا کہ یہ کیا

کر رہے ہو؟ میں نے جواب دیا کہ آپ کو نہیں معلوم کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ مجھے پیچھے کھینچنے والوں میں کرنل علوی، کرنل اقبال، میجر غفور اور میجر کفیل تھے۔ باقی سب لوگ بھی بہت گھبرائے ہوئے نظر آئے۔

دائیں طرف تقریباً ساٹھ گز کے فاصلے پر عبدالرحمٰن ہاتھ میں ایک سٹین گن اٹھائے دور بھاگتا ہوا نظر آیا۔ اسکے بھاگنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ اسے آواز دی کہ واپس آ جاؤ۔ اس نے میری آواز سن کر یا ویسے ہی منہ موڑ کر بس کی طرف دیکھا اور پھر بھاگنے لگ پڑا۔ اس سے چار پانچ سو گز آگے ایک اور افسر بھاگتا ہوا نظر آیا۔ اپنے آپ کو ان افسروں سے چھڑا کر بس کی پچھلی طرف دیکھا تو وہاں مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی اور منصوبے میں شامل بیشتر ساتھی نظر نہیں آ رہے تھے۔ البتہ منصوبے میں شامل سگنل کے ہمارے ساتھ آئے ہوئے تینوں افسروں کے علاوہ سلیم اور سجاد بس میں موجود تھے۔

صورت حال کو بھانپتے ہوئے میں بھی بھاگنے کے لیے جب بس کے پچھلے دروازے کی طرف گیا تو وہاں کھڑے جے۔ سی۔ او اور دو سپاہیوں نے جنہوں نے سٹین گن اور بندوق تان رکھی تھی مجھے روک لیا اور کہا کہ خبردار جو باہر نکلنے کی کوشش کی۔ نجانے کیسے میرے منہ سے نکلا کہ وہ لوگ جو بھاگ گئے ہیں میں انہیں واپس بلانے جا رہا ہوں۔ ناسمجھ ہیں سمجھا بجھا کر واپس بلا لاؤں گا۔ چونکہ وہ مجھے اگلے سنتریوں پر حملہ کرتے ہوئے نہیں دیکھ سکا تھا اس لئے گھبرائے ہوئے صوبیدار نے میری بات پر اعتبار کر لیا اور ایک نائیک اور سپاہی کو میرے ساتھ بھیج دیا۔ میں نے انہیں کہا کہ وہ افسر امرودوں کے باغ میں جو تقریباً اس جگہ سے تین سو گز کے قریب ہے چھپے بیٹھے ہیں۔ ان کے کہنے پر میں نے زور زور سے آواز لگائی کہ واپس آ جاؤ۔ میں آہستہ آہستہ باغ کے قریب جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ سنتری

اب بہت چوکنے ہو گئے تھے اور مجھ سے دس پندرہ گز کے فاصلے پر میری طرف رائفل اور اسٹین تانے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ جونہی میں رکتا وہ بھی رُک جاتے۔ میرا خیال تھا کہ جونہی وہ میرے پاس آئیں میں ان پر حملہ کر دوں اور تیزی سے بھاگ کر باغ میں گھس جاؤں۔ اب ارادہ تھا کہ باغ کے پاس جا کر دوڑ لگا دوں گا آگے اللہ کی مرضی۔ لیکن باغ کے پاس پہنچنے سے بہت پہلے یا تو صوبیدار نے میرا ارادہ بھانپ لیا یا آگے والے کسی سنتری نے میرے بارے میں اسے بتا دیا تھا۔ اس نے زور زور سے آواز دی کہ واپس آ جاؤ۔ میں نے انہیں کہا کہ بس امرودوں کے باغ تک ڈھونڈوں گا وہ وہیں چھپے بیٹھے ہیں۔ لیکن سنتریوں نے للکارا کہ اب ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو گولی مار دیں گے۔ عجیب تذبذب کے عالم میں تھا۔ اگر یہاں سے دوڑ لگاتا تو ممکن نہیں تھا کہ سنتری جنہوں نے ہتھیار کندھوں کے ساتھ لگائے ہوئے تھے مجھے ہٹ نہ کر پاتے۔ پاؤں میں چپلوں کی وجہ سے پچاس، ساٹھ گز کا فاصلہ تیزی سے طے کرنا ناممکن تھا۔ چار و ناچار واپس آنا پڑا۔

وہ سنتری جن پر میں نے بس میں حملہ کیا تھا مارنے کے لیے دوڑے لیکن جے۔ سی۔ او (صوبیدار) نے انہیں روک دیا۔ 3 سگنل کے افسروں کے علاوہ راشد، سجاد، اور سلیم جو بقول اس کے حملے کے وقت سو گیا تھا بس میں موجود تھے۔ ان پر ہمیں قوی اُمید تھی کہ ہمارا ساتھ دیں گے۔ عبدالرحمان کے علاوہ ارشاد، خلیق، مقبول، ممتاز (جو منصوبے میں شامل نہیں تھا) آصف اور، مہتاب کل سات افسر بس سے نکلنے میں کامیاب ہوئے۔

سگنل کے کیپٹن عزیز کو جو شروع ہی سے میرے ساتھ ایک ہی سیٹ پر سفر کر رہا تھا راستے میں بخار چڑھ گیا تھا (شاید ذہنی کچھاؤ کی وجہ سے)۔ اس نے اپنے اوپر کمبل ڈال رکھا تھا۔ میں نے اس کے پاس بیٹھ کر اس کے کمبل کا کچھ حصہ اپنے

اوپر اوڑھ لیا اور سیٹ کے نیچے پڑے ہوئے اپنے بریف کیس میں سے سیفٹی نکال کر اپنی مونچھیں تھوک لگا کر صاف کر لیں۔ بالوں کا ایک انبار منہ سے ہٹ گیا۔ ایس ایس جی کا فیلڈ جیکٹ اور نیچے پہنی ہوئی قمیض اتار دی۔ میں یہ سب کچھ پیچھے کھڑے دونوں سنتریوں کی موجودگی میں کر رہا تھا لیکن انہیں میری اس کاروائی کا پتہ نہیں چلا۔ ان میں وہ لمبا تڑنگا سنتری بھی موجود تھا جس کو میں نے قابو کر کے ہتھیار چھیننے کی کوشش کی تھی۔ میرے سیٹ پر بیٹھتے وقت وہ دوسرے کو بتا رہا تھا کہ یہی (موٹی سی گالی) ہے جس نے ہمیں پکڑا تھا۔ باہر گہرا اندھیرا چھا گیا تھا۔

اچانک کتوں کے بھونکنے اور بہت سے لوگوں کی آوازیں آئیں۔ میرٹھ سے پی۔او۔ ڈبلیو کیمپوں کا گروپ کمانڈر سکھ سنٹر کی ایک پلاٹون اور کیپٹن لیمبو (Limbo) کے ساتھ موقع پر پہنچ گیا۔ کرنل نے بس کے اندر آ کر بہت شور شرابا اور ڈانٹ ڈپٹ کی۔ سب افسروں کو کہا گیا کہ پانچ منٹ کے اندر اندر اپنا اپنا سامان جو بس کے اندر اور چھت پر تھا الگ کر لیں۔ میں نے اپنا، عبدالرحمٰن اور آصف کا سامان اپنا ظاہر کر کے ایک طرف کر دیا۔ باقی سامان کو کتوں سے سُنگھوایا گیا۔ کیپٹن لیمبو نے باری باری سنتریوں کو بلا کر پوچھا کہ تمہیں کس نے پکڑا تھا۔ سنتری حیران تھے کہ اتنی بڑی بڑی مونچھوں والا کہاں غائب ہو گیا ہے۔ کہنے لگے کہ وہ افسر جب دوبارہ بس کے اندر آیا تھا تو ہم نے خود اس کو دیکھا تھا۔ میں نے انہیں کہا کہ وہ تو باہر چلا گیا تھا اور پھر واپس نہیں آیا۔ انہیں یقین نہیں آیا لیکن اس کے سوا ان کے پاس چارہ بھی کیا تھا۔ دوسرے سنتریوں کو شناخت کے لیے لایا گیا تو ایک کالے سے نوعمر سپاہی نے کیپٹن مجید (نام اصلی نہیں) کی طرف اشارہ کیا کہ اس نے مجھے پکڑا تھا۔ کیپٹن مجید جسے میں نے ایک سپاہی کو پکڑنے کا کام سونپا تھا اب اگلی سیٹوں پر بیٹھا تھا۔ اسے جب بس سے نیچے لیجایا جا رہا تھا تو وہ زور زور اور گھبرائی

ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا کہ میں نے کسی سنتری کو نہیں پکڑا تھا۔ لیکن باہر لے جا کر سکھوں نے اسے ایک دو بٹ رائفل کے لگائے تو بول پڑا کہ میں اس افسر کو پہچانتا ہوں جس نے یہ منصوبہ بنایا تھا۔ جب وہ اسے اندر لائے تو اس نے کرنل علوی سے کہا کہ سر آپ بتائیں کہ وہ کون سا افسر ہے؟ کرنل علوی نے کہا کہ وہ افسر یہاں نہیں ہے بھاگ گیا ہے۔ اس پر کیپٹن ساجد نے میری طرف اشارہ کرتے ہوء کہا کہ یہی وہ افسر ہے جس نے یہ منصوبہ بنایا تھا اور اگلے سنتریوں کو پکڑا تھا۔ میں اٹھ کر درندہ نما سکھ صوبیدار کے ساتھ باہر آ گیا۔ باہر سکھ سنٹر کی پوری پلاٹون بھیڑیوں کی طرح شکار کی منتظر تھی۔ اگلے چند منٹوں میں رائفل کے بٹوں، ٹھوکروں اور مکوں کی ایک بارش تھی جو کسی طور تھمنے کا نام نہ لیتی تھی۔ میں نے زمین پر لیٹے لیٹے جسم کے نازک حصے بچانے کے لیے گھٹنے سکیڑ کر (پیرا جمپ کے بعد زمین پر گرنے کی پوزیشن) اپنا کر سر بازوؤں کے اندر کر لیا۔ لیکن کچھ دیر بعد یہ سکت بھی نہ رہی اور نہ جانے کب تک مجھ پر مشق ستم جاری رہی۔

جب ہوش آئی تو مجھے گھسیٹ کر بس کے اندر ڈالا جا رہا تھا۔ گرم گرم خون سر اور جسم کے باقی حصوں سے بہہ رہا تھا۔ مجھے سیٹوں کے درمیانی راستے پر ڈال دیا گیا۔ دائیں بازو کی ہڈی ٹوٹ جانے کی وجہ سے شدید درد تھا۔ اس بازو کی ہڈی دس سال پہلے بھی ٹوٹ گئی تھی۔ سیٹ کے نیچے کسی افسر کا بیگ پڑا ہوا تھا اس میں سے بنیان اور تولیہ نکال کر اپنے سر پر لپیٹ لیا۔ سیٹوں پر بیٹھے افسر سخت سہمے ہوئے تھے اور میری طرف ایک نظر غائر بھی ڈالنے سے گریز کر رہے تھے۔ ناگاہ بس کی اگلی طرف سے وہی لمبا تڑنگا سنتری شور کرتا ہوا بھاگ کر اندر آیا اور رائفل کا منہ یہ کہتے ہوئے میری طرف کر دیا کہ میں اس کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ موت بالکل سامنے تھی لیکن ماسوائے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے کے اور کچھ کرنے کی سکت نہیں تھی۔ موت کو سامنے

دیکھ کر آدمی پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ میں بغیر کسی ردِعمل کے چپ چاپ اس کا انتظار کر رہا تھا۔اس سنتری کے پیچھے کیپٹن لیمبو بھاگ کر آیا اور اس کی رائفل کا منہ موڑ دیا۔سنتری پھر بھی بپھرا ہوا تھا۔سکھ جے سی او دونوں کرنیلوں کو بھی بٹ مارنا چاہتا تھا لیکن لمبے سنتری کے کہنے پر کہ انہوں نے میری جان بچائی ہے اور میرے مائی باپ ہیں انہیں چھوڑ دیا گیا۔لیکن ایک ایک بٹ کی ٹھوکر سے وہ بھی مستفید ہو گئے۔

آہستہ آہستہ بس میں افسروں کی ہمت بندھ رہی تھی۔ میجر کفیل اسی لمبے سنتری سے کہہ رہا تھا کہ تم میرے بھائی ہو۔کیا ہم بریلی کیمپ میں بھائیوں کی طرح نہیں رہتے تھے؟ کیپٹن طوسی نے لیمبو کو بتایا کہ میجر قادر نے ہی منصوبہ بنایا تھا اور اسی نے سنتریوں کو پکڑا تھا اور مجھ سے مٹھائی مانگنے کے بہانے بس کے سنٹر میں آیا تھا۔اور کئی افسر اپنی وفاداریوں کا ثبوت دینے کی کوشش کر رہے تھے۔مجھ سے نہ رہا گیا ۔تھوڑا سا سر اونچا کیا اور کہا Well done my brother Pakistani Officers۔اس کے بعد کچھ اور کہنے کی ہمت نہ رہی۔ میرے پیچھے کھڑے سکھ نے جس نے کافی دیر سے میرے ہاتھ پر اپنا لوہے کے سٹڈوں والا فوجی بوٹ رکھا ہوا تھا میرے سر پر زور سے ٹھوکر لگا کر پنجابی میں اپنے دوسرے ساتھی کو میرے فقرے کا متن بتایا۔

انڈین اے ایس سی کا ایک سمارٹ سا سیکنڈ لیفٹیننٹ بس کے اندر آیا اور اٹھا کر مجھے سیٹ پر لٹا دیا۔کسی سے تکیہ لے کر میرے سر کے نیچے رکھ کر پاس بیٹھ گیا اور پوچھا کہ تمہارا کیا پلان تھا۔ میں نے اسے کہا کہ میں نے تو محض اپنے ساتھیوں کو بچانے کے لیے سنتریوں کو فائر کرنے سے روکا تھا۔بس کے پیچھے بیٹھے ہوئے کسی سنتری نے ہمارے افسروں کو گالی دی اس لیے ان کا پچھلے سنتریوں کے ساتھ جھگڑا ہو گیا۔اگلے

سنتریوں نے فائر کرنا چاہا تو میں نے ان کو قابو کرلیا۔اس نے میری من گھڑت کہانی کو ماننے سے انکار کیا۔ یہی کہانی میں ہر جگہ دہراتا رہا تاکہ میری آئندہ فرار کی راہیں مسدود نہ ہوں۔

لیفٹیننٹ نے مجھے چائے پلانے کی کوشش کی تو میرے انکار پر اپنے افسروں میں سے کیپٹن ذہین خان (واحد افسر جس کے چہرے پر گھبراہٹ کے کوئی آثار نہیں تھے) نے اپنی سیٹ سے اٹھ کر مجھے چائے پینے کے لیے کہا۔ ہاتھ میں چائے کی پیالی اٹھائے وہ مجھے بڑی عقیدت کی نگاہ سے دیکھتا رہا۔لیفٹیننٹ کے جانے کے بعد اس نے گلہ کیا کہ سر آپ نے مجھے کیوں نہیں بتایا۔ میں نے اسے کہا کہ میں نے تو سب کو پیغام آگے پاس کرنے کو کہا تھا اور میری اطلاع کے مطابق صرف بارہ تیرہ افسروں نے ہی آمادگی کا اظہار کیا تھا۔ لگتا ہے اسے واقعی اس کے بارے میں پیشگی علم نہیں تھا۔ پاکستان آنے کے بعد زیادہ تر افسروں نے یہی کہا کہ ہمیں اس منصوبے کا علم نہیں تھا۔ میں وثوق سے تو نہیں کہہ سکتا لیکن جیسا کہ مجھے باقی افسروں نے بتایا تھا کرنیلوں اور شاید ان کے بالکل پیچھے بیٹھے ذہین اور آرڈیننس کور کے ایک کپتان کے علاوہ سب کی رائے لے لی گئی تھی۔ لیکن بفرض محال ان افسروں کو علم نہیں تھا تو کیا ان کا یہ فرض نہیں تھا کہ جب ایک دفعہ حملہ شروع ہو چکا تھا تو پاکستانی فوج میں ہونے کے ناطے وہ یا تو ہماری مدد کرتے یا کم از کم خود فرار ہونے کی کوشش کرتے۔ لیکن کچھ نے تو بجائے ہمارا ساتھ دینے کے ہندوستانیوں کی اس حد تک مدد کی کہ کیپٹن صدیقی نے بس کے اندر گری ہوئی ایک سٹین گن اٹھا کر ہندوستانی جے سی او کو باقی افسروں کے بھاگنے کے بعد دی۔اب اس کے لیے زور شور سے ہندوستانیوں سے صلہ چاہ رہا تھا۔ اگر سلیم بقول اسکے حملے کے وقت نہ سوتا اور ارشاد منصوبے کے مطابق میرے ساتھ ہوتا تو کسی دوسرے کی مدد کے بغیر ہم اگلے سنتریوں سے ایک

آدھ ہتھیار چھین کر باقی سنتریوں کو قابو میں لا سکتے تھے۔ مجھے علم نہیں تھا کہ پیچھے کیا ہو رہا ہے لیکن پلان کے مطابق ان کو حملے کے بعد بھاگنا نہیں چاہیے تھا۔ سات افسروں نے چار سنتریوں سے دو سٹین گنیں چھین لیں تھیں تو پھر ان کو بھاگ کر کیوں چھوڑ گئے۔ لوگوں کے بیان کے مطابق عبدالرحمٰن 'حیدر' کا نعرہ لگا کر جے سی او پر جھپٹا اور اس سے ہتھیار چھین لیا۔ ماہتاب اور خلیق دونوں نے ایک ایک سنتری سے سٹین گنیں چھین لیں تھیں لیکن انہیں بس کے اندر پھینک کر خود بھاگ گئے۔ آصف، مقبول، ارشاد اور ممتاز بھی بغیر سوچے سمجھے بس سے نکل کر بھاگ پڑے۔ عبدالرحمٰن اور جے۔سی۔او لڑتے لڑتے بس کے باہر آ گئے۔ دوسرے سنتری کو جے۔سی. او کہتا رہا کہ اس پر فائر کرو لیکن عبدالرحمٰن ہر دفعہ اس کو اپنے سامنے کرتا رہا۔ کیپٹن انعام اللہ جس نے اس کے ساتھ PMA پی ایم اے میں کورس کیا تھا اور جو بس کے اندر سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اسکے کہنے پر باہر نکل آیا اور اس کو جے سی او اور نائیک سے چھڑوا کر خود پھر اندر بیٹھ گیا۔ اور شاید اسی لمحے جب مجھے اپنے افسروں نے پیچھے کھینچا تو میں نے اسے بھاگتے ہوئے دیکھا۔ عبدالرحمٰن نے اپنی سرگذشت کچھ اس طرح بیان کی ہے۔

کیپٹن عبدالرحمان پر کیا بیتی۔اس کی اپنی زبان میں

جولائی 1970 میں میری پوسٹنگ 30 سگنل بٹالین جو کوئٹہ میں تھی سے ڈھاکہ میں موجود 3 سگنل بٹالین میں ہوگئی۔ان دنوں مشرقی پاکستان میں شدید سیلاب آیا ہوا تھا۔وہاں ایک جیپ میں بیٹھ کر اپنی یونٹ جو ہیڈکوارٹر ایسٹرن کمانڈ کے ساتھ تھی پہنچا۔ایسٹرن کمانڈ کا ہیڈکوارٹر زیر زمین کھدائی کر کے بنایا گیا تھا تاکہ بمباری کی وجہ سے اس کو ئی گزند نہ پہنچے۔کرنل افضل کیانی یونٹ کے سی۔او CO تھے میجر سلام اختر ٹو۔آئی۔سی 2IC اور کیپٹن مدثر ایجوٹنٹ تھے۔مجھے ریڈیو کمپنی میں پوسٹ کیا گیا۔ ہمارے پاس 16 اور 14 ڈیو ہیڈکوارٹرز اور فارورڈ برگیڈوں سے جو بھی وائرلیس پیغام آتے تھے ہم انہیں ہیڈکوارٹر ایسٹرن کمانڈ کے آپریشن روم میں پہنچا دیتے تھے ۔ وہاں چیف آف سٹاف COS برگیڈئر باقر اور جی ون G-1 موجود ہوتے تھے۔2 دسمبر کو پی۔آئی۔اے کی آخری فلائٹ کے ذریعے میرا بڑا بھائی میجر عبدالقادر مغربی پاکستان سے ڈھاکہ پہنچا۔مجھے ملنے یونٹ میں آیا تو اسے اپنے ساتھ مورچوں کے اندر ہی ٹھہرا لیا۔ہم بھی میس چھوڑ کر جوانوں کے ساتھ رہ رہے تھے۔

دوسرے ہی دن ڈھاکہ پر شدید ہوائی حملہ ہوگیا اور باقی محاذوں پر بھی باقاعدہ جنگ چھڑ گئی۔ ڈھاکہ میں موجود فوجیوں کا جذبہ بہت زیادہ اور حوصلے بہت بلند تھے اور بمباری کے دوران اپنے اور دشمن کے جہازوں کی لڑائی اپنے مورچوں میں بیٹھ کر بغور دیکھتے اور کسی انڈین جہاز کے گرنے پر نعرہائے تحسین بلند کرتے۔ ہر طرف ٹریسر فائر کی بوچھاڑ نظر آتی تھی۔ 7 دسمبر تک ہمارے ایف 86 (F-86) جہاز اپنے مدمقابل اپنی تعداد سے کئی گنا زیادہ مگ 31 اور ایس۔یو 7, (MIG-31 اور SU-7) قسم کے دشمن کے جہازوں کے دانت کھٹے کرتے رہے۔ انجینئرز کے میجر بشیر الدین میرے پاس آتے رہتے تھے اور رن وے کے بارے میں بتاتے رہتے تھے کہ وہاں بمباری کی وجہ سے جو گڑھے پڑتے تھے وہ کیسے بھرتے رہتے ہیں۔ لیکن بعد میں بھاری ہوائی بمباری کی وجہ سے رن وے ناکارہ ہوگیا اور پھر ہمارے جہاز زمین سے اڑ نہ سکے اور اسطرح ہم فضائی سپورٹ سے محروم ہو گئے۔ آپریشن روم میں ان جہازوں کے استعمال کے بارے میں مختلف آرائیں تھیں جو میں سنتا رہتا تھا۔ کچھ کا خیال تھا کہ انکے پروں کو کاٹ کر دشمن کے مختلف ممکنہ پیش قدمی کے راستوں پر زمینی دفاع کے لیئے استعمال کی جائیں۔ ہیڈ کوارٹر پر شدید بمباری ہوتی تھی جس کے نتیجے میں تقریباً آٹھ بم سیدھے اس پر گرے۔ وہاں کئی لوگ مورچوں ہی میں دب گئے۔

ہمارے آس پاس 6 لائٹ۔ایک۔ایک 6LAA رجمنٹ کی اینٹی ائر کرافٹ گنوں کی پوسٹیں تھیں جہاں سے دشمن کے جہازوں کو حملے کے دوران نشانہ بنایا جاتا تھا۔ وہ دشمن کے مگ 31 اور ایس یو۔ 7 جہاز گراتے تو ہم نعرے بلند کرتے۔ جہاز اتنے نیچے ہوتے تھے کی ہم پائلٹوں کے چہرے صاف دیکھ سکتے تھے۔ نرائن گنج پر جہاں ہمارے سامان سے لدے جہاز کھڑے ہوتے تھے شدید

بمباری کی جاتی رہی جس کی وجہ سے لگتا تھا کہ ہمارے کچھ جہاز غرق ہوئے ہیں۔ ان میں زیادہ تر پر ہمارا جنگی ساز وسامان لوڈ کیا گیا تھا۔ 6 دسمبر قادر مجھ سے الگ ہو کر اگلے معاذ پر براہمن باڑیا میں موجود 14 ڈیو کے ٹیک ہیڈکوارٹر Tac HQ چلا گیا۔

14 دسمبر کو انڈیا نے خود ہی سیز فائر کا اعلان کر دیا اور کہا کہ ہم آپ کو 24 گھنٹے دیتے ہیں اور کہا کہ آپ ہمیں اپنا ردعمل بتائیں تاکہ ہم اس پر ہم اپنا آئندہ کا پلان طے کریں۔ اس کے علاوہ انہوں نے پمفلٹ گرائے جن پر انہوں نے ایک فریکونسی (62 میگا ہرٹز) 62MHz دی کہ اس پر ہمارے ساتھ کلکتہ میں لنک قائم کریں۔ لنک قائم ہوا تو انہوں نے میسج دی کہ آپ مکمل گھیرے میں آچکے ہیں کیونکہ ہماری فوج آپ کے چاروں طرف پہنچ چکی ہے اور ہم کسی بھی وقت حملہ کر سکتے ہیں۔ 24 گھنٹوں کے بعد بریگیڈئر باقر نے مجھے ایک میسج دی کہ اسے بھیج دو۔ میسج میں لکھا تھا کہ آپ سیز فائر قبول کرلیں اور بات چیت کے لیئے کسی کو بھیج دیں اور سیز فائر 16 دسمبر تک بڑھانے کا کہا گیا جو قبول کر لی گئی۔

ہندوستانیوں کی طرف سے اطلاع دی گئی کہ 16 دسمبر دوپہر کو جنرل اروڑا اور جنرل جیکب آئینگے۔ انہیں لنچ پر مدعو کیا گیا جو انہوں نے قبول کر لیا۔ ہمارے وائرلیس نیٹ پر چونکہ تمام ڈویژن اور بریگیڈ بھی تھے اس لیئے انہوں نے جب یہ پیغامات سنے تو انہوں نے مجھے برا بھلا کہا اور کئی ایک نے گالیاں دینی شروع کر دیں کہ تم یہ کیا کر رہے ہو اور کدھر سے یہ لنک لگا لیا ہے اور کس نے تمہیں حکم دیا ہے سرنڈر کا وغیرہ وغیرہ؟ یہاں میں یہ بتا دوں کہ 7 دسمبر سے ہی فارورڈ بریگیڈوں سے پیغامات آنے لگے تھے کہ ہمیں ایمونیشن پہنچائیں کیونکہ ہمارا سٹاک ختم ہو گیا ہے۔ جب بہت شور شرابا ہوا تو بریگیڈئر باقر نے کہا کہ انہیں کہنے دیں اس سے کچھ

نہیں ہو گا۔

جنرل نیازی نے خود وائرلیس سیٹ پر آ کر اپنے سارے کمانڈروں کو کسی خفیہ پیغام رسانی کی عدم موجودگی میں پشتو میں کہا کہ ہمارا آپریشنل سسٹم فیل ہو چکا ہے آپ فال بیک fall back کر کے ہماری طرف آ جائیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہم فال بیک نہیں کر سکتے آپ ہمیں اسلحہ اور ایمونیشن بھیجیں۔ اس پر جنرل نیازی نے کہا کہ ہمارے پاس رسد و رسائل کا کوئی ذریعہ نہیں ہے جس پر انہوں نے کہا کہ ہیلی کاپٹروں پر بھیج دیں جس پر جنرل نیازی نے کہا کہ ہیلی کاپٹر مار گرائے جائیں گے۔ ان سے کہا گیا کہ دن کو نہیں تو رات کو بھیج دیں۔ انہوں نے وعدہ تو کر لیا لیکن بھیج نہیں سکے۔

اس کے بعد سرنڈر کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ 16 تاریخ کو انڈیا سے جنرل جیکب اور اس کا سٹاف آ گیا۔ وہ دن انہوں نے خاموشی سے گذارا۔ شام کو کلکتہ سے جس کے ساتھ ہمارا رابطہ قائم ہوا تھا پوچھا گیا کہ انسٹرومنٹ آف سرنڈر Instrument of Surrender پر دستخط ہو گئے ہیں کہ نہیں۔ جس کے جواب میں کہا کہ ہمیں نہیں پتا۔ انہوں نے زیادہ اصرار کیا تو میں نے انہیں کہا کہ انتظار کریں اور میں برگیڈئر باقر کے پاس گیا اور انہیں بتایا کہ وہ سرنڈر کے بارے میں بار بار پوچھ رہے ہیں۔ وہاں کلکتہ میں جرنلسٹ انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا جب دستخط ہو گئے تو بتا دیں گے۔ جب دستخط ہو گئے تو وائرلیس پر ان کو بتا دیا۔ چونکہ جی۔ ایچ۔ کیو کے علاوہ ہمارے اپنے ڈویژن اور برگیڈ بھی نیٹ پر موجود تھے اس لیئے جب انہوں نے سنا تو بہت شور مچایا اور ماننے سے انکار کیا۔

ہم سے کہا گیا کہ اب کوئی ٹیک ہیڈ کوارٹر سے باہر نہیں جائے گا اور اپنے اپنے کمروں میں ہی رہیں گے۔ 17 تاریخ شام کو مجھے کرنل کیانی نے کہا کہ چند ٹکنیشن

ساتھ لے کر سگنل سنٹر جاؤ اور کلکتہ کے ساتھ ڈائریکٹ رابطے کے لیئے جو کچھ انڈین کہیں اس پر عمل کرو۔ میں دو ٹیکنیشن اور گارڈ لیکر جیپ میں نکلا تو باہر پہلی دفعہ دیکھا کہ ساری سڑکوں پر انڈین پوسٹیں تھیں۔ وہ ساری گاڑیوں کو چیک کر رہے تھے۔ ہماری ساری گاڑیاں انڈینز چلا رہے تھے۔ ایک جگہ ایک انڈین کیپٹن نے مجھے روک لیا اور پوچھا کہ تم نے ہتھیار کیوں اٹھایا ہوا ہے۔ اسے میرے حوالے کردو۔ اس پر اس سے تو تکرار ہوگئی۔ میں نے اسے کہا کہ ہمیں فی الحال اس کی آپ کی طرف سے اجازت ہے۔ اس کے بعد وہ منت سماجت پر اتر آیا اور کہنے لگا کہ میں اسے سوونیئر کے طور پر رکھنا چاہتا ہوں لیکن اسے میں نے اپنا ہتھیار نہیں دیا اور جب تھوڑا اور غصہ دکھایا تو کہنے لگا اچھا جاؤ۔ ہیڈکوارٹر گیا تو وہاں بریگیڈیئر سندھو ناشتہ کر رہے تھے انہوں نے مجھے بھی پیشکش کی لیکن میں نے معذرت کر لی۔ انہوں نے کہا کہ اپنے ساتھ کچھ بندے لے جاؤ اور میرے آدمی جو پہلے سے وہاں موجود ہیں ان کے ساتھ مل کر جی۔ ایچ۔ کیو GHQ سے ہٹا کر ہمارا کمیونیکیشن communication کلکتہ کے ساتھ کردو۔ میں نے ان سے کہا میں اپنے والدین سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے اجازت دے دی اور کہا کہ تمام لنک کاٹ کر دوسری طرف شفٹ کر دینا۔ اسکے بعد میں نے جی۔ ایچ۔ کیو ملایا تو آپریٹر جو مجھے جانتا تھا نے کہا کہ جنرل عبیدالرحمان جو ہمارے Signal Officer in Chief تھے بات کرنا چاہتے ہیں۔ ان سے بات ہوئی اور ان کے پوچھنے پر ان کو مختصراً موجودہ حالات اور سرنڈر کے بارے میں بتایا اور پھر آپریٹر سے کہا کہ گھر بات کروادو۔ گھر والوں سے بات کی۔ میں آخری شخص تھا جس نے وہاں سے 17 دسمبر کو گھر والوں سے بات کی تھی۔ اس کے بعد کمیونیکیشن شفٹ ہوگیا۔

18 تاریخ کو ہم سب کو ریس کورس گراؤنڈ پہنچنے کا کہا گیا۔ وہاں انڈین جرنیلوں کے علاوہ جنرل نیازی اور ہمارے تمام جنرل موجود تھے۔انہیں اپنے اپنے علاقوں سے ھیلی کاپٹروں پر لایا گیا تھا۔ ہندوستانیوں نے کہا کہ آپ اپنا اسلحہ کیوں نہیں لائے۔ہمیں اپنا اپنا اسلحہ لانے کے لیئے واپس بھیجا گیا۔سرنڈر کے روز میں نے بہت دردناک مناظر دیکھے۔سرنڈر کی تقریب میں اہم بنگالیوں کے علاوہ بیگم ضیاالرحمان جو حراست میں رکھی گئی تھی بیٹھی ہوئی ہمیں جلانے کے لیئے مسکراہٹیں بکھیر رہی تھی۔ہمیں جنرل نیازی نے حکم دیا" تین قدم پیچھے چل"۔اس کے بعد جنرل اروڑہ نے کہا۔Lay down arms اس پر ہم نے اپنے اپنے ہتھیار زمین پر رکھ دیئے۔اس کے بعد آواز آئی' تین قدم پیچھے چلو' تو ہم پیچھے ہو گئے۔اس کے بعد جنرل اروڑا نے تقریر کی جس میں اس نے باقی باتوں کے علاوہ کہا کہ آپ لوگ اللہ سے معافی مانگیں۔آپ نمازیں نہیں پڑھتے آپ نے بہت گناہ کیئے ہیں اور ان گناہوں کی وجہ سے آپ کو یہ سزا ملی ہے۔ ہم بھی تو پوجا کرتے ہیں۔آپ سے التجا کرتا ہوں کہ جا کر اللہ کو یاد کریں نمازیں پڑھیں۔ یہ سب کچھ جو آپکے ساتھ ہوا ہے شاید اسی وجہ سے ہوا ہے۔ جنرل جیکب بھی بیٹھا ہوا تھا اور ہمارے سارے جنرل بھی موجود تھے۔ ہمارے لیئے یہ شرم کا مقام تھا اور ہمارا مورال نہایت ڈاؤن تھا۔ اس کے بعد ہمیں کہا گیا کہ اب واپس جاؤ تو ہم اپنی یونٹ میں چلے گئے۔

ہم دس دن تک ڈھاکہ چھاؤنی میں ہی رہے۔اس دوران قادر بھی مجھ سے آن ملا اور اسے سی۔او نے کاغذوں میں ہیڈکوارٹر کمپنی کے او۔سی OC کے بطور شامل کر لیا۔ہم سے کہا گیا کہ اپنے ساتھ تھوڑے سے کپڑے اور پرسنل کٹ لے لیں۔ جو افسر میس میں رہ رہے تھے انہوں نے اپنے ساتھ کافی سامان رکھ لیا۔ بسوں میں بہت سے لوگوں کو ٹھونس کر نرائن گنج لایا گیا۔ وہاں اسٹیمر تیار کھڑے تھے اور ان میں

ہمیں بٹھایا گیا۔گنجائش کی کمی کے باوجود ہماری پوری بٹالین کو ایک ہی اسٹیمر میں سوار کیا گیا۔ پورا دن چلنے کے بعد ہم فرید پور کی جیٹی پہنچے۔ وہاں سے تین میل پیدل چل کر ہم فرید پور پہنچے۔اسٹیشن پر ہمارے بہت سے باورچی کھانا پکا رہے تھے اور ہر ٹرین میں بانٹنے کے لیئے الگ الگ جگہ پر رکھ رہے تھے۔ٹرین میں سوار ہونے سے پہلے ہمیں دال اور روٹیاں دی گئیں۔دال ایک بڑے دیگچے میں اور روٹیاں کٹ بیگ میں ڈال لیں۔ ہم تقریباً 17 افسر تھے جنہیں فرسٹ اور سیکنڈ کلاس کمپارٹمنٹوں میں گنجائش سے زیادہ جگہ پر بٹھایا گیا۔قادر ہم جونیئر افسروں کے ہی ساتھ تھا جبکہ باقی میجر اور کرنل کیانی دوسرے کمپارٹمنٹ میں تھے۔ڈبے مقفل کرنے کے علاوہ باہر خاردار تاریں لگا دی گئیں تھیں۔سوار ہونے سے پہلے ہر ایک سے کرنسی لے کر جمع کر لی گئی۔ڈھاکہ میں میں نے اپنا ریڈیو ایک ہندوستانی سپاھی کے ہاتھ 100 روپوئں میں بیچ دیا تھا اور آدھے پیسے قادر کو دے دیئے تھے۔ میں نے پیسے جرابوں کے اندر چھپا لیئے تھے۔

ہمیں بتایا گیا کہ دو دن کا سفر ہے۔دوسرے دن چونکہ دیئے گئے کھانے میں سڑاند پڑ گئی تھی اس لیئے ڈیری آن سون ریلوے اسٹیشن پر گاڑی روک کر کھانا پکوایا گیا اور ڈبے کے اندر ہی ہمیں دے دیا گیا۔ٹرین کا انچارج میجر شرما تھا جس نے ہمارے ڈبے کے پاس آ کر کہا کہ خبردار جو کسی نے بھاگنے کی کوشش کی ورنہ ہم برا سلوک کریں گے۔ کہنے لگا کہ تم نے دیکھ لیا ہے کہ ہماری فوج تم سے کتنی بہتر ہے۔اس پر ہم نے کہا کہ حالات کی وجہ سے ہم ہارے ہیں ورنہ تمہیں بخوبی معلوم ہے کہ تم ہم سے مقابلہ نہیں کر سکتے۔اس نے جواب میں کہا کہ اگر ایسا ہے تو آپ میں سے کوئی مجھ سے باکسنگ کا مقابلہ کر لے۔ اس نے بتایا کہ وہ انڈین آرمی کا باکسنگ چمپیئن رہ چکا ہے۔اس پر قادر نے کہا کہ مجھے تمہارا چیلنج قبول ہے جس پر اس

نے اگلے اسٹیشن پر مقابلہ کرنے کا کہا۔ دو چار اسٹیشن گذرنے کے باوجود وہ نہ آیا۔ ایک اسٹیشن پر جو گاڑی رکی تو وہ آیا اور ہم سے شیونگ بلیڈ مانگا اور ساتھ ہی بدلے میں کیلوں کا ایک گچھا آفر کیا اور قادر سے کہا کہ تم خطرناک آدمی لگتے ہو تمہیں ہتھکڑی لگانی پڑے گی۔

بریلی پہنچے تو ہم کو نیچے اتارا گیا۔ وہاں پتا چلا کہ ہماری ٹرین سے یونٹ کا لانس نائیک الیاس غسل خانے کے کموڈ کے نٹ کھول کر فرار ہوگیا ہے۔ یہ جان کر انڈینز نے اس ڈبے کے جوانوں کو نیچے اتار کر فیلڈ ٹیلیفون کی تاروں سے بنے ہوئے ہنٹروں سے مارنا شروع کر دیا۔ ہم نے کرنل افضل سے کہا کہ ان لوگوں کو روکیں جس پر وہ بولے کہ وہ نہ بھاگتے میں کیا کروں اب مار کھائیں۔ میجر سلام اٹھے اور ان سے اونچی آواز میں غصے سے ان کو مار روکنے کا کہا۔ اور کہا کہ یہ جینیوا کنونشن کی خلاف ورزی ہے۔ میجر شرما آیا اور اس نے مار رکوا دی۔

یہاں سے ہمیں کیمپ 58 میں شفٹ کر دیا گیا۔ ہم سے پہلے 6 لائٹ۔ ایک۔ ایک 6LAA کے CO سی۔ او کرنل افضل اور ان کی یونٹ کے افسروں سمیت کافی افسر وہاں موجود تھے۔ کیمپ کمانڈنٹ بی۔ ایس۔ ایف BSF کا میجر آلو والیہ تھا۔ وہ انگریزی میں بالکل پیدل تھا صبح شام ہمیں فالن کر کے گنتی کی جاتی اور اس کے بعد وہ اپنی سختی دکھانے کے لیئے مختلف کیمپ آرڈر سناتا جس سے ہم بہت محظوظ ہوتے۔ ہمارے پاس کوئی برتن نہیں تھے اس لیئے ایک اخبار پر چپاتی رکھ کر اسکے اوپر سالن ڈلوا لیتے تھے۔ بعد میں جب ہمیں دوسری بیرک جسے ہم نے وائٹ ہاؤس کا نام دیا ہوا تھا شفٹ کیا گیا تو 6 لائٹ ایک ایک 6 LAA کے افسروں نے ہمیں ایک ایک پلیٹ اور مگ دیا۔ میں کبھی کبھی رات کو اٹھ کر شرارتاً نعرہ لگا دیتا جس پر سنتری سیٹیاں بجاتے اور شور شرابا کرتے اور ہمیں فالن کر لیتے۔ اس

پر میں نے بھائی سے ڈانٹ بھی کھائی ۔ ساتھ والے کیمپ میں ہمیں فلم دکھانے لے گئے تو راستے میں ہم نے بھاگنے کے مواقع کا جائزہ لیا۔کیمپ کے اردگرد کانٹے دار تاروں کی دوہری باڑ تھی جس کے درمیان میں سنتری اور کتے گشت کرتے رہتے تھے ۔اوپر ٹاور میں کھڑے سنتریوں کے پاس گز گز بھر لمبی ٹارچیں ہوتی تھیں ۔کیمپ کے ہر کونے پر سرچ لائٹیں لگی ہوئی تھیں ۔ رفع حاجت کے لیئے لمبے لمبے گڑھے کھود کر اوپر تختے رکھ دیئے گئے تھے ۔ان تختوں میں وقفے وقفے پر سوراخ تھے جو ہماری طبع آزمائی کے لیئے استعمال ہوتے تھے ۔فروری کی سخت سردی میں کھلی ہوا میں لگے ایک نلکے کے نیچے بیٹھ کر نہانا پڑتا تھا۔

ریڈ کراس کی ایک ٹیم آنے والی تھی اس لیئے مہینے بعد کیمپ میں گنجائش سے بہت زیادہ افسر ہونے کی وجہ سے ہم میں سے چالیس افسروں کو میرٹھ میں واقع ایک دوسرے کیمپ میں شفٹ کرنے کا پلان بنا اور رضا کارانا طور پر جانے والے افسروں کے نام مانگے گئے ۔ساتھ والے کیمپ سے بھی 20 افسر جانے تھے ۔قادر نے باری باری سب کو ساتھ جانے کی ترغیب دی کیونکہ اس کے خیال میں سفر کے دوران فرار کے اچھے مواقع مل سکتے ہیں ۔گو جانے کے لیئے 40 افسر تیار ہو گئے لیکن ان میں سے صرف 12 ہی کسی فرار کی کوشش میں شمولیت پر آمادہ ہوئے ۔کرنل افضل کیانی کی خواھش تھی کہ اس کی یونٹ سے کوئی بھی نہ جائے لیکن اس کے باوجود سگنل کے پانچ افسروں نے اپنے نام دے دیئے۔

ہمیں لیجانے کے لیئے دو بسیں منگوائی گئیں ۔ چونکہ ہر ایک میں 30,30 سواریوں کی گنجائش تھی اس لیئے ہمارے کیمپ کے دس افسروں کو دوسری بس میں بھیجنے کے لیئے الگ کیا گیا تو ہمارا گروپ ایک طرف ہو گیا جسے انہوں نے دوسری بس میں جانے کے لیئے الگ کر دیا۔ اس طرح فرار کے منصوبے میں شامل 5

افسروں کے بغیر ہم دوسری بس میں چلے گئے جہاں پہلے سے ساتھ والے کیمپ کے افسر بیٹھے تھے۔ ہندوستانیوں کا ارادہ صبح سویرے نکلنے کا تھا تاکہ سورج غروب ہونے سے پہلے منزل پر پہنچ جائیں لیکن چند وجوہات کی بنا پر وہاں سے دوپہر کو نکلے۔ بس کی بالکل پچھلی سیٹوں پر 4 ہندوستانی بیٹھے تھے۔ ان میں ایک جے۔سی۔او JCO اور ایک نائیک Naik تھا باقی دونو عمر سپاہی تھے۔ ان سب کا تعلق کماؤں Kamaon رجمنٹ سے تھا۔ دونوں بسوں کا انچارج کیپٹن لیمبو اگلی بس میں تھا۔ ان سے اگلی سیٹ پر میں اور کیپٹن عزیز کے علاوہ کیپٹن آفتاب بیٹھے تھے۔ چونکہ ہمیں بعد میں بٹھایا گیا تھا اسلیئے ہمارے کیمپ کے افسروں کو پچھلی سیٹیں ملیں۔ قادر مجھ سے دو سیٹیں آگے بیٹھا تھا۔ بس کے ڈرائیور سے پچھلی سیٹ پر تین گارڈ بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے ساتھ والی سیٹ پر ہمارے دو کرنیل تھے۔ جب بس ایک ایسی جگہ پہنچی جہاں سے جی۔ٹی روڈ سے میرٹھ جانے والی سڑک الگ ہوتی تھی تو چائے پلانے کے لیئے ہمیں بس سے نیچے اتارا گیا۔ وہاں سے میرٹھ کا فاصلہ تقریباً 35، 40 منٹ کا رہ گیا تھا۔ اس جگہ قادر نے دوسرے کیمپ سے آئے ہوئے افسروں کو فرار کے منصوبے میں شمولیت کے بارے میں باری باری پوچھا تو ان میں سے صرف پانچ نے آمادگی کا اظہار کیا۔ کیپٹن فاروق ہماری بس سے دوسری بس میں چلا گیا اور وہاں سے سگنل کا کیپٹن مقبول ہماری بس میں آ گیا۔ آہستہ آہستہ شام پڑ رہی تھی اور سورج نیچے جا رہا تھا۔ قادر نے سکھ ڈرائیور سے کہا کہ بس بہت تیز چلا رہے ہو اور بس سڑک ناہموار ہونے کی وجہ سے اچھل رہی ہے جس کی وجہ سے کچھ افسروں کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ اس نے بس آہستہ کی تو اگلی بس آگے نکل گئی۔ جیسے ہی مجھے قادر کا اشارہ ملا تو میں نے مڑ کر دیکھا تو ہمارے پیچھے ایک بس آ رہی تھی۔ میں نے اٹھ کر زور سے کہا کہ پیچھے آنے والی بس الٹ گئی ہے۔ جونہی سنتریوں نے پیچھے مڑ کر

دیکھا میں نے اللہ اکبر کہا اور جے۔سی۔او کو پکڑ لیا۔ دوسرے دو افسروں نے بھی سنتریوں پر حملہ کر دیا۔ میں نے جے۔سی۔او سے اسٹین چھین لی۔ بس میں بھگدڑ مچ گئی۔ بس رکی تو میں جے۔سی۔او سے لڑ رہا تھا کیونکہ وہ مجھ سے گن چھیننے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے پیچھے سے کسی کا دھکا لگا تو ہم دونوں بس سے نیچے گر گئے۔ لڑتے ہوئے مجھے سٹین گن کی نالی لگی جس سے میرے ماتھے سے خون بہنا شروع ہو گیا۔ جے۔سی۔او نے شور مچاتے ہوئے نائیک سے کہا کہ اسے مار دو اسے مارو۔ وہ دوڑتا ہوا آیا اور میری ران کے اوپر والے حصے پر بینٹ bayonet مارا۔ جے۔سی۔او نے اسے کہا کہ اس پر فائر کرو لیکن جونہی وہ فائر کرنے کی کوشش کرتا میں جے۔سی۔او کو اپنے آگے کر لیتا۔ اس اثنا میں میں نے بس میں بیٹھے ہوئے اپنے کورس میٹ کیپٹن انعام کو آواز دیکر کہا کہ مجھے بچاؤ۔ کیپٹن انعام نے نائیک کو پیچھے سے پکڑا تو میں نے جے۔سی۔او کو ایک دو لاتیں ماریں تو وہ گر گیا اور میں سٹین گن لے کر بس کے دوسری طرف آیا اور بھاگ پڑا۔ کیپٹن انعام سنتری کو چھوڑ کر خود واپس بس میں بیٹھ گیا۔ وہ سنتری اور ایک اور سپاہی میرے پیچھے بھاگے تو انہیں دیکھ کر میں نے سٹین گن ساتھ ہی ایک چھوٹے سے تالاب میں پھینک دی۔ فوج میں اپنا ہتھیار بہت اہم ہوتا ہے اس لیئے دونوں اسے اٹھانے کے لیئے مڑے تو کیچڑ کی وجہ سے اسے جلدی نہ نکال سکے اور مجھے ان سے دور ہونے کا موقع مل گیا۔ میں گنے کے کھیتوں کی طرف جا رہا تھا۔ تقریباً تین سو گز کا فاصلہ طے کیا تو پیچھے سے آواز آئی کہ رحمان واپس آ جاؤ۔ میں نے خیر واپس تو نہیں جانا تھا آگے چلتا گیا۔ پیاس سخت لگی تو گنے کے کھیتوں میں موجود پانی سے اپنی پیاس بجھائی۔ آگے آیا تو کیپٹن ارشاد مرزا جا رہا تھا۔ اس نے کیا تو کچھ نہیں تھا۔ آگے بیٹھا ہوا تھا اور موقع پا کر گاڑی سے نیچے اتر کر بھاگ پڑا۔ وہ اسی طرف بھاگا جس طرف میں آیا تھا۔ میں خوش تھا کہ

مجھے ساتھ مل گیا ہے۔اکیلا رہنے سے اب صورت حال بہت بہتر ہوگئی تھی۔ ہمارے آگے ایک بڑی نہر آگئی۔ارشاد سے پوچھا کہ کیا اسے کراس کرلو گے تو اس نے نفی میں جواب دیا۔وہاں سے ہم واپس چل پڑے۔سخت اندھیرا پڑ چکا تھا اور ہم آہستہ آہستہ چلتے ہوئے واپس اسی سڑک پر آگئے۔بس کو دیکھا تو اس میں سے بہت شور کی آوازیں آرہی تھیں۔میرے زخم اب ٹھنڈے ہورہے تھے اور درد بھی ہورہا تھا۔ پتلون ٹانگ کے ساتھ چپک گئی تھی۔ہم نے سڑک عبور کرکے چلنا شروع کردیا۔ رات دس بجے جب سخت سردی لگی تو ایک جگہ گھاس پھونس اور فصلوں کے باقیات کو آگ لگا کر تھوڑی دیر اسے تاپا اور پھر چل پڑے۔دو بجے کے قریب ایک جگہ روشنی نظر آئی تو پاس چلے گئے۔وہاں گنے کے ایک کھیت میں گنے سے گڑ بنانے والے کچھ مزدور ایک جونپڑی میں سوئے ہوئے تھے اور اپنے کپڑے ساتھ ہی لٹکائے ہوئے تھے۔ایک چادر اور کچھ کپڑے چرائے۔اپنی قمیضیں اتار کر وہ کپڑے پہن لیئے۔۴ بجے کے قریب ایک ریلوے لائن نظر آئی۔اس کے ساتھ ساتھ چلے تو پانچ بجے کے قریب ایک چھوٹے سے ویران اسٹیشن پر پہنچے۔وہاں کوئی آدمی نہیں تھا۔تھوڑی دیر وہاں بیٹھے۔دور ایک روشنی نظر آئی تو لگا کہ کوئی بس یا ٹرک جارہا ہے۔اس سے اندازہ ہوا کی یہ وہی سڑک ہے جس سے میرٹھ جانے والی سڑک الگ ہوئی تھی۔ ہم اس طرف چل پڑے اور تقریباً چھ بجے ہم جی ٹی روڈ پر آگئے۔

ایک جگہ کچھ لوگ آگ تاپ رہے تھے ہم بھی رام رام کرکے ان کے پاس بیٹھ گئے اور ان سے کہا کہ ہم فوجی ہیں اور صبح یونٹ پہنچنا ہے۔آپ لوگ جانے کا کوئی ذریعہ بتائیں۔انہوں نے کہا کہ ابھی ہمارا ٹرک جمنا سے ریت لے کر آئیگا آپ بھی اس میں بیٹھ جانا۔دراصل ہمیں معلوم نہیں تھا کہ دہلی کس طرف ہے اس کے بارے میں ان سے بات چیت میں پتا لگ گیا۔سڑک کے ساتھ دو تین میل چلنے کے

بعد ایک چھوٹی سی ویران مسجد نظر آئی تو تھوڑی دیر اس میں بیٹھے اور پھر باہر نکل کر سڑک پر آ گئے ۔ ایک بس نظر آئی ، اسے اشارہ دیکر روکا اور چھ روپے کے دو ٹکٹ لے کر اس میں بیٹھ گئے ۔ دو میل آگے ہاپڑ کا شہر آ گیا۔ وہاں ہم نے چار چار آنے کی چائے اور رس لیئے کیونکہ سخت بھوک لگ رہی تھی ۔ بس جب شہر سے باہر نکلی تو وہاں چیکنگ ہو رہی تھی اور ساری ٹریفک رکی ہوئی تھی ۔ کنڈیکٹر نیچے اتر کر واپس آیا اور بتایا کہ بہت سے پاکستانی قیدی بھاگ گئے ہیں انہوں نے یہاں بہت لڑائی کی ہے اس لیئے چیکنگ ہو رہی ہے ۔ ہمارے کان کھڑے ہو گئے ۔ ارشاد نے تقریباً سولین کپڑوں کے اوپر پرائیویٹ جرسی پہنی ہوئی تھی اور وہ فوجی نہیں لگ رہا تھا لیکن میں نے فوجی پتلون جو ٹانگوں سے چپک گئی تھے پہنی ہوئی تھی ۔ اسکے علاوہ میرے پاؤں میں فوجی بوٹ تھے ۔ میں نے اپنے گرد چادر لپیٹ لی ۔ جہاں بینٹ bayonet لگا تھا وہاں پینٹ خون بہنے کی وجہ سے ٹانگ کے ساتھ چپک گئی تھی ۔ انہوں نے کہا کہ نیچے اتر جاؤ۔ عورتوں کے علاوہ سب نیچے اتر گئے ۔ ہمیں ڈر تھا کہ نیچے اترے تو پکڑے جائینگے اس لیئے میں بیماروں جیسا منہ بنا کر ایک طرف جھک کر بیٹھ گیا اور ہم عورتوں اور بچوں کے ساتھ اندر ہی بیٹھے رہے ۔ بس میں آ کر ایک سپاہی نے پوچھا کہ کہاں سے آئے ہو ۔ ہم نے کہا بریلی سے ۔ اس نے پوچھا کیا ہوا ہے ۔ ارشاد نے کہا کہ میرا ساتھی بیمار ہے اسے لیکر جا رہا ہوں دوائی کے لیئے ۔ ہم نے کوئی اور بات نہیں کی اور اس کو اپنے ٹکٹ دکھائے تو اس نے مزید کچھ نہ پوچھا اور بس سے نیچے اتر گیا اور بس چل پڑی ۔

دس بجے کے قریب ہم لال قلعے کے پاس اترے ۔ سامنے ایک ٹیکسی کھڑی تھی اسے کہا کہ کسی سرائے میں لے چلو اس نے پوچھا کون سی سرائے تو ہم نے کہا کہ نئ دہلی میں کسی بھی سرائے میں لے چلو ہمیں وہاں کوئی کام ہے ۔ اس نے ہم سے پانچ

روپے لیئے اورنئ دہلی کی ایک سرائے میں لے گیا۔ سرائے والوں سے کہا کہ ہم نے رات کوٹھہرنا ہے انہوں نے کہا کہ دو دو روپے میں چارپائیاں دیں گے جب مرضی ہو آکر سو جانا۔ سرائے کے باہر ایک کباڑی سے پینٹ اور شرٹ کے علاوہ ربڑ کے جوتے لیئے۔ واپس آنے لگے تو پاس ہی پنجاب ہوٹل نظر آیا۔ میرے پاس کوئی تیس پینتیس روپے تھے ارشاد مرزا سے کہا کہ اگر ہوٹل میں کوئی سستا کمرہ مل جائے تو رات ادھر ہی ٹھہرتے ہیں۔ وہاں ایک سکھ بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے پوچھا کہاں سے آئے ہو۔ ہم نے کہا بریلی سے آئے ہیں ہمارے پاس کچھ نہیں ہے مزدوری کرنی ہے ۔اس نے کہا کہ میں ہوٹل بنا رہا ہوں وہاں تمہیں کام بھی مل جائیگا اور چارپائی دے دوں گا اور ادھر ہی سو جانا کیونکہ تم کہہ رہے ہو کہ ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔ ہم مان گئے تو وہ ہمیں ساتھ لے جاکر عارضی سیڑھیوں سے ہوتے ہوئے ایک کمرے میں لے گیا اور کہا کہ یہاں آرام کرو۔ وہ خود نیچے اتر گیا۔ ارشاد نے باتھ روم جانا تھا وہ ادھر چلا گیا۔ میں نے ساتھ ایک سٹور میں کپڑے بدلائے اور چادر پھاڑ کر ٹانگ پر پٹی باندھی اور اپنے اتارے ہوئے کپڑے سیمنٹ کی بوریوں کے نیچے چھپا دیئے۔ کمرے میں واپس گیا تو دیکھا کہ سکھ واپس آ گیا تھا اور اس کے ہاتھ میں میرا خون آلودرومال تھا۔ اس نے پوچھا کدھر سے آئے ہو اور یہ خون کہاں سے نکلا ہے۔ میں نے کہا کہ یار بتایا ہے نا کہ ٹرین سے اترنے لگا تو کسی نے دھکا دیا تو میں گرا اور گاڑی کے ساتھ لگا ایک کنڈا لگا اور خون نکل آیا۔ اس نے پوچھا کہ تمہارے کپڑے کہاں ہیں جو تو نے بدلائے ہیں۔ میں نے کہا کہ وہ ادھر پڑے ہیں حالانکہ میں نے کپڑے بوریوں کے نیچے چھپائے تھے۔ اس نے کہا کہ چل دکھا۔ میں اس کے ساتھ گیا۔ اس نے میرے بوٹ اور کپڑے دیکھے تو کہنے لگا کہاں سے آئے ہو اور کیا کوئی واردات کر کے آئے ہو۔ اس اثنا میں ارشاد واپس آ گیا۔ اس نے سمجھا

کہ اسے سب کچھ پتا لگ گیا ہے۔ وہ ہاتھ جوڑ کر روتے ہوئے سکھ سے کہنے لگا کہ سردار جی آپ کو سب کچھ پتا لگ گیا ہے ہماری مدد کرو۔ سکھ نے مجھے کہا تو ٹھہر جا بتا کیا کیا ہے تم نے؟ کیا ہوا ہے اور کیوں مدد مانگ رہے ہو؟ اس نے مجھے کہا تم بولنا نہیں۔ لیکن میں نے کہا کہ یار بتایا تو تھا کہ میں گر گیا تھا اور مجھے چوٹ لگی ہے اور کیا ہوا ہے۔ ارشاد مرزا کو پتا لگ گیا کہ بات ابھی نکلی نہیں ہے تو وہ بھی اسی بات پر اڑ گیا کہ ہمیں نوکری دو ہماری ضرورت ہے۔ اس نے بہت کوشش کی لیکن ہم نے اسے مزید کچھ نہیں بتایا۔ اس نے کہا کہ یہاں سے ہلنا نہیں میں ابھی آتا ہوں اور سیڑھیوں سے نیچے اتر گیا۔ ارشاد سے کہا کہ یہاں سے نکلو ورنہ پکڑے جائیں گے۔ ہم ٹوٹی پھوٹی سیڑھیوں سے تیزی سے اتر کر بھاگ پڑے۔ سکھ نے ہمیں دیکھا تو اس نے شور مچا دیا کہ ان کو پکڑو۔ ہم بھاگ کر سامنے ایک گلی میں گھس گئے۔ پیچھے سے پکڑو پکڑو کی آوازیں آتی رہیں اور ہم سرپٹ گلیوں کے اندر جہاں جگہ ملی بھاگتے رہے۔ یہ تو شکر ہے کہ کسی بند گلی میں نہیں گھسے ورنہ پھنس جاتے۔

خوش قسمتی سے جب گلیوں سے باہر نکل کر سڑک پر پہنچے تو ایک رکشا نظر آیا۔ ہم دوڑ کر اس میں بیٹھ گئے۔ اس نے پوچھا تو اسے کہا کہ جلدی کر ہم نے نیو دہلی ریلوے اسٹیشن جانا ہے جس کا ہمیں پتا تھا۔ اترے تو دیکھا کہ ہمارے پیچھے کوئی نہیں آ رہا تھا۔ ہمارے پاس پیسے تھوڑے تھے اس لیئے کسی سے پوچھا کہ پانی پت اور جالندھر کا ٹکٹ کتنے کا ملے گا۔ جالندھر کا ٹکٹ لے لیا۔ ٹرین رات کے دو بجے جانی تھی۔ ہم ریلوے سٹیشن پر ہی پھرتے رہے۔ جب ٹرین آئی تو اس میں سوار ہو کر اوپر برتھ پر چڑھ کر لیٹ گئے۔ اسٹیشن سے جو چنے لیئے تھے وہ کھائے اور سو گئے۔ صبح ہم پانی پت پہنچے جہاں کچھ فوجی بھی ہمارے ڈبے میں سوار ہو گئے۔ ان کے ساتھ ایک افسر بھی تھا جس کے ہاتھ میں اخبار تھی۔ ہم نے نیچے جھانک کر دیکھا تو اس پر لکھا تھا

کہ سات قیدی فرار ہوئے جن میں سے پانچ پکڑے گئے ہیں اور دو ابھی تک مفرور ہیں۔ تفصیل تو نہ پڑھ سکے لیکن وہ اس کے متعلق گفتگو کرتے رہے۔ کہنے لگے اوئے یہ دیکھو لکھا ہے قیدی بھاگ گئے ہیں۔ بھاگ کر کہاں جائیں گے۔ ہوسکتا ہے وہ اسی ٹرین یا اس سے کسی پچھلی ٹرین میں سفر کر رہے ہوں گے کیونکہ پاکستان کی طرف جانے کے لیئے یہی ٹرین ہے۔ہم چپ سادھ کر لیٹے رہے۔ جالندھر آیا تو وہ ٹرین سے اترے تو ہم بھی چپ کر کے اتر گئے اور پیدل چل پڑے۔ایک آدمی سے شہر کا راستہ پوچھا۔ملٹری پولیس کے جوان ادھر ادھر پھر رہے تھے۔ یہ ملٹری کنٹونمنٹ تھی جہاں ہر طرف فوجی نظر آئے۔ ہم بالکل فوجی نظر نہیں آرہے تھے۔شہر پہنچے تو پیسے ختم ہوچکے تھے۔ ارشاد مرزا کے پاس منگنی کی انگوٹھی اور ایک ہار تھا۔اسے کہا کہ اب ہمارے پاس کچھ نہیں ہے اپنی سونے کی انگوٹھی بیچ دو۔ سنار نے رسید مانگی جو ہم نے کہا کہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ پتا لگا کہ انڈیا میں بغیر رسید کے سونا بیچا نہیں جا سکتا۔اس نے ہمیں تھوڑے پیسے دینے کا کہا اور آخر کار 60 روپے دیکر انگوٹھی رکھ لی جو کافی موٹی تھی۔ایک دکان سے اٹلس لی۔ ایک ہوٹل میں گئے تو اس نے رات ٹھہرنے کے پندرہ روپے لیئے۔ وہاں ہم نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا کیونکہ ہم نے کئی وقت کا کھانا نہیں کھایا تھا۔گوشت روٹی تھی جو ہم نے کھائی اور سو گئے۔ یہاں سے ہم نے جموں جا کر وہاں سے بارڈر کراس کرنے کا ارادہ کیا اور سوچا کہ اگر وہاں سے نہ جاسکے تو سرینگر چلے جائینگے۔

جموں جانے والی ایک بس میں سوار ہوئے۔ سامبا کے قریب بہت زیادہ فوجی نظر آئے۔توی بس سٹاپ پر اترے۔ وہاں سے جموں کوئی ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر تھا۔توی دریا کے ساتھ ساتھ دو تین گھنٹے چلے تو فوجیوں کی بہت سی پوسٹیں نظر آئیں۔ نقشے سے ایک گاؤں کا نام یاد کیا تھا۔ایک جگہ ایک دو فوجی سنتریوں نے

پوچھا کہ کدھر پھر رہے ہو تو انہیں پہلے سے سوچ رکھا جواب دیا کہ ہم بمبئی سے وہاں کسی رشتہ دار سے ملنے آئے ہیں۔اس پر انہوں نے بتایا کہ سارے گاؤں خالی پڑے ہیں اور اس علاقے میں اب سویلین نہیں رہے۔تم واپس چلے جاؤ۔ کیونکہ بارڈر پر فوج بہت زیادہ تھی اس لیئے ہم پیدل چلتے ہوئے جموں پہنچ گئے۔ جموں شہر چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں پر واقع ہے۔ہمیں لوگ بڑے غور سے دیکھتے تھے۔زیادہ تر مقامی لوگ پوٹھوہاری بول رہے تھے جو میرے آبائی علاقے راولپنڈی میں بھی بولی جاتی ہے۔ہم بیٹھے تو ایک دو آدمی بہت آگے پیچھے ہونے لگے تو میں نے ارشاد سے کہا کہ یہاں سے فوراً نکلتے ہیں اور سری نگر چلتے ہیں۔بس کے کاؤنٹر پر گئے تو پتا لگا کہ سرینگر جانے والی سڑک لینڈ سلائڈنگ کی وجہ سے بند ہے۔جیسا کہ قادر کا پلان تھا نیپال جانے کے لیئے تلوٹی جانے کا سوچا۔ہم نے جو اٹلس لی تھی اس کو اچھی طرح سٹڈی کیا تھا۔لدھیانے کا ٹکٹ لیکر ایک بس میں بیٹھ گئے۔جالندھر پہنچے تو ہمارے پاس صرف دو روپے رہ گئے تھے۔شاہجہان پور جانا تھا لیکن پیسے کم تھے اس لیئے نجیب آباد کا ٹکٹ لیا۔ ہمارے پاس آٹھ آنے رہ گئے تھے۔ہم صبح بارہ بجے لدھیانہ پہنچے تھے۔فروری کا مہینہ تھا سخت سردی تھی۔ جالندھر سے ایک کمبل خریدا تھا جس کی وجہ سے پیسے کم ہو گئے تھے۔ارشاد نے وہ کمبل لپیٹا ہوا تھا۔ مجھے سردی لگی تو ایک ہندو کے پاس جو آگ تاپ رہا تھا جا کر بیٹھ گیا۔لیکن اس نے مجھے گالیاں نکالیں اور دو تین دفعہ کہا کہ یہاں سے ہٹ جا۔ میں بھی ڈھیٹ بن کر بیٹھا رہا تو وہ انگیٹھی اٹھا کر چل دیا۔اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ مسلمان ہے۔ میں ارشاد کے پاس واپس آ گیا۔ارشاد نے کہا کہ سخت بھوک لگی ہے اور مجھے بخار ہے کچھ کھانے کو لا دو۔ میں آٹھ آنے لیکر ایک دودھ والے کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ آٹھ آنے کا دودھ دو۔ وہ حیرانگی سے مجھے دیکھنے لگا اور کہا آٹھ آنے کا؟ اور پھر پاس ہی کھڑے ایک

پولیس والے سے کہا کہ یہ آٹھ آنے کا دودھ مانگے ہے۔ اس کو یہ پتا نہیں کہ یہ کیا ہے۔ میں نے کہا کہ غلطی سے میرے منہ سے نکل گیا ہے پچاس پیسے کا دو۔ پولیس سپاھی نے مجھے گردن سے پکڑا اور ایک طرف اندھیرے میں لے جا کر کہا تمہیں پتا نہیں کیا یہ آٹھ آنے ہیں تو آیا کہاں سے ہے؟ میں نے کہا منہ سے نکل گیا یہ پچاس پیسے ہیں۔ آٹھ آنے چھین کر اس نے مجھے ایک تھپڑ رسید کیا اور مجھے چھوڑ دیا۔ واپس آ کر ارشاد مرزا سے کہا کہ کوئی دودھ ووودھ نہیں ہے پولیس والے نے مجھ سے پیسے چھین لیئے ہیں۔

سخت سردی میں بیٹھے رہے۔ فقیروں کو گودڑی میں لیٹے دیکھا۔ سوچا یہ بھی عیاشی ہے کس مزے سے سوئے ہیں۔ ہمارے بس میں اتنا بھی نہیں کہ ان گودڑیوں میں گھس جائیں جن میں یہ لوگ سوئے ہوئے ہیں۔ ساری رات اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر بیٹھے رہے۔ صبح دفتر کھلے تو سوپر وغیرہ انگیٹھیاں گرم کرنے لگے۔ میں بھی ان میں شامل ہوا تو کہنے لگے کہ تم ادھر جا کر جلاؤ۔ ایک گھنٹے کے بعد دفتر میں ایک مینجر آ کر بیٹھی تو اس نے کہا کہ جاؤ فلاں کو بلا کر لاؤ۔ میں نے ادھر جا کر اسے کہا کہ بیگم صاحبہ بلا رہی ہیں۔ اس طرح ایک آدھ گھنٹہ گذارا۔ سردی کی وجہ سے آگ کی تپش بہت ضروری تھی۔ اس کے بعد تقریباً گیارہ بجے ٹرین آئی تو ہم اس میں بیٹھے۔ ہمارا خیال تھا کہ سفر دو تین گھنٹے کا ہے لیکن یہ چھ سات گھنٹوں کا تھا۔ ہمارے پاس کھانے کو کچھ نہیں تھا تین چار گھنٹے بھوکے بیٹھے رہے۔ کئی سواریاں آئیں اور اتریں۔ اس ڈبے میں ایک آدمی اور برقعہ پہنے اس کی بیوی اور بچہ بھی سوار تھے۔ وہ کافی دیر سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ ہم زیادہ باتیں بھی نہیں کر رہے تھے کہ کوئی ایسی بات منہ سے نہ نکل جائے جس سے کسی کو شک پڑے اور ہم پکڑے جائیں۔ اس عورت نے اپنے خاوند کے کان میں کچھ کہا۔ اس نے صندوق میں سے

ایک ڈبہ نکالا اور اس میں سے مٹھائی نکال کر ہمیں پیش کی۔ مٹھائی کے دو دو ٹکڑے نکال کر کھا لیئے اور ان کا شکریہ ادا کیا۔ انہوں نے پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو۔ نجیب آباد کا بتایا تو انہوں نے کہا ہم بھی وہیں جا رہے ہیں کسی دوست سے ملنے پتا نہیں کہ ملے گا یا نہیں۔ وہ اترے تو ہمیں بھی اندازہ ہو گیا کہ یہی نجیب آباد ہے اور ٹرین سے اتر کر بازار کا رخ کیا۔

ارشاد مرزا سے کہا اب ہمارے پاس اور کچھ نہیں ہے تم اپنا ہار بیچو کیونکہ ہم نے ابھی اور آگے جانا ہے۔ شہر چھوٹا سا تھا جہاں عام دیہاتی قسم کے ایک سنار کو ارشاد کا ہار دکھایا تو اس نے رسید مانگی۔ ہمارے کہنے پر کہ رسید نہیں ہے اس نے ہمیں بہت کم پیسے دیئے۔ شاید ستر روپے۔ شاہجہان پور کا ٹکٹ لیا جو اب زیادہ دور نہیں تھا۔ شام کو ٹرین آئی تو اس میں بیٹھ گئے۔ ہمیں اوپر کی برتھ مل گئی۔ نیچے بہت سے لوگ تھے لیکن ہم نے ان سے بات نہیں کی۔ سخت تھکے ہوئے تھے اس لیئے کمبل لپیٹ کر سو گئے۔ آنکھ کھلی تو دیکھا کہ ٹرین رکی ہوئی ہے۔ نیچے ایک سوپر سے پوچھا کہ کون سا سٹیشن ہے۔ اس نے کہا ہردوئی ہے بھائی۔ شاہجہان پور کے بارے میں اس نے بتایا کی وہ پیچھے رہ گیا ہے۔ ہم نے کہا کہ ہمارا ٹکٹ شاہجہان پور کا تھا ہم سوئے رہے اور آگے نکل آئے ہیں۔ اس نے سٹیشن سے باہر نکلنے کا ایک چور دروازہ بتایا جہاں سے ہم باہر نکلے۔ ہردوئی بازار جا کر ناشتہ کیا اور نقشے پر نیپال پہنچنے کا راستہ تلاش کیا تو پہلے لکھیم پور آتا تھا۔ وہاں پہنچنے کے لیئے ایک بس میں بیٹھے۔ جس علاقے سے گذر رہے تھے وہاں عجیب قسم کے لوگ تھے۔ کالے کالے اور ان کی زبان بھی کچھ اور تھی اور لباس بھی زیادہ تر کالے رنگ کے تھے۔ بس نے ہمیں چار بجے کے قریب لکھیم پور پہنچا دیا۔ اس سے آگے ہم نے دودھوا جانا تھا جہاں تنگ چوڑائی کی narrow gauge پٹڑی پر ٹرین چلتی تھی۔ ہمیں پتا لگا کہ ٹرین رات

کو 4 بجے جائیگی۔ ہم نے ٹرین کا ٹکٹ لیا اور اپنے آپ کو چھپانے اور وقت گذارنے کے لیئے ایک اوپن ائر سینما گھر میں بارہ آنے کا ٹکٹ لے کر گھس گئے۔ فلم ہمت لگی ہوئی تھی۔ خیر ہمت تو ہماری پہلے ہی بندھی ہوئی تھی فلم ختم ہونے سے پہلے ہی ہم باہر نکل آئے اور جا کر ٹرین میں بیٹھ گئے۔ دودھوا پہنچ کر جب ٹرین رکی تو ہم پٹڑی کے ساتھ ساتھ چل پڑے۔ پٹڑی بہت آگے تک چلی گئی تھی۔ شاید انجن بدلانے کے لیئے اسے آگے تک بڑھایا گیا تھا۔ ہم ٹرین کی ہیڈ لائٹ کی روشنی میں آگے بڑھتے رہے۔ نقشہ دیکھ کر میں نے کہا کہ ہم نے یہاں سے مغرب کی سمت میں جا کر چندن چوکی پہنچنا ہے۔ پٹڑی اونچی تھی لیکن جب پٹڑی ختم ہوئی تو آگے جگہ نشیبی تھی اور ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔ وہاں بہت گھنے درخت اور خاردار جھاڑیاں تھیں جس میں سے گزرنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ ٹرین کی ہیڈ لائٹ بھی بجھ گئی تھی اس لیئے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا اس لیئے ہم دو گھنٹے روشنی ہونے تک ایک اونچی جگہ پر کمبل لپیٹ کے بیٹھے رہے۔ پو پھوٹی تو ایک جنگلی مرغ کی اذان کی آواز آئی۔ اٹھ کر چل پڑے۔ جنگل بہت گھنا تھا جس میں ہم پانی میں شڑپ شڑپ کرتے چلتے رہے۔ کچھ فاصلے پر پانی کم ہوگیا اور تھوڑی دور آگے بالکل ہی ختم ہوگیا اور ساتھ جنگل بھی گھنا نہیں رہا۔ یہاں بے شمار چمپینز یز بندر chimpanzee اور نیل گایوں کے ریوڑ دیکھے۔ ہم نے ہاتھوں میں سوٹیاں اٹھالیں تا کہ ہم جنگلی جانوروں کے خلاف اپنا دفاع کرسکیں۔ دوپہر کو ایک چھوٹے سے گاؤں جس کے گرداگرد جنگلہ لگا ہوا تھا کے پاس سے گذرے۔ چلنے سے پہلے ہم نے بھنے ہوئے چنے لے لیئے تھے وہ کھانے کے لیئے ہم پانی لینے کے لیئے گاؤں کی طرف بڑھے تو ایک آدمی نے آواز دی کہ ادھر مت آنا۔ اس کے کھیتوں میں سبزیاں لگی ہوئی تھیں۔ آگے گئے تو شام کے وقت ایک اور چھوٹا سا گاؤں نظر آیا۔ وہاں نزدیک کوئی آدمی نہیں تھا اس لیئے ہم نے

گوبھی کے دو پھول توڑے اور ان سے اپنی بھوک مٹائی اور نہری کھالوں سے پانی پیا۔ جنگل میں ایک جگہ لکڑیاں اکھٹی کر کے آگ جلائی اور باری باری سوتے رہے اور کبھی دونوں ہی سو جاتے۔ چندن چوکی جانے کے لیئے یہ سیدھا راستہ نہیں تھا۔ صحیح راستہ کسی اور طرف سے جاتا تھا۔ صبح ہوئی تو دوبارہ چل پڑے۔ ایک جگہ ارشاد بیٹھ گیا اور کہنے لگا کہ تم جاؤ میں آگے نہیں جاتا پتا نہیں کدھر لے کر جا رہے ہو اب میں تمہارا ساتھ نہیں دوں گا۔ وہ کچھ زیادہ موٹا تھا اور جان بھی زیادہ نہیں تھی۔ کہنے لگا انڈین جی۔ایچ۔کیو جا کر کہوں گا کہ میں جنگی قیدی ہوں آپ نے میرے ساتھ جو کرنا ہے کر لو۔ میں اس کو چھوڑ کر آگے چل پڑا لیکن دو میل بعد خیال آیا کہ کچھ غلط ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی وجہ سے میں پکڑا بھی جا سکتا ہوں۔ واپس آیا اور اسے کہا کہ میں تمہیں کندھوں پر بٹھا لیتا ہوں لیکن وہ کہنے لگا کہ میں چل لوں گا۔

شام کو کوئی راستہ نظر نہ آیا تو کراس کنٹری cross country جانے لگے البتہ کہیں کہیں چھوٹے ٹریک تھے۔ کسی سے بارڈر تک کا راستہ پوچھا تو اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ ایک چھوٹے سے بچے کو دو روپے دیئے اور اسے کہا کہ ہمیں بارڈر تک پہنچا دو۔ اس نے بارڈر پر پہنچ کر ایک بتی (Border pillar) دکھائی جس پر ایک طرف انڈیا اور دوسری طرف نیپال لکھا ہوا تھا۔ نیپال پہنچنے کے بعد اب ہمیں پکڑے جانے کا کوئی ڈر نہیں تھا۔ راستے میں ایک سائیکل سوار سے منت سماجت کر کے سائیکل پر ارشاد کو بٹھایا اور میں ان کے ساتھ ساتھ بھاگتا رہا۔ دھان گڑھی پہنچے تو ایک چھپر نما ہوٹل میں گئے۔ وہاں کئی آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں ایک آدمی نظر آیا جو شکل سے مسلمان لگ رہا تھا۔ اس نے داڑھی رکھی ہوئی تھی۔ اسے سلام کیا تو اس نے وعلیکم السلام کہا۔ اس کیساتھ تھوڑی دیر باتیں کیں اور کچھ دیر بیٹھنے کے بعد اسے بتایا کہ ہم انڈیا سے آئے ہیں راستہ بھول کر جنگلوں میں مارے

مارے پھرتے رہے ہیں۔ ہمارا سب کچھ گم ہو گیا ہے اور ہمارے پاس کچھ نہیں بڑے سخت بھوکے ہیں اور اگر ہو سکے تم ہمیں کھانا کھلا دو تمہاری بڑی مہربانی ہو گی۔ اس نے ایک پلیٹ دال اور روٹیاں لا دیں جو ہم نے کھائیں۔ اس نے بتایا کہ وہ انڈیا سے آ کر سڑکوں کی مرمت کے چھوٹے موٹے کام لیتا ہے اور کام پورا کر کے واپس چلا جاتا ہے۔ اسے کہا یار تم مسلمان ہو ہماری تھوڑی سی مدد کرو۔ اس نے پوچھا کہ کیا چاہیے۔ ہم نے کہا کہ ہم سخت تھکے ہوئے ہیں اور ہمارے پاس کوئی جگہ نہیں ہے ہم ایکسرسائز پر تھے اور رستہ بھول گئے تھے۔ ہم نے دو دنوں سے کچھ نہیں کھایا اور پاس کچھ بھی نہیں ہمارے سونے کا کوئی بندوبست کر دو۔ اس نے کہا کہ میرے پاس ایک کمرہ ہے لیکن چارپائی ایک ہی ہے۔ ہمیں ہوٹل والے کے پاس لے گیا اس نے کہا کہ چارپائی کے پانچ روپے لگیں گے۔ اس نے پانچ روپے نکال کر اسے دیئے۔ رات کو بات چیت کے دوران اندازہ ہوا کہ یہ شریف آدمی ہے اور ہماری مدد کرے گا۔ ہم نے اسے بتایا کہ ہم انڈیا سے بھاگ کر آئے ہوئے پاکستانی سولین قیدی ہیں ہماری مدد کرو۔ اس نے کہا کہ پانچ میل آگے جاؤ گے تو رائل نیپال آرمی کی ایک یونٹ نظر آ جائے گی۔

صبح ہوئی تو وہ ابھی سویا ہوا ہی تھا کہ ہم ادھر چل پڑے۔ سات بجے کے قریب گیٹ پر پہنچے تو اندر گراؤنڈ میں پریڈ ہو رہی تھے۔ سنتری سے کہا کہ ہم نے ایجوٹنٹ سے ملنا ہے۔ ہماری حالت نہایت خستہ تھی۔ داڑھی بڑھی ہوئی اور میلے کچیلے کپڑوں سے بو آ رہی تھی۔ انہوں نے کہا ادھر سڑک کے پار ایک طرف بیٹھ جاؤ یہاں پریڈ ہو رہی ہے۔ ایک گھنٹہ انتظار کے بعد ایک سمارٹ سا لفٹیننٹ گھورکھا ہیٹ پہنے آیا اور ہم سے اشارے سے پوچھا کہ کیا کام ہے؟ میں نے اس سے انگریزی میں پوچھا کہ کیا تم ہی ایجوٹنٹ ہو تو حیرت سے ہمیں دیکھنے لگا اور کہا کہ کیا کہا؟ میں

نے کہا کہ ہمیں تمہاری مدد چاہیے۔اس نے کہا کہ میں ضرور تمہاری مدد کروں گا جس پر میں نے کہا کہ ہمیں یقین نہیں ہے۔ کہنے لگا میں نے سینڈ ہرسٹ سے کمشن لیا ہے مجھے بتاؤ کیا پرابلم ہے۔اسے بتایا کہ ہم دو پاکستانی افسر ہیں اور انڈیا سے بھاگ کر آئے ہیں۔اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گیئں ۔ کہنے لگا کہ میں نے فرار کے بارے میں کتابوں میں تو پڑھا تھا لیکن آج تمہیں سامنے دیکھ کر یقین نہیں آرہا۔خوش قسمتی سے میرے پاس وار ڈسک war disc تھی ۔میں نے اسے دکھا کر کہا کہ اسے پہچانتے ہو تو اس نے کہا ہاں۔ میں نے کہا تم ہم سے وعدہ کرو کہ ہماری مدد کرو گے۔اس نے کہا کہ سی۔اوCO دھان گڑھی انچلادی (کمشنر) کے پاس گیا ہوا ہے میں اسے فون کرتا ہوں۔اس کے آنے کے بعد ہی تمہارے بارے میں کوئی فیصلہ کیا جائیگا۔اگر وہ تمہاری مدد نہ کر سکا تو میں تم سے یہ وعدہ کرتا ہوں کہ وہ تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کرے گا۔اس نے سی۔او کو ٹیلیفون پر بتایا تو اس نے کہا کہ انہیں بٹھاؤ میں ابھی آتا ہوں۔اس نے باہر ایک ٹینٹ لگا کر ہمیں کرسیوں پر بٹھایا اور چائے بسکٹ پیش کئے اور کہا کہ فی الحال آپکو اندر نہیں لاسکتا۔سی۔او آیا اور ہمیں ملا۔ چونکہ وہ انگلش نہیں جانتا تھا اس لیئے لفٹینٹ نے ہمارے درمیان مترجم کا کام کیا اور اسے آہستہ آہستہ ہماری کہانی سنائی۔اس کے بعد اس نے کہا کہ میں نے انچلادی سے بات کی ہے اور وہ کہہ رہا ہے کہ انہیں میرے پاس لے آؤ۔اس کے بعد وہ ہمیں جیپ میں بٹھا کر کمشنر کے پاس لے گیا۔وہ جس کمرے میں بیٹھا ہوا تھا ایسا لگتا تھا جیسے کوئی دربار لگا ہوا ہے۔ہمیں ریٹائرنگ روم میں بٹھا دیا گیا۔کمشنر ملا تو اس نے بتایا کہ کچھ دیر پہلے آپ لوگوں کو ڈھونڈتے ہوئے یہاں ہندوستانی آئے تھے۔میں نے انہیں کچھ نہیں بتایا۔آئیں آپ لوگوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔روسٹ مرغ اور بہت اچھا کھانا کھلایا۔بالکل میس سا ماحول تھا۔اس نے کہا کہ یہاں

بارڈر رنز دیک ہونے کی وجہ سے خطرہ ہے کہ انڈین آپ کو اغوا نہ کر لیں میں آپ کو 20,22 میل دور جنگل میں بھیج رہا ہوں۔ جنگل میں ہمارا استقبال ایک فارسٹ افسر نے کیا اور ہمیں ایک بہت بڑے گھر میں لے جا کر رہنے کے لیئے الگ الگ کمرے دیئے۔ فارسٹ افسر نہایت نفیس انسان تھا وہ آسٹریلیا سے کوئی کورس کر کے آیا تھا اور انگریزی بولنا جانتا تھا۔

اسی رات بی۔ بی۔ سی BBC نے خبر دی کہ دو پاکستانی افسر مغربی بارڈر کراس کر کے نیپال پہنچ گئے ہیں۔ دوسرے یا تیسرے دن ایک آدمی BBC پر خبر سن کر ہمیں ملنے آ گیا۔ ہم سے مل کر بہت خوش ہوا۔ اس نے بتایا کہ اس کا بھی کسی حوالے سے پاکستان سے تعلق ہے۔ اس کے کچھ رشتہ دار پاکستان میں ہیں۔ اس نے ہمیں ایک صندوق پیش کیا جس میں دو جوڑے کپڑے بنیان، دو جوڑے جوتے اور موزوں کے علاوہ اور بہت سا سامان تھا۔ ہم نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ ویسے بھی ہمارے پاس کپڑے نہیں تھے۔ بکس سے نکال کر کپڑے بدلائے۔

سر کا زخم ٹھیک ہو گیا تھا لیکن ٹانگ کا زخم ابھی مندمل نہیں ہوا تھا۔ فاریسٹ افسر نے ایک ڈاکٹر بلایا جس نے میرا زخم صاف کر کے پٹی باندھ دی۔ سات آٹھ دن کے بعد ایک برگیڈیئر آیا اور اس کے ساتھ جیپ میں بیٹھ کر ہم ایک رن وے پر گئے جہاں ایک چھوٹا سا ڈکوٹا Dakota جہاز کھڑا تھا جس پر بٹھا کر ہمیں کھٹمنڈو پہنچایا گیا۔ وہاں میں نے کہا ہمیں پاکستان کے سفارت خانے لے چلو جس کے جواب میں کہا گیا کہ تم سفارت خانے نہیں جا سکتے ہمیں جو ہدایات ملیں ہیں ان کے مطابق ہی کاروائی کریں گے۔ ہمیں ایک بند جیپ میں بٹھا کر کسی پہاڑی راستے سے لے جایا گیا۔ ایک گھنٹہ چلنے کے بعد جیپ ایک جگہ گیٹ کے سامنے روک دی گئی۔ گیٹ کے اندر جا کر ہمیں اتار کر گیٹ بند کر دیا گیا۔

یہ ایک جیل تھی جس میں ایک طرف تاریں لگا کر وی۔آئی۔پی VIP انکلوژر enclosure بنایا گیا تھا۔وہاں ہمیں ایک کمرہ دیا گیا حالانکہ وہاں دو کمرے تھے۔گارڈ روم ذرا اونچی جگہ پر تھا۔اس کا انچارج ایک انسپکٹر تھا جس کا نام شاید لیمبو تھا۔ وہ کافی شریف آدمی تھا۔اس سے کہا کہ کھانا دو تو اس نے کہا کھانے کے بارے میں تو ہمیں کچھ بتایا نہیں گیا۔ ہمارے آدمی کھانا کھا چکے ہیں البتہ میرے پاس ابلے ہوئے کچھ خشک چاول ہیں وہ دے سکتا ہوں۔ہم نے وہی چاول کھائے۔ہمیں دو بستر، دو بیڈ اور دو کرسیاں دی گئیں۔کمرے کی دو کھڑکیاں تھیں جن میں لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ البتہ کمرے کا دروازہ کھلا رکھا گیا۔رہنے کے لیئے جگہ کافی اچھی تھی۔کھڑکی کے سامنے ایک دیوار تھی جس کے اوپر تاروں کی ایک باڑ تھی۔

رات سونے کے بعد ہم صبح اٹھے تو بتایا گیا کہ راشن آ گیا ہے۔تیسرے چوتھے دن ایک کک بھی ہمارا کھانا پکانے کے لیئے آ گیا۔اس کا نام ارجمند سنگھ تھا۔ کھانے میں کبھی مرغی کبھی سبزی دال ہوتی تھی۔ان سے اجازت لے کر مرغی ہم خود ذبح کرتے تھے۔آہستہ آہستہ گارڈ سے جان پہچان ہوگئی اور ان کے ساتھ گھل مل گئے۔ان کے ساتھ بیڈمنٹن اور کبھی بلے وغیرہ کے ساتھ کھیل لیتے تھے۔غالباً ارشاد کے پاس کچھ پیسے تھے جو اس نے الگ کر رکھے تھے اور کچھ ہم نے کھانے پینے والی چیزوں سے بچا رکھے تھے۔ ہم نے ان میں سے کچھ پیسے ارجمند کو دیئے کہ جا کر بازار سے ایک کٹر wire cutter لے آؤ۔واپسی پر اسے چیک کیا گیا تو اس نے کہا کہ یہ یہاں پر بند دو قیدیوں نے منگوایا ہے۔وہ الرٹ ہو گئے۔ ہمارے پاس ایک ایف آئی۔اے FIA کا اور ایک ان کی سکیورٹی کا آدمی آ گیا۔ ہمارا کمرہ چیک کیا اور ہم سے پوچھا کہ کیا کٹر آپ نے منگوایا تھا۔کہا ہاں ہم ہی نے

منگوایا تھا تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے۔ ہماری آپ سے لڑائی تو نہیں ہوئی ہمیں کیوں قید کیا ہوا ہے۔ وہ کہنے لگے اب ہم آپ سے زیادہ سختی کریں گے۔ ہمارا خیال ہے کہ آپ بھاگنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہم نے احتجاج کیا اور کھانا نہیں کھایا تو ایک ڈپٹی کمشنر آ گیا۔ اسنے کہا ہمارا ہر طرف سے خشکی میں گھرا ہوا ملک Land locked country ہے اور ہمارا انڈیا پر کافی انحصار ہے اس لیئے جب تک پاکستان کا قیدیوں کے بارے میں انڈیا سے سمجھوتا نہیں ہو جاتا آپ یہیں رہیں گے۔ ہم نے کہا کہ آپ ہم پر ظلم کر رہے ہیں۔ ہم انڈیا میں بھی اس طرح تو بند نہیں تھے۔ آگے پیچھے جا سکتے تھے آپ نے ہمیں ایک جگہ بند کیا ہوا۔ ہمیں کم از کم یہ تو اجازت دیں کہ ہم باہر جا سکیں بیشک ساتھ گارڈ بھیج دیا کریں۔ کم از کم ہمیں گارڈ کے ساتھ باہر پھرنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ ہمارا مقصد تھا کہ باہر جا کر دیکھیں کہ اگر بھاگے تو ارد گرد جگہ کیسی ہے۔ کافی بحث مباحثے کے بعد ہمیں باہر جا کر 20 منٹ تک ورزش کرنے کی اجازت مل گئی۔ اس وقت کو ہم نے آہستہ آہستہ بڑھا کر آدھ گھنٹے سے بھی کچھ زیادہ کر لیا۔ ہمارے ساتھ دو دو گارڈ ہوتے تھے۔ ایک دن راستے میں ایک فرنچ جوڑا ملا۔ اس سے بات چیت ہوئی تو مرد کہنے لگا کہ آپ سامنے پہاڑ پر نہیں گئے بہت خوبصورت جگہ ہے۔ ہم بھی ادھر المبو سے آ رہے ہیں وہاں گرم چشمہ بھی ہے۔ ہم نے ان سے کچھ دیر باتیں کیں۔ اس نے بتایا کہ اوپر چھوٹے چھوٹے گاوئں ہیں اور دریائے المبو بھی ادھر ہی سے آتا ہے۔ یہ سامنے والا راستہ آپ کو ادھر ہی لے جائیگا۔ ان سے باتیں کیں تو گارڈ نے کہا واپس چلو آپ کے ساتھ کیا پرابلم ہے۔ ہم نے کہا کہ کوئی پرابلم نہیں۔ اب ہم یہاں سے بھاگنے کی ترکیبوں کے بارے میں سوچنے لگے۔

جب انڈیا سے بھاگے تو فروری تھی اب اپریل آ گیا تھا۔ ارجمند کو انہوں

نے واپس بھیج دیا تھا اس لیئے کھانا یا تو گارڈ یا ہم خود پکا لیتے تھے۔سویٹ ڈش کے لیئے کبھی کبھی ہم آٹے کے جولے بنا لیتے تھے۔ ہولی کے دن آئے تو ہم گارڈز کے ساتھ اور زیادہ گل مل گئے۔ لمبے لمبے بانس لیکران کے آگے رسیاں باندھ کر ہم ہوا میں لہراتے رہتے تھے جن پر وہ یہ سوچ کر کہ یہ اپنا دل بہلا رہے ہیں ہمیں منع نہیں کرتے تھے۔ ہولی والی رات ہم نے وہاں سے نکلنے کا پروگرام بنایا۔ چونکہ ہمارے پاس لوہا کاٹنے والی آری نہیں تھی اس لیئے چھری سے ایک سلاخ کے نچلے سرے کے ساتھ لگی لکڑی کو کریدنا شروع کر دیا تھا۔صبح کے وقت ہم اسے صابن اور مٹی کے بنے پیسٹ سے چھپا دیتے تھے تاکہ ایک نظر دیکھنے سے پتا نہ چلے۔ ہولی سے پہلے اسے کافی ڈھیلا کر دیا تھا جس سے وہ کچھ ٹیڑھی لگ رہی تھی لیکن اسے اس زاویے پر اٹکایا کہ دروازے سے اندر آنے والے کو سیدھی لگے۔

ہولی کے دن انہوں نے ہمیں بھی مدعو کیا۔اس دن ہم نے ایک بانس کے سرے پر ننگی تار باندھی اور اوپر سے گذرتی ہوئی تاروں کو شارٹ کر دیا۔ ہرطرف اندھیرا چھا گیا۔چھٹی کا دن تھا اس لیئے بجلی ٹھیک کرنے کے لیئے کوئی الیکٹریشن نہیں تھا اس لیئے انہوں نے کہا کہ صبح ٹھیک کریں گے۔ہم ان کی پارٹی میں چلے گئے۔اس دن وہ کافی بے فکر relaxed تھے۔ ہمارے اوپر دو گارڈ لگائے گئے تھے جو باری باری ڈیوٹی دیتے تھے۔ہمیں پتا تھا کہ وہ آج سوئیں گے نہیں۔ ہولی کی خوشی میں گارڈز نے خوب شراب پی اور نشے میں بدمست ہو گئے۔ہم تو جلد ہی اپنے کمرے میں واپس آ گئے لیکن ہماری حفاظت کے لیئے متعین گارڈ واپس نہ آیا اور ہولی منانے میں مست رہا۔ بستروں کے اوپر رضائیوں کے اندر ہم نے تکیے رکھ دیئے تاکہ ایک نظر دیکھنے سے یہی لگے کہ ہم سو رہے ہیں۔اپنے ساتھ کچھ راشن کے علاوہ ایک پلیٹ اور کٹوری رکھ لی تاکہ راستے میں چائے وغیرہ بنا سکیں۔کھڑکی کی سلاخ جو ہم نے

لکڑی کاٹ کر الگ کر لی تھی اور اسے دوبارہ اٹکا دیا تھا اسے الگ کیا۔ایک چادر کو کھڑکی کے ساتھ باندھ کر ارشاد کو کہا کہ میرے کندھے پر کھڑے ہو کر چھت پر چڑھ جاؤ۔ میں نے اسے سامان جس میں کمبل چادر پلیٹ ،مگ اور کچھ کھانے کی چیزیں تھیں باندھ کے دیا کہ اسے باہر پھینکو اور چھلانگ لگا کر نیچے اتر جاؤ۔ اس نے بتایا کہ دوسری طرف بھی تار ہے جو ہم نے پہلے نہیں دیکھی تھی کیونکہ ہم گیٹ کی طرف سے آتے تھے۔ میں بھی چادر سے اوپر چڑھا اور چادر کھول کر پرے پھینک دی اور نیچے آ گیا۔ میں نے تاروں کے اوپر پاؤں رکھ کر ارشاد کو کہا کہ گذر جاؤ۔تھوڑی بہت تاریں لگیں لیکن ہم باہر نکل گئے ۔کئی لوگ ادھر سے گذرتے رہتے تھے اور سکیورٹی بھی سخت نہیں تھی اور انہوں کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ یہاں سے کوئی فرار ہو گا اس لیئے یہاں سے نکلنے میں ہمیں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ ہم نے بھاگنا شروع کر دیا آگے کھیت تھے۔دوڑتے دوڑتے ہم پہلے سے دیکھے ہوئے ٹریک پر پہنچ گئے ۔ جب پہاڑ کی چوٹی پر پہنچے اور مڑ کر دیکھا تو ٹارچیں ہی ٹارچیں اور بہت سے لوگ نظر آئے جو ہمیں ڈھونڈ رہے تھے۔

صبح ہو رہی تھی ہم کافی دیر بھاگتے رہے۔ میں آگے بھاگ رہا تھا کہ سلپ ہو گیا اور گر گیا اور میری ٹانگ ایک درخت کے دو شاخے میں پھنس گئی نیچے گرتا تو ایک گہری کھائی تھی۔ ارشاد مرزا نے پوچھا کہ تم کدھر ہو بہت اندھیرا ہے۔ارشاد سے کہا کہ میری طرف چادر کا ایک سرا پھینکو۔اور دوسرا سرا درخت کے ساتھ باندھو یا پکا پکڑو۔ چادر پکڑ کر میں اوپر آ گیا۔میری ٹانگ مڑ گئی تھی جس سے چلنا مشکل ہو گیا۔اوپر چڑھتے یا نیچے جاتے ہوئے سخت درد ہوتا تھا۔ پیچھے ٹارچوں کی روشنی نظر آ رہی تھی۔ پہاڑی کے نیچے گھاٹی میں جھاڑیاں تھیں وہاں چھپنے کے لیئے ہم آہستہ آہستہ نیچے آ گئے کیونکہ اب صبح بھی ہو چلی تھی۔ کچھ دیر بعد ہم نے آگ جلا کر کٹوری میں

چائے بنائی اور اسے پی کر چپ سادھ کے بیٹھ گئے۔ شام ہوئی تو ہم آہستہ آہستہ چل پڑے۔ ٹانگ میں شدید درد اٹھ رہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے راستے تھے جن پر ہم ساری رات چلتے رہے۔ آگے ایک دریا آ گیا اور ہم نے اندازہ لگایا کہ اسے عبور نہیں کر سکتے۔ ایک گاوں آیا تو ہم نے جس کسی سے کہا کہ کچھ کھانے کو دو تو اس نے انکار کیا اور کہا کہ براہمن کے گھر جاؤ وہ کھانے کو کچھ دے گا۔ ایک آدمی ہمارے ساتھ ہو گیا۔ اوپر ایک چھپر کے پاس سے گذر کر وہ ہمیں براہمن کے گھر لے گیا۔ ہم اندر چلے گئے وہاں رواج تھا کہ جا کر پہلے براہمن کے پاؤں چھوتے تھے۔ ساتھ آئے ہوئے آدمی نے اس کے پاؤں چھوئے تو ہم نے بھی ایسا ہی کیا تو اس نے پاؤں اوپر اٹھا لیئے۔ اسے بتایا کہ ہم مسافر ہیں اور میری ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔ اس نے اپنی بیوی کو بلایا اور اسے بتایا کہ اس کی ٹانگ شاید ٹوٹ گئی ہے۔ اس نے مکئی کی موٹی سی روٹی بنائی اور ٹانگ پر باندھ دی۔ ہمیں ایک الگ بنے کمرے میں سونے کے لیئے جگہ دی۔ صبح اٹھے تو اس نے مجھے سہارے کے لیئے ایک اچھی سی چھڑی دے دی۔ ان کے گھر سے تقریباً دس بجے نکلے۔ چلتے چلتے آگے ایک دریا آ گیا۔ ایک آدمی نالے سے مچھلیاں پکڑ رہا تھا۔ اس سے ایک دو مچھلیاں مانگیں۔ آگے گئے تو پہاڑی پر ایک گھر دیکھا لیکن وہاں کوئی نظر نہیں آیا۔ اس کے برآمدے میں سو گئے کیونکہ رات پڑ گئی تھی۔ صبح اٹھے تو ایک آدمی نظر آیا جس نے سؤر پال رکھے تھے۔ اس سے دودھ مانگ کر پیا۔ بعد میں پتا لگا کہ دودھ سؤروں کا تھا۔ خیر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ ہم دوبارہ چل پڑے۔ جنگل اب ختم ہو چکا تھا اور بنجر پہاڑ شروع ہو گئے تھے۔ شاید دوسرا یا تیسرا دن تھا۔ ہمارے پاس وہی اٹلس والا نقشہ تھا جس کی مدد سے چار دن پہاڑوں پر چلتے رہے اور ہمیں کوئی گاؤں نظر نہیں آیا۔ سارے گاؤں پیچھے رہ گئے تھے آگے ایک دریا آ گیا جو بہت تیزی سے بہہ رہا

تھا۔اس کا نام سون آن کوسی Sone on Kusi تھا جو یہاں سے ہوتا ہوا انڈیا میں داخل ہوتا ہے اور ہم مشرقی پاکستان سے انڈیا آتے ہوئے اس پر سے گزرے تھے۔ سامنے تبت کی ایک چوکی نظر آئی۔ اگر دریا نہ ہوتا تو ہم چین پہنچ جاتے۔ یہ ہمارا چوتھا یا پانچواں دن تھا۔اوپر وادی تھی اور نیچے دریا بہہ رہا تھا۔ ارشاد سے کہا کہ فی الحال یہاں سے نکلنے کا کوئی طریقہ نظرنہیں آرہا صبح دیکھیں گے کہ اسے کیسے اور کس جگہ سے عبور کرنا ہے۔ان چادروں کو اپنے گرد اگرد باندھ دیں گے کیونکہ جنگلی جانوروں سے خطرہ ہے ادھر ہی مچھلیاں آگ پر بھون کر کھاتے ہیں۔ جو لکڑیاں اکٹھی کر رکھی تھیں ان کو جلایا اور اوپر پلیٹ رکھ دی۔ دھواں بلند ہوا اور تھوڑی دیر کے بعد دیکھا تو چوٹی skyline پر تین چار آدمی نظر آئے۔ میں نے کہا کہ یہ کون لوگ ہیں۔ جلد سمجھ گیا کہ یہ ہمارا پیچھا کر رہے ہیں ارشاد مرزا سے کہا میں تو نہیں بھاگ سکتا تم بھاگ جاؤ۔لیکن وہ وہیں بیٹھا رہا۔ گھنٹے بھر کے بعد چھ سات آدمی ہمارے نزدیک آکر پاس بیٹھ گئے۔ان میں سے ایک نے پوچھا کہ تم کون ہو۔ ہم نے کہا کہ سیاح ہیں۔ مختلف جگہیں دیکھنے آئے ہیں۔انہوں نے پوچھا کہ کون کون سی جگہ دیکھی ہے؟ ہم نے راستے کی ساری جگہیں بتائیں اور کہا کہ الموڑا واپس جائیں گے۔کافی دیر ادھر ادھر کی ماریں تو ان میں سے ایک نے کہا کہ صاحب میں وہاں جیل میں آپ کے ساتھ گارڈ تھا۔ہمیں پتا ہے کہ آپ کی ٹانگ کو چوٹ لگی ہے۔ یہ بات ہمیں براہمن نے بتائی ہے۔ہم سٹریچر بھی لائے ہیں آپ کو اس پر لے جائیں گے۔ میں نے کہانہیں میں چل لوں گا۔

وہاں سے کافی دور تک پیدل چلے۔ ملنگو پہنچے تو وہاں ایک جیپ کھڑی تھی جس میں بٹھا کر وہ ہمیں کھٹمنڈو میں پولیس ہیڈکوارٹر لے گئے اور ایک ڈی۔آئی۔جی کے سامنے پیش کیا۔ وہ تھوڑی بہت پنجابی جانتا تھا کیونکہ وہ کسی زمانے میں انڈیا کے

صوبے ایسٹ پنجاب میں نوکری کر چکا تھا۔اس نے پنجابی میں کہا ' اے کی کیتا اے ساڈی تباہی پھیر چھڈی اے۔آپ ہمارے قیدی ہیں ہم آپ کو چھوڑ نہیں سکتے جب تک جنگی قیدیوں کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں ہو جاتا۔آپ ایسا کام نہ کریں جس سے ہم مصیبت میں پڑ جائیں '۔جیل والے گارڈوں کو فارغ کر دیا گیا اور ہمیں پکڑنے والوں کو انعام واکرام سے نوازا گیا۔انہوں نے فیصلہ کیا کہ اب ان کو الگ الگ رکھیں گے۔ارشاد کو ٹریفک پولیس کے تہہ خانے میں اور مجھے ادھر ہی ٹریفک پولیس کی بیرک کے ایک کمرے میں رکھنے کا فیصلہ ہوا۔شاید ارشاد کی ڈیل ڈول دیکھ کر یہ فیصلہ کیا گیا۔میں نے جاتے جاتے ارشاد مرزا کو کہا کہ احتجاج کے طور پر کھانا نہ کھانا۔کچھ احتجاج کریں گے تو جان چھوٹے گی۔دو دن ہم نے بھوک ہڑتال کی تو ڈی۔آئی۔جی نے دوبارہ بلایا اور کہا کہ اگر آپ لوگ آئندہ ایسا کوئی کام نہیں کریں گے تو ہم آپ کو واپس ایک ہی جگہ کر دیں گے۔انہوں نے ہمیں ٹریفک آفس ہی میں ایک کمرہ دے دیا لیکن ہم دونوں کی چارپائیوں کے پاس ایک ایک گارڈ متعین کر دیا۔باتھ روم جاتے تو اسکا دروازہ کھلا رکھا جاتا۔

یہ صورت حال تقریباً ایک مہینے تک رہی۔اسکے بعد ہم نے انچلا دی (کمشنر) کو پروٹسٹ نوٹ لکھنے شروع کر دیئے۔ہمارا کھانا ایک سکھ لڑکا لاتا تھا۔انہوں نے بتایا کہ ہمارے پاس کوئی بندوبست نہیں کہ آپ کو حلال کھانا کھلائیں اس لیئے آپ کو جو چیز چاہیے خود منگوا لیا کریں۔چہل قدمی کیلیئے ہمیں چار سنتریوں کے ساتھ چھت پر جانے کی اجازت تھی۔دن گذرتے رہے۔وہ مہینے گذرے تو پولیس والے ہم سے کچھ مانوس ہو گئے۔ہم ڈی۔ایس۔پی کے دفتر میں جا کر بیٹھ جاتے تھے۔ایک دن وہاں ایک لسٹ پڑی دیکھی جس میں تمام سفارت خانوں کے فون نمبر درج تھے۔میں نے اس میں سے اپنے سفارت خانے کا نمبر نوٹ کر

لیا۔ وہاں ہم نے کئی عجیب تماشے دیکھے۔ اگر کوئی مجرم پکڑ کر لایا جاتا تو برخلاف ہماری پولیس کے اس کے ساتھ نرم رویہ برتا جاتا۔ ایک دفعہ ایک سکھ لایا گیا۔ اس نے ایک عورت کو مارا تھا جسکی بری حالت تھی۔ سکھ نشے میں تھا اور کہہ رہا تھا کہ میں اسے اور ماروں گا۔ انسپکٹر اسے سمجھا رہا تھا لیکن وہ مسلسل اول فول بک رہا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ یہ بکواس کر رہا ہے تم کیوں نہیں ایف۔ آئی۔ آر FIR کاٹ کر اسے حوالات میں بند کر دیتے۔ وہ کہنے لگا کہ ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ میں نے اٹھ کر سکھ کو دو تھپڑ رسید کیئے اور اسے کہا کہ کان پکڑو۔ اس نے کھڑے کھڑے کان پکڑے تو میں نے کہا کہ نہیں مرغا بن کے کان پکڑو تو وہ جھٹ مرغا پوزیشن میں چلا گیا۔ ہم ایسے تماشے کرتے رہتے تھے۔

چھت پر سیر کرنے کے دوران ہمیں سامنے والی چھت پر ایک جوان لڑکی بھی سیر کرتی نظر آتی تھی۔ اس کے ساتھ اس کی نوکرانی ہاتھ میں چھتری اٹھائے اس پر سایہ کیئے رکھتی تھی۔ وہ ہمیں غور سے دیکھتی تھی کہ یہ کون لوگ ہیں اور ان کے ساتھ گارڈ کیوں ہوتے ہیں۔ ایک دن اس نے اپنا چھوٹا بھائی بھیجا۔ اس نے ہم سے ہمارے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا کہ ہمارا باپ ایک ریٹائرڈ لفٹیننٹ کرنل ہے اور ہم دارجلنگ سے یہاں آئے ہیں۔ میری بہن رائزنگ نیپال Rising Nepal میگزین کے لیئے لکھتی ہے۔ وہ آپ سے ملنا چاہتی ہے اور آپ کے بارے میں لکھنا چاہتی ہے۔ ہم نے اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔ وہ ڈی۔ ایس۔ پی سے اجازت لیکر ہمارے پاس آئی اور پاکستان کے دو افسروں کا فرار Escape of two Pakistani Officers کے نام سے اپنی میگزین میں قسط وار مضمون لکھنے شروع کر دیئے۔ ہر چوتھے پانچویں روز ہمارے پاس آ کر ہم سے کچھ پوچھ کر چلی جاتی۔

اگست کا مہینہ آ گیا تھا اور اب ہم کافی تنگ پڑ چکے تھے۔ ڈپٹی کمشنر کی طرف سے ہمیں خط لکھنے کی اجازت مل گئی تھی جس کے بعد ہم نے اپنے گھر والوں کو کافی خط لکھے۔ میں نے اپنی بھابھی کو خط لکھ کر بھاگنے سے پہلے اور بعد کے واقعات کے بارے میں لکھا۔ اگست کے پہلے یا دوسرے ہفتے میں ہمیں خبر ملی کہ انڈیا سے ایک کمشن ہمارے سلسلے میں نیپال آیا ہوا ہے۔ ہمیں کہا گیا کہ آپ نے ہمیں بہت تنگ کیا ہوا ہے اس لیئے کل شام ہم آپ کو چھوڑ دیں گے آپ جدھر جانا چاہئیں چلے جائیں۔ باہر کچھ مشکوک لوگ کھڑے تھے جو ہمیں انڈین لگے۔ میں نے ایمبیسی Embassy کا وہ ٹیلیفون نمبر جو میں نے نوٹ کیا ہوا تھا نکالا اور پاکستانی سفارت خانے کے فرسٹ سیکرٹری مسٹر اقبال سے بات کی۔ میں نے اسے اپنا نام بتایا اور کہا کہ ہمیں چھوڑا جا رہا ہے اور باہر لگتا ہے کہ انڈین ہمیں پکڑنے کے لیئے موجود ہیں۔ اس نے بتایا کہ ہمیں آپ کے بارے میں تفصیلی علم ہے اور ہم اس سے پہلے آپ سے رابطہ کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ اس نے کہا کہ آپ لوگ وہیں ٹھہریں میں ابھی آ کر آپ کو لے جاؤں گا۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد مسٹر اقبال پاکستانی فلیگ لگی کار پر پولیس لائن پہنچے اور ہم سے پوچھا کہ یہاں کچھ لینا دینا تو نہیں ہے۔ ہم نے نفی میں جواب دیا اور ان سے کہا کہ اس نوکر نے ہماری بہت خدمت کی ہے اسے کچھ دے دیں۔ انہوں نے اپنی جیب سے نکال کر کچھ رقم اس کو دی اور ہمیں اپنے ساتھ ایمبیسی لے آئے۔ ہم ایمبیسی میں تقریباً پانچ دن رہے اور اس دوران ہمارے فرضی ناموں کے ساتھ عارضی پاسپورٹ بنائے گئے۔ میرا نام عبدالرحیم اور ارشاد مرزا کا نام راشد رکھا گیا۔

سفارت خانے میں قیام کے دوران ایک دن ہم کھانا کھا رہے تھے تو سفیر کو ایک ٹیلیفون آیا۔ وہ کافی دیر فون پر کسی سے باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ ہماری

طرف مسلسل مسکرا کر دیکھ رہے تھے۔ ہم سے رسیور پر ہاتھ رکھ کر پوچھا کہ بھاگ رہے تھے کہ کڑیاں پھنسا رہے تھے۔ میں نے پوچھا کہ سرکون ہے جس پر انہوں نے کہا کہ سارہ کو کیسے جانتے ہو۔ انہوں نے سارہ سے میری بات کروائی۔ اس نے گلہ کیا کہ آپ نے جاتے ہوئے مجھے بتایا بھی نہیں جس پر میں نے کہا کہ میرے پاس ٹیلیفون نہیں ہے۔ اس نے کہا کہ آپ جانے لگیں تو مجھے بتانا میں آپکے پاس کراچی آؤنگی۔ میں نے اس سے کچھ وعدے کیئے اور کہا کہ سفیر صاحب پاس بیٹھے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ ان کے پاس آپ کا ایڈریس ہے اور ہمارے پاکستان پہنچنے پر آپ سے رابطہ کریں گے جس کے بعد اس نے ٹیلیفون بند کر دیا۔ چین کا سفیر رنگون جا رہا تھا ہمیں جانے کے لیئے اس کے ساتھ کر دیا گیا۔ ایئر پورٹ پر سارہ موجود تھی۔ میں نے وعدہ کیا کہ پاکستان میں سیٹل settle ہونے کے بعد میں اس سے رابطہ کروں گا۔

رنگون ایئر پورٹ پر ایک شخص نے تختی اٹھائی ہوئی تھی جس پر ہمارا نام لکھا ہوا تھا۔ وہ ہمیں دس بارہ میل دور سفارت خانے لے گیا۔ سفارت خانے میں ملٹری اٹیچی سگنل کور کے کرنل ھادی ملے اور انہوں نے بتایا کہ یہاں بہت زیادہ انڈین ایجنٹ ہیں اس لیئے خطرے کے پیش نظر یہاں زیادہ حرکت نہیں کرنی۔ دو دن کے بعد ہمیں بنکاک بھیج دیا گیا جہاں ہم سفارت خانے میں تین دن رہے۔ وہاں ہمیں 20,20 ڈالر خرچ کرنے کے لیئے دیئے گئے اور گاڑی میں بٹھا کر شہر بھیجا گیا جہاں ہم نے کچھ چیزیں اور سگریٹ لیئے۔ ہمیں پاکستان جانے والی پی۔ آئی۔ اے کے ایک جہاز میں بٹھایا گیا تو خوشی کے جذبات سے آنکھیں بھر آئیں۔ یقین نہیں آرہا تھا کہ آخر کار ہم پاکستان پہنچ گئے ہیں۔ کراچی پہنچ کر ہمیں مڈوے ہوٹل میں ٹھہرایا گیا کیونکہ ہماری راولپنڈی کی پرواز اگلے دن کی

تھی۔ پاکستان پہنچتے ہی اپنی دھرتی کو چھوا تو بے اختیار رو پڑے۔ اللہ کا شکر ادا کیا۔ گھر واپس پہنچنے کے لیئے ہمیں بہت زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ راولپنڈی پہنچے تو ایئرپورٹ پر ہمیں لینے کے لیئے کوئی نہیں آیا تھا۔

پریشان حال باہر نکلے تو ایک فوجی ٹرک نظر آیا۔ ڈرائیور سے کہا کہ ہم فوجی ہیں ہمیں جی۔ ایچ۔ کیو تک لے چلو۔ اس نے کہا کہ ہم آپ کو گیٹ کے باہر ہی اتار دیں گے اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ گیٹ نمبر دو پر اترے اور اندر کسی کو ٹیلیفون کرنی چاہی تو انہوں نے انکار کر دیا اور کہا کہ کہیں باہر سے ٹیلیفون کریں۔ جب ہم نے بہت اصرار کیا تو انہوں نے ہمیں ڈی۔ ایم۔ آئی DMI کا نمبر ملا دیا۔ ان کے پی۔ اے نے ان سے بات کروائی تو ان کو بتایا کہ ہم انڈیا سے بھاگنے والے دو افسر ہیں اور بنکاک سے آئے ہیں۔ اس نے کہا کہ گیٹ کیپر سے بات کروا دو۔ جب اس نے اسے کچھ بتایا تو اس نے ہمیں کہا کہ آپ نے ہمیں پہلے کیوں نہیں بتایا۔ ہم بھی حیران تھے کہ ہمارے بارے میں یہاں کوئی خبر کیوں نہیں پہنچی۔ گیٹ کیپر نے گیسٹ روم کھولا اور ہماری چائے اور بسکٹوں سے تواضع کی۔ ڈی۔ ایم۔ آئی آئے اور ہمیں اپنی جیپ میں بٹھا کر اپنے دفتر لے گئے۔

انٹیلیجنس Intelligence کے افسروں نے ہم سے تھوڑی دیر کچھ پوچھ گچھ کی اور پھر ہمیں اپنے ساتھ اپنے دفتر لے گئے۔ انہوں ہمیں کاغذ قلم دیئے اور کہا کہ تمام واقعات کے بارے میں تفصیل سے لکھو۔ ہم مسلسل دوپہر سے لے کر شام تک لکھتے رہے۔ پھر ایک میجر سے کہا کہ ہمیں اپنے گھر والوں سے بات کرنے کی اجازت دو۔ پہلے تو اس نے انکار کیا کہ جب تک آپ کی کلیرنس نہیں ہو جاتی آپ کو اس کی اجازت نہیں دے سکتے لیکن ہمارے پرزور صرار پر میرے گھر کا نمبر ملا دیا۔ میں نے اپنے والدین سے بات کی اور ان کو ڈھکے چھپے الفاظ میں اپنی

موجودگی کی جگہ کا بتایا۔ وہ بہت جذباتی ہو رہے تھے اور تھوڑی دیر بعد دیکھا تو وہ اپنی ڈی۔ کیو۔ ڈبلیو DKW موٹر سائیکل کے ساتھ جنگلے کے باہر دکھائی دیئے۔ میجر کو بتایا تو اس نے ان سے ملنے کی اجازت دے دی۔ نہایت جذباتی حالت میں ان سے ملا اور انہیں بتایا کہ ہم جلد ہی گھر آ جائیں گے۔ رات تک ہم رپورٹ لکھتے رہے ۔اس رات انہوں نے ہمیں سونے کے لیئے ایک ساتھ والے کمرے میں جگہ دی۔ دوسرے دن جب رپورٹ پوری ہوگئی تو ہمیں کہا گیا کہ کلیرنس ہونے تک آپ ٹرانزٹ کیمپ کے میس میں رہیں گے۔ میں نے اصرار کیا کہ میرا گھر یہیں پر ہے جہاں سے میں روزانہ آ جا سکتا ہوں۔ ڈی۔ جی۔ ایم۔ آئی سے پوچھا گیا تو اس نے اجازت دے دی۔ ہمیں 500,500 روپے خرچ کے لیئے دیئے گئے ۔ ارشاد مرزا کی فیملی مری آئی ہوئی تھی اس نے ان سے وہاں رابطہ کیا اور ادھر چل پڑا۔ میں ٹیکسی لے کر گھر پہنچا۔ ایک نہایت ہی جذباتی ماحول میں سب سے ملا۔ میری چھوٹی بہن یاسمینہ کا آپریشن ہوا تھا اور اس کی دونوں ٹانگوں پر مکمل پلستر چڑھا ہوا تھا۔ اس دن گھر میں بہت سے رشتہ دار اسے دیکھنے آئے ہوئے تھے اس لیئے ان سب سے بھی ملاقات ہوگئی۔ میرے آنے پر سب بہت خوش تھے اور مجھے نہایت جوشیلے انداز میں ملے۔

ہم تقریباً ایک مہینہ ایم۔ آئی ڈائریکٹریٹ کے ساتھ اٹیچ رہے۔ اس دوران جنرل ٹکا خان جو اس وقت چیف آف آرمی سٹاف تھے سے ایک گھنٹے کی ملاقات ہوئی۔ انہوں نے میری کہانی بڑے غور سے سنی اور کہا کہ تمہیں کم از کم ستارہ ء جرأت کا ایوارڈ دیا جائیگا۔ ہم سے ہماری سرگذشت کئی جگہوں پر لکھوائی گئی اور اس کے بعد میری سائٹیشن citation لکھنے کے لیئے اے۔ جی برانچ میں کرنل نصرت کے پاس بھیجا گیا جو قادر کے مطابق جس نے اس کے ساتھ کسی سگنل یونٹ میں

نوکری کی تھی نہایت گھٹیا افسر تھا۔ اس نے مجھے اپنی پوری داستان سنانے کو کہا۔ چونکہ میں اپنی کہانی سنا سنا کر تنگ آ چکا تھا اور اے۔ جی برانچ میں اس کی لکھی ہوئی کاپی بھی پہنچ چکی تھی اس لیئے میں نے اسے کہا کہ تمہارے پاس سب کچھ لکھا ہوا موجود ہے مجھ سے دوبارہ کیوں پوچھ رہے ہو۔ اس بات پر وہ چڑھ کر بولا کہ میں تمہیں دیکھ لوں گا اب تم یہاں سے جاؤ۔ کچھ مہینوں بعد مجھے پتا لگا کہ مجھے تمغہ جراُت دینے کی سفارش کی گئی ہے۔ میری پوسٹنگ ملتان میں ایک سگنل یونٹ میں کر دی گئی۔ کرنل (بعد میں میجر جنرل) ریاض چوہدری جو ہمارے سی۔او تھے نے جی۔ایچ۔کیا ٹیلیفون کیا اور مجھ سے ایک درخواست لکھوائی جس پر مجھے پنڈی میں ایک سگنل یونٹ میں پوسٹ کر دیا گیا۔ اور اسطرح میں اپنے گھر کے قریب آ گیا۔

December 30, 1971, a news flash came from Agra: "POW Escapes." Captain Abdul Rashid had jumped out of a POW train "somewhere between Mathura and Agra," en route to a camp near Agra. It was the first of 102 escape attempts—and the first of the 22 that succeeded. The next to hit the news occurred on the night of January 8, again from a train—but the five men were caught 10 days later.

The most dramatic success story in the list was probably the February escape by two more Pakistani captains—Mahmoud Irshad and Abdul Rehman—across the UP border into Nepal. In all, 63 eecaping POWs were caught and returned to custody. Seventeen others were killed trying to get away. The others, in their thousands, sat out the subcontinental stalemate in the 50 camps.

Resources were found, somehow, to equip the camps with the facilities and services the prisoners and internees needed. In all, India has spent about Rs 27 crores till now in upholding the Geneva Conven-

ہندوستان تائمز کے 22 اکتوبر 1973 کے سنڈے میگزین سے ماخوذ

from a train—but the five men were caught 10 days later.

The most dramatic success story in the list was probably the February escape by two more Pakistani captains—Mahmoud Irshad and Abdul Rehman—across the UP border into Nepal. In all, 63 eecaping POWs were caught and returned to custody. Seventeen others were killed trying to get away. The others, in their thousands, sat out the subcontinental stalemate in the 50 camps.

Resources were found, somehow,

فرار ہونے والے باقی پانچ افسر

یہ تو تھی عبدالرحمان کی سرگذشت جو مجھ سے بچھڑنے کے بعد اس پر بیتی۔ اسکے علاوہ پانچ دوسرے افسروں کی داستان بھی کافی دلچسپ ہے۔ ان پانچ میں سے ایک افسر میجر مقبول سے حال ہی میں ملاقات ہوئی تو اس نے اس واقعے کی روداد کچھ یوں بیان کی۔

'جون 1971 ڈھاکہ پوسٹنگ کے بعد نومبر 71 میں نے 27 برگیڈ سگنل کمپنی میں رپورٹ کی۔ یہ براہمن باڑیا میں تھی جہاں جنگ کا سماں تھا۔ بھارت کی جانب سے گولہ باری ہوتی رہتی تھی۔ چند دنوں کے بعد ہمیں یہاں سے آشوگنج اور بھیراب بازار جانا پڑا۔ یہاں دریائے میگھنا گزرتا ہے اور اس کے اوپر تقریبا 400 میٹر (اس کی اصل لمبائی 930 میٹر ہے) ریلوے کا پل ہے۔ یہ دسمبر کا پہلا ہفتہ تھا۔ یہاں سے بھی دشمن کے ساتھ جنگی کاروائیاں ہوتی رہیں جن کا تفصیلی ذکر برگیڈئیر سعداللہ کی کتاب ایسٹ پاکستان ٹو بنگلہ دیش میں موجود ہے۔

غالبا 16 دسمبر کی صبح جب ایک حملے کی تیاری ہو رہی تھی تو انڈین آرمی کی طرف سے وائرلیس پر کہا گیا کہ فائر مت کرو ڈھاکہ نے سرنڈر کر دیا ہے جس پر ڈھاکہ ایسٹرن کمانڈ ہیڈکوارٹر سے رابطہ کیا گیا تو ہمیں بتایا گیا کہ سیز فائر ہو گیا ہے اور اب اس پر عمل کرو۔ یہ پیغام جنرل عبدالمجید اور برگیڈئیر سعداللہ جو وہاں موجود

تھے کو دیا گیا۔ یہ بعد میں معلوم ہوا کہ ہم نے سرنڈر کر دیا ہے نہ کہ سیز فائر۔ بھیراب بازار سے نکلنے سے پہلے بریگیڈیئر سعداللہ نے تمام افسروں کو خطاب کیا اور کہا کہ فوج میں ہر حکم کی تعمیل ضروری ہے لیکن یہ بھی تلقین کی کہ موقع ملنے پر فرار کی کوشش کریں اور پاکستان پہنچیں۔ یہ ایک بات میرے ذہن میں گھر کر گئی۔

بھیراب بازار میں ہمارے ساتھ کمانڈوز کے کچھ افراد بھی تھے جو گاہے بگاہے دشمن کے عقب میں جا کر کاروائیاں کرتے تھے۔ ان میں میجر عبدالقادر سگنلز اور کیپٹن اکبر انفنٹری سے تھے۔ چند روز میں ہمیں یہاں سے ڈھاکہ لے جایا گیا اور پھر بذریعہ اسٹیمر اور ریل بریلی میں قائم جنگی قیدی کیمپ نمبر 85 میں لے جایا گیا۔ جس بیرک میں ہمیں رکھا گیا وہ شاید AT رجمنٹ کے گھوڑوں کا اصطبل تھا کیونکہ دیواروں کے ساتھ لوہے کے کنڈے لگے ہوئے تھے۔ چند دنوں بعد ہندوستانیوں کو احساس ہوا کہ یہ کیمپ بہت overcrowded ہے اس لئیے ہمیں بتایا گیا کہ کچھ افسروں کو میرٹھ منتقل کیا جائیگا اس لئیے کوئی جانے کے لئیے اپنا نام دے دے تو انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ یہ خبر سنتے ہی میجر عبدالقادر کو فرار کی کوئی امید نظر آئی کیونکہ وہ شروع سے ہی فرار کے لئیے بیتاب تھے۔ انہوں نے کمانڈو کے ایک سابقہ افسر کیپٹن اصغر اور میرے علاوہ بہت سے دیگر افسروں سے پوچھا جس کے نتیجے میں میں اور چند اور فرار کی کوشش کے حامی ہو گئے۔ کیپٹن عبدالرحمان سگنلز میجر عبدالقادر کے چھوٹے بھائی بھی اسی کیمپ میں تھے اور بھائی کی طرح وہ بھی بہادر اور مہم جو افسر تھے۔ وہ بھی فرار کے پلان میں اہم حصہ بن گئے۔

یہاں تھوڑا یہ بھی عرض کر دوں کہ ہمارے چند ساتھی افسروں کا خیال تھا کہ انڈین ہمیں زیادہ دیر نہیں رکھ سکیں گے اور چند ماہ میں ہمیں پاکستان بھیج دیا جائیگا جس کی وجہ سے کچھ افسروں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ ان کا خیال تھا کہ فرار

اپنی جان لگا دینے کے مترادف ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلح افراد کے پہرے سے بھاگنا کوئی مذاق کی بات نہیں جبکہ کہ گارڈ کو اس صورت حال میں فائر کھولنے کی اجازت ہوتی ہے بلکہ یہ ان کی ڈیوٹی میں شامل ہے۔ چار پانچ گھنٹے کے سفر کے بعد بسیں ایک ہوٹل کے پاس ہمیں چاہے پلانے کے لیئے رکیں۔ چاہے پیتے ہوئے کیپٹن عبدالرحمان نے پوچھا کہ کیا خیال ہے جس کے جواب میں میں نے کہا کہ نیک خیال ہے۔ اس نے کہا کہ تم تو دوسری بس میں ہو یہ کیسے ممکن ہوگا ہاں اگر کسی کے ساتھ اپنی سیٹ بدلا لو۔ پنجاب رجمنٹ کا کیپٹن فاروق فرار کے لیئے آمادہ نہیں تھا اس لیئے میں نے اس سے اپنی سیٹ بدلی اور یوں میں بس نمبر ا میں آ گیا۔ میجر عبدالقادر نے اس دوران مختلف افسروں کو گارڈز سے نمٹنے کے لیئے مختلف Tips دیئے۔ جب ہمارا سفر دوبارہ شروع ہوا تو مغرب کا وقت قریب آ رہا تھا۔

ہم بس میں کچھ اس ترتیب سے بیٹھے ہوئے تھے۔ ڈرائیور سے پچھلی سیٹ پر 3 گارڈز بیٹھے تھے اور ان کی برابر والی سیٹ پر ہمارے دو کرنیل جن کے نام یاد نہیں۔ تیسری یا چوتھی سیٹ پر میجر عبدالقادر جب کہ آخری سیٹ پر 4 گارڈز تھے۔ میں پچھلے دروازے کے آگے کیپٹن صدیقی کے ساتھ بیٹھا جس پر اس سے قبل کیپٹن فاروق تھا۔ ہم سے اگلی سیٹ پر کیپٹن ایاز طوسی اور ایک دوسرا افسر بیٹھا تھا۔ میجر عبدالقادر اور کیپٹن عبدالرحمان کافی چوکنے ہو کر بیٹھے تھے۔ اچانک کیپٹن عبدالرحمان نے گارڈز کو پچھلے شیشے سے باہر دیکھنے پر اکسایا۔ اور ان کے پیچھے مڑ کر دیکھتے ہی ان پر جھپٹا اور اس دوران میجر عبدالقادر چیتے کی طرح لپکا اور آگے بیٹھے ہوئے گارڈز کو قابو کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس دوران ڈرائیور نے بس روک کر نیچے چھلانگ لگا دی اور ساتھ کنڈکٹر بھی نیچے اتر کر بھاگ پڑا۔ گارڈز جو اس اچانک حملے سے حواس باختہ ہو گئے تھے اپنی رائفلیں لوڈ کرنے لگ گئے۔ اس کشمکش

میں کچھ افسر باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان کو دیکھ کر میں نے بھی موقع غنیمت جانا اور بس سے نکل کر بھاگ پڑا کیونکہ بس میں رہتے ہوئے بھی فائر ہونے پر زخمی یا مرنے کے امکانات تھے اس لیئے باہر نکل کر چانس لینا زیادہ مناسب لگا۔ مجھ سے پہلے باہر نکلنے والے چار افسر کیپٹن آصف، کیپٹن خلیق، کیپٹن ممتاز اور کیپٹن آفتاب تھے جن کے ساتھ میں شامل ہو گیا۔ شروع شروع میں تیز دوڑتے رہے لیکن تھوڑی دور جا کر ایک افسر کہنے لگا کہ میں مزید بھاگ نہیں سکتا اور رک گیا۔ ہم اسے کچھ آگے تک تقریبا گھسیٹ کر لے گئے۔ مغرب کا وقت ختم ہوتے ہی اندھیرا چھا گیا۔ دور سے فائرنگ کی آواز آئی تو ہم نے خیال کیا کہ شاید یہ فائرنگ بس میں ہمارے باقی رہ جانے والوں افسروں پر کی جا رہی ہے جو بعد میں غلط ثابت ہوا۔

سوائے کیپٹن آصف کے کسی کے پاس سویلین کپڑے نہ تھے اور نہ ہی کوئی پیسے۔ ہم نے فوجی وردی اور اوپر فوجی جرسی پہنی ہوئی تھی۔ آدھ گھنٹے دوڑنے اور تیز چلنے کے بعد ہم کوئی دو میل آگے آ گئے تھے۔ ایک پگڈنڈی پر تیز تیز چلتے رہے۔ ساتھ گنے کے کھیت تھے جہاں سے ہم نے گنے توڑ کر اپنی پیاس بجھائی۔ وردیوں سے اپنے فوجی رینک اتار کر ایک کھالے میں پھینک دیئے۔ 4,5 میل چلنے کے بعد ایک نہر پر پہنچے تو دور ٹرین کے چلنے کی آواز آئی۔ ہم جب کسی گاؤں کے قریب سے گذرتے تو ہم پر کتے بھونکتے۔ ان سے بچتے بچاتے راستہ ڈھونڈتے ہم رات کے ایک بجے جی۔ ٹی روڈ پر آ گئے اور اس پر چلنا شروع کر دیا۔ ہمارے پاس سے اکا دکا گاڑیاں گذرتی رہیں۔ ہم نے آپس میں طے کیا کہ پکڑے جانے کی صورت میں ہمارا ایک ہی بیان ہونا چاہیے اور وہ یہ کہ بس میں بھگدڑ مچی تو ہم نے نیچے چھلانگ لگا دی۔ کیونکہ جنگی اصولوں کے تحت فرار ہونا ہر قیدی کا حق ہوتا ہے جو ہم نے استعمال کیا ہے۔

ہم نے فیصلہ کیا کہ اپنے اور جائے واردات کے درمیان فاصلہ بڑھانے کی خاطر کسی گاڑی میں سواری لی جائے۔ چونکہ آصف نے سولین کپڑے پہن رکھے تھے اس لیئے اسے بس وغیرہ روکنے کے لیئے آگے کیا۔ اس نے ایک ٹرک کو روک کر ڈرائیور سے کہا کہ ہم نے دہلی جانا ہے اور اس کے لیئے اس نے کچھ کرایہ جو شاید دس روپے تھا دینے کی پیش کش کی۔ ہم ٹرک کے پچھلے حصے جس میں خالی ڈرم پڑے ہوئے تھے چڑھ کر بیٹھ گئے۔ ابھی چند میل ہی گئے ہونگے کہ ٹرک رک گیا۔ ڈرائیور نے ہمیں پیچھے آ کر کہا کہ تم لوگ نیچے اتر جاؤ میں تمہیں چنگی کے آگے سے دوبارہ اٹھا لوں گا۔ آگے ایک چھوٹی سی چنگی تھی جہاں پولیس والے چیکنگ کر رہے تھے۔ انہوں نے ہمیں آواز دیکر پاس بلایا اور پوچھا کہ کون ہو اور کہاں سے آ رہے ہو۔ ہم نے راستے میں ایک گاؤں کا نام پڑھا تھا سو کہا کہ ہم اسکاؤٹ ہیں اور رام پور سے آئے ہیں۔ وہ تو پہلے ہی ہماری تاک میں تھے اس لیئے بولے کہ تھانے چلو وہاں تمہاری بات کی تصدیق ہوگئی تو چھوڑ دیں گے۔ ہمیں بھاگنے کی کوئی راہ نظر نہ آئی تو ان کے ساتھ چل پڑے۔ پولیس والوں کی گفتگو سے پتا لگ رہا تھا کہ انہیں ہمارے بارے میں علم ہے اور وہ ہماری ہی تاک میں تھے۔ تھانہ کوئی آدھ گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ ہاپڑ تھانے پہنچے تو تھانیدار نہایت خوش اخلاقی سے پیش آیا۔ ہم سے پوچھا کہ باقی لوگ کدھر ہیں جس سے پتہ لگا کہ کچھ اور لوگ بھی بس سے فرار ہوئے ہیں۔

ہمیں تھانیدر نے کہا کہ سچ سچ بتا دیں کہ آپ کون ہیں ورنہ ہمیں دوسرا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔ اسے بتایا تو اس نے پاکستان میں ہمارا پتا پوچھا اور درج کیا۔ آصف نے اپنا پنڈی کا پتہ لکھوایا تو اس نے بتایا کہ اس کا بھی تعلق پنڈی سے ہے۔ اس نے مزید پوچھا کہ پنڈی اب کہاں تک پھیل گیا ہے۔ آصف نے اسے بتایا تو خوش ہوکر اس نے ہمارے لیئے چائے اور بسکٹ منگوائے۔ بیان مکمل ہونے کے

بعد ہم دو دو کے ہاتھ آپس میں ہتھکڑیوں سے باندھ دیئے اور ہمیں حوالات میں بند کر دیا۔ صبح فجر کی اذان کے قریب ہمیں ایک جیپ میں گارڈ کے ہمراہ بٹھا کر میرٹھ روانہ کیا۔ ساڑھے سات بجے کے قریب ہم وہاں پہنچے تو تھانیدار نے ہمیں چائے پلائی۔ ابھی ہم چائے پی رہے تھے کہ ایک کرنل مع کچھ سپاہیوں کے وارد ہوا۔ اس نے ہمیں چائے پیتے دیکھا تو تھانیدار سے کہا کہ تم انہیں چائے پلا رہے ہو ان کے تو تمہیں ہاتھ پاؤں توڑنے چاہیے تھے۔ وہ چلا گیا تو تھانیدار نے کہا کہ آپ چائے پی لیں۔ کچھ دیر بعد کچھ فوجی جوان آئے اور ہمیں ایک تھری ٹن ٹرک میں بٹھا دیا۔ ایک ساتھ ہتھکڑی میں بندھے ہوئے تھے اس لیئے جھٹکوں کی وجہ سے ہمیں کافی تکلیف ہوئی۔ ہماری کوشش تھی کہ اپنے داہیں باہیں دیکھیں لیکن سنتریوں نے کہا کہ نیچے دیکھو اور رائفل کے آگے بینٹ Bayonet پر چڑھے خول کی ٹھوکر میرے سر پر ماری جس سے خون بہہ نکلا۔ تقریباً نصف گھنٹے بعد ٹرک رک گیا اور ایک گیٹ کھلنے کی آواز آئی۔ ہمیں گھسیٹ کر اتارا گیا اور جو گارڈ ہمارے ساتھ بسوں میں تھے ہم پر پل پڑے۔ کسی نے ٹھوکروں کسی نے رائفل کے بٹ اور کچھ نے مکوں سے ہماری تواضع کی۔ اس دوران ہم اپنے سروں کو بچانے کی کوشش کرتے رہے۔ ایک سیٹی کی آواز پر ہماری مار پیٹ رک گئی۔ ہمیں دوبارہ ٹرک میں بٹھایا گیا۔ ایک ڈاکٹر آیا اور پوچھا کہ کسی کو چوٹ تو نہیں لگی۔ میں نے اپنے سر کی طرف اشارہ کیا تو کہنے لگا یہ تو معمولی ہے اور کہا کہ کسی اور کی ہڈی کا کوئی فریکچر تو نہیں ہوا۔ ٹرک چلنے سے پہلے ہماری آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی اور ہاتھ بہت کس کر باندھ دیئے گئے اتنے سخت کہ ہماری انگلیاں سوج گئیں۔ میرے شور کرنے پر ڈاکٹر کو بلایا گیا جس نے کہا کہ رسیاں ڈھیلی کریں ورنہ ان کے ہاتھ کاٹنے پڑیں گے۔ اس کے بعد رسیاں ڈھیلی کر دی گئیں۔ منزل پر پہنچ کر ہمیں کھانا کھانے والے کمرے میں بند کر دیا گیا۔ دو تین

دن کھانے کو گالیاں اور پینے کے لیئے مار پیٹ ملتی رہی ۔ پورے دن میں ہمیں صرف ایک دفعہ صبح اور ایک دفعہ شام کو رفع حاجت کے لیئے لے جایا جاتا تھا۔ وقفے وقفے سے انڈین آرمی کے افسر آتے تھے اور ہم سے پوچھتے تھے کہ منصوبہ کس کا اور کیا تھا۔ ایک افسر کے یہ سوال کرنے پر جب میں نے اردو میں جواب دیا تو اس نے میری کنپٹی پر ٹھوکر لگائی۔ اتنی زور سے جیسے فٹ بال کو لگاتے ہیں۔ کہنے لگا کہ یہ سالا ہندی بھی جانتا ہے۔ شاید اسے معلوم نہیں تھا کہ ہندی اور اردو ایک دوسری سے ملتی جلتی زبانیں ہیں۔ رات کو ہماری رسیاں اتنی ڈھیلی کر دی جاتیں کہ ہم ایک پہلو پر سو سکیں ۔ دو دن بعد میجر قادر کو ہمارے کمرے میں لا کر بند کر دیا گیا۔ اس جگہ ہم 14,15 دن رہے۔ ریڈ کراس کی ٹیم آئی تو ہندوستانیوں کا رویہ ہمارے ساتھ کافی بہتر ہو گیا اور ہمیں بیرک میں باقی افسروں کے پاس بھیج دیا گیا۔

کیمپ 40 اور قید تنہائی

اگلی بس میں اس ہنگامے کے بعد صرف دو سنتری رہ گئے تھے لیکن اندھیرے کے باوجود کسی نے بھاگنے کی کوشش نہیں کی حالانکہ اس میں کچھ افسر وہ بھی تھے جو بریلی میں ہمارے اس منصوبے میں شامل تھے اور ان میں ایک سابقہ کمانڈو افسر کیپٹن اصغر بھی موجود تھا۔ کیمپ کے پاس پہنچ کر سب کو اتارا گیا لیکن مجھ میں اٹھنے کی ہمت نہیں تھی۔ کسی نے سہارا دے کر اتارنے کی بھی کوشش نہیں کی۔ بائیں ہاتھ سے اپنا تھیلا گھسیٹ کر بس سے اترا لیکن کھڑے ہونے کی کوشش میں گر پڑا۔ کیپٹن طوسی نے میرا

سامان اٹھایا اور ایک دوسرے افسر نے سہارا دے کر کمرے تک پہنچا دیا۔ ہندوستانیوں کا خیال تھا کہ مجھے سیل cell میں رکھا جائے لیکن فی الحال میری حالت کے پیشِ نظر ایسا نہیں کیا گیا۔

اس کیمپ میں کمرے بڑے کشادہ تھے۔ایک کمرے میں سگنل کے افسروں کے ساتھ مجھے رہنے کی جگہ ملی۔سونے کے لیئے لوہے کی چارپائیاں جن پر ناریل کے گدے تھے رکھی گئی تھیں۔ شاید اس سے پہلے یہ دو بیرکیں قیدیوں کے لیئے کیمپ اسپتال کے طور پر استعمال ہوتی ہونگی۔سر پر چھ سات بڑے زخم تھے لیکن ابھی تک میری مرہم پٹی کسی نے نہیں کی تھی۔ صبح ایک بنگالی ڈاکٹر نے زخموں پر کوئی دوائی لگا کر پٹیاں کر دیں۔ پچاس روپے (ہندوستانی) گدے کے اندر چھپا دیئے۔صبح سویرے میجر کفیل تیمارداری کے لیے آیا لیکن اسے دیکھتے ہی غصہ آ گیا۔ میں نے اسے ذرا اونچی آواز میں کہا کہ میرے سامنے سے ہٹ جاؤ۔ وہ یہ کہہ کر کہ شاید تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں واپس چلا گیا۔کمرے کے افسر فرار کی کوشش میں حصہ نہ لینے پر کچھ شرمندہ سے تھے اور میری بڑی خدمت کر رہے تھے۔

دوسری صبح ایک کمینہ فطرت افسر کیمپ میں آیا اور سب کو باہر فالن کر کے کہا کہ تم اب افسر نہیں رہے اسلئے تمہیں چارپائیاں استعمال کرنے کا کوئی حق نہیں. دوسری بیرک کے افسروں سے جو اگلی بس میں سوار ہو کر آئے تھے یہ سلوک نہیں کیا گیا۔ ہندوستانیوں کے خیال کے مطابق یہ منصوبہ بریلی میں اسی کیمپ کے افسروں نے روانگی سے پہلے بنایا تھا چونکہ ایسا منصوبہ راستے میں نہیں بن سکتا تھا۔ حیرت ہوئی کہ مجھے ابھی تک چارپائی سے نیچے کیوں نہیں لٹایا گیا۔

صبح سویرے کھڑکی سے آنکھوں پر پٹی اور ہاتھ رسی سے بندھے پانچ افسروں کو ڈائنگ روم کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ ایسے لگا جیسے پکڑے جانے

والوں میں عبدالرحمان بھی شامل ہے ۔ سخت مایوسی ہوئی ۔ سوچا تھا چلو خود نہ سہی باقی سات افسر تو بھاگنے میں کامیاب ہو گئے ہیں ۔ باہر کھڑے کسی افسر سے پوچھنے پر پتا چلا کہ ارشاد اور عبدالرحمان کے علاوہ باقی سب پکڑے جا چکے ہیں ۔ انہیں میس کے لیئے مختص کی گئی بیرک کے ایک بڑے کمرے میں جہاں صرف ایک دروازے کے علاوہ کوئی کھڑکی یا روشندان نہیں تھا بند کر دیا گیا ۔

یہ کیمپ بہت ہی تنگ تھا ۔ 50x50 گز کے رقبے میں چار بیرکیں ، لیٹرینیں اور غسل خانے تھے ۔ ہر بیرک کے گرداگرد بھی تاروں کی باڑیں تھیں ۔ لیٹرینوں تک جانے کے لیے بھی راستے کے دونوں طرف تاریں لگی ہوئی تھیں ۔ خالی جگہوں کے اندر جانے کا کوئی راستہ نہیں چھوڑا گیا تھا ۔ بیرکوں کے سامنے کی طرف صرف ایک ایک گز جگہ خالی تھی ۔ کیمپ کے دو اطراف سے سڑکیں گزرتی تھیں جس پر فوجی ٹریفک کے علاوہ سویلین بھی کافی تعداد میں آتے جاتے رہتے تھے ۔ سڑک کے پار پی او ڈبلیو کیمپ کا گروپ آفس تھا اور دوسری طرف ہندوستانی فوجیوں کے فیملی کوارٹرز ۔ چونکہ غسل خانے اور لیٹرینیں اُس طرف تھیں اس لیئے باوجود ناقابلِ برداشت سڑاند اور بدبو کے جو کے ٹرنچ لیٹرینوں کے اندر سے اٹھتی رہتی تھی کچھ یار لوگ نلکے کے پاس کھڑے کافی دیر تک دانت صاف کرتے رہتے تھے ۔

ٹرنچ لیٹرینیں بھی کیا خوب چیزیں تھیں ۔ ایک عموماً چھ فٹ چوڑے بیس فٹ لمبے اور آٹھ فٹ گہرے گڑھے کے اوپر تختے لگا دیئے جاتے تھے ۔ ان تختوں میں مناسب وقفے پر سوراخ تھے جن کے اوپر بیٹھ کر طبع آزمائی کرنی پڑتی تھی ۔ کچھ عرصہ استعمال کے بعد ان کے نزدیک جانا بھی دل گردے کی بات تھی ۔ مکھیوں کا ایک طوفان ہوتا تھا جو چند منٹوں میں کسی بدنصیب حاجت مند کو آناً فاناً ڈھانپ لیتا تھا ۔ اس پر طرہ یہ کہ ہر وقت غسلِ صحت کا دھڑکا بھی لگا رہتا تھا کہ یہ جا کہ وہ جا ۔

کہاں سے کہاں نکل گیا۔

ان پانچ افسروں کو کمرے میں بند کر کے باہر سنتری کھڑا کر دیا گیا۔ایک دو گھنٹوں کے بعد سویلین کپڑوں میں ملبوس فوج کے خفیہ ادارے کا ایک میجر اور اس علاقے کا اے۔آئی۔جی AIG پولیس میرے پاس آئے۔کافی دیر تک مجھ سے میرے پلان کے بارے میں پوچھتے رہے۔لیکن میں اپنی مخصوص من گھڑت کہانی پر اڑا رہا۔تھک ہار کر آخر کار کہنے لگے کہ تم عبدالرحمٰن کو جانتے ہو کیونکہ اس کا تعلق بھی 3 سگنل بٹالین سے ہے اور کیا اسکا یہاں اور کوئی رشتہ دار موجود ہے؟ میں نے اس کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا تو جاتے جاتے میجر کہنے لگا کہ تمہارے پانچ دوستوں کو ہم نے پکڑ لیا ہے۔میں نے پوچھا کہ ان کا کیا حال ہے تو وہ چڑ سا گیا اور کہنے لگا تم بھی انکے ساتھ جانا پسند کرو گے۔ میں نے کہا ہاں کیا مضائقہ ہے۔شام کو مجھے بھی اس ٹھنڈے تاریک کمرے میں ڈال دیا گیا۔فروری کی سخت سردی اور تازے زخموں سے نڈھال میں ننگے فرش پر پڑا ہوا تھا۔میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی اور میرے کہنے کے باوجود کہ میرے ہاتھ کی ہڈی ٹوٹی ہوئی ہے ہاتھ رسی سے جکڑ دیئے گئے لیکن اتنی رعایت کی گئی کہ بجائے پیچھے باندھنے کے ہاتھ آگے کر کے باندھے گئے ۔آنکھوں پر پٹی کی وجہ سے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ کہاں پڑا ہوا ہوں۔

فروری کا مہینہ نہ کوئی کمبل نہ کوئی بوری نہ اوڑھنے کے لیئے کوئی اور چیز۔ ماسوائے ٹھنڈی وردی کے پہنا ہوا بھی کچھ نہیں تھا اور صبح سے پیٹ کے اندر بھی کچھ نہیں گیا تھا۔ رات کو جب کسی سکھ کی ڈیوٹی آئی تو اس نے اپنے ساتھی سے کہا 'اُے ای او موچھاں والا' اور اپنے بھاری بھرکم بوٹوں سے زخموں کو تازہ ہوا کھلا دی۔ رات کے دو بجے کے قریب کسی سنتری نے مجھ پر گھوڑوں پر ڈالنے والا

ایک بوسیدہ کمبل ڈال دیا۔ باوجود سڑاند کے وہ کمبل کسی خدائی نعمت سے کم نہیں لگ رہا تھا۔ نیند کیا خاک آنی تھی بہرحال اذیت میں کچھ کمی آ گئی ۔لیکن جس کروٹ سونا چاہا اُسی جگہ کسی زخم یا چوٹ کا درد محسوس ہوا۔صبح ہوئی تو پٹی آنکھوں سے سرک گئی تھی ۔اپنے باقی ساتھیوں پر نظر پڑی ۔کئی ایک کی حالت کافی خستہ نظر آئی ۔ایک تو رات بھر کراہتا رہا۔اس کی کمر میں کسی نے پکڑے جانے کے بعد بَٹ کی ٹھوکر ماری تھی ۔ان کے پکڑے جانے کے بعد ہندوستانی کافی خوش تھے اور پولیس اسٹیشن میں ان کے ساتھ بہتر سلوک کیا گیا۔فوج کی تحویل میں دیئے جانے کے بعد کے تشدد سے سب کو کچھ نہ کچھ میسر آ گیا تھا۔

سارے افسر ایک عجیب منظر پیش کر رہے تھے۔ ہر ایک اپنی ہی سوچوں میں گم تھا۔ پیچھے بندھے ہاتھوں کی وجہ سے کافی تکلیف میں تھے۔ایک آدھ اور نے بھی آنکھوں کی پٹی سرکا لی اور پہچان کر ہلکے سے مسکرائے ۔آپس میں بات کرنے کی اجازت نہیں تھی ۔سرگوشی اس لیئے نہیں ہوسکتی تھی کہ ہمیں درمیان میں کافی فاصلہ رکھ کر لمبی دیواروں کے وسط اور کمرے کے کونوں میں الگ الگ بٹھایا گیا تھا۔ میں دروازے کے بالکل قریب تھا۔ایک سنتری اندر اور ایک سنتری باہر متعین تھا۔صبح کمبل واپس لے کر ہمیں دیواروں کے ساتھ بٹھا دیا گیا ۔مجھے بھی سنتری نے بیٹھنے کے لیئے کہا لیکن تھوڑی دیر کے بعد لڑھک کر لیٹ گیا۔

صبح ایک کپتان آیا تو میں نے اس سے پوچھا کہ آپ نے ہماری آنکھوں پر پٹیاں اور ہاتھوں میں رسیاں کیوں باندھ رکھی ہیں جبکہ ہم کمرے کے اندر بند ہیں؟ یہ صریحاً جینوا کنونشن کی خلاف ورزی ہے۔ بھلا ہو بیچاری جینوا کنونشن کا کہ اُسے موٹی سی گالی دیتے ہوئے اس نے کہا کہ تم لوگ اس قابل نہیں کہ تمہارے ساتھ انسانوں جیسا سلوک کیا جائے۔میں نے اس سے کہا کہ میں کمانڈنٹ سے ملنا

چاہتا ہوں۔ کچھ دیر بعد کمانڈنٹ ڈاکٹر کو ساتھ لیکر آیا۔ پٹی کے نیچے سے دیکھا تو یہ وہی بنگالی ڈاکٹر تھا جس نے میری مرہم پٹی کی تھی لیکن کمانڈنٹ نظروں سے اوجھل رہا ۔ میرے کہنے کے باوجود کہ میرے بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے پاس نہیں آیا۔ بہر حال کمانڈنٹ کے جانے کے بعد میری آنکھوں کی پٹی کھول دی گئی۔

دو تین دنوں تک کمرے میں آنے جانے والوں کا تانتا بندھا رہا۔ زیادہ تر ہندوستانی افسر تھے جو ہم لوگوں کو دیکھنا چاہتے تھے۔ بس والا سیکنڈ لیفٹیننٹ بھی آیا اور قریب آ کر میرا حال پوچھا اور کہا کہ اب تو اپنا پلان بتا دو۔ پھر خود ہی کہنے لگا کہ مجھے پتہ ہے آپ لوگ بس کو ہائی جیک کر کے لے جانا چاہتے تھے۔ اُسے نہ جانے کس طرح پتہ لگا کہ مجھے اپنے ہی افسروں نے پکڑا تھا۔ ایسا لگا کہ وہ اس بات پر خوش نہیں تھا۔ بہر حال اس نے ہماری فرار کی کوشش کو دل سے سراہا۔ نوجوان افسر کسی بھی ملک کے ہوں اس طرح کے ایکشن میں بہت دلچسپی رکھتے ہیں۔ ہمیں کھانے کیلئے صرف شام کو ایک ایک چپاتی اور سالن دیا جاتا تھا۔ کھانا اپنے ہی سپاہی دینے آتے تھے۔ ان سے کہا گیا تھا کہ ہمیں ہاتھ کھول کر کھانا کھلائیں۔ وہ عموماً دوبارہ رسی باندھتے وقت اسے کافی سخت کر دیتے تھے۔ ہمارے کہنے کے باوجود ڈرے ہوئے E.P.C.A.F کے بہاری سپاہی رسی ڈھیلی نہیں کرتے تھے۔ ان کے جانے کے بعد سنتری چیک کر کے اسے خود ہی ڈھیلی کر دیتے تھے۔ رات کو دروازہ بند کر کے باہر سے تالا لگا کر ایک سنتری باہر پہرے پر کھڑا کر دیا جاتا تھا۔ میں دروازہ مقفل ہونے کے بعد آصف کے قریب کھسک گیا۔ اس نے مجھے چھوڑ کر بھاگ جانے پر شرمندگی کا اظہار کیا۔ دو تین گھنٹے تک ہم مسلسل باتیں کرتے رہے۔ شاید زندگی میں اتنی دیر تک میں نے کسی سے باتیں نہ کی ہونگی۔ سارے دن کی چپ کا اثر تھا ورنہ میں تو بہت کم گو واقع ہوا ہوں (یہ اور بات ہے کہ لکھنے میں کچھ تفصیل میں جا رہا

ہوں) باقی افسروں سے بھی باتیں ہوئیں ۔کیپٹن ساجدکیمپ میں اپنے کسی افسر کے ساتھ لڑائی کی پاداش میں یہاں بھیج دیا گیا تھا۔اسطرح اسے ہمارے ساتھ ہی سزا بھگتنی پڑ رہی تھی ۔

کچھ دنوں میں میرے زخم گندگی اور مرہم پٹی کی کمی کے باوجود کچھ کچھ خشک ہوگئے تھے ۔ کمر کے اوپر سے جلد کا کچھ حصہ کاغذ کی طرح سوکھ کر اتر گیا۔ لاگ ایریا کمانڈر کی انسپکشن کی وجہ سے ہماری آنکھوں پر پھر سے پٹیاں باندھ دی گئیں ۔کمانڈر کی انسپکشن کے بعد ہمیں پھر چارپائیاں دے دی گئیں ۔سنتری ہم سے کچھ کچھ مانوس ہو گئے تھے ۔زیادہ تر سکھ تھے یا یوپی کے رہنے والے ہندو۔کیپٹن خلیق کے والدین اَٹاوہ سے تقسیمِ ہند کے وقت ہجرت کر کے گئے تھے۔ یہ جان کر سنتری بہت خوش تھے۔ ان سے باتوں باتوں میں کچھ خبریں بھی مل جاتی تھیں ۔ بقول انکے عبدالرحمان اور ارشاد ابھی تک پکڑے نہیں گئے تھے ۔ایک سکھ سنتری نے اپنے آپ کوسکھ سنٹر میں ایجوکیشن کا این ۔سی ۔اوNCO ظاہر کیا لیکن ایک دن ایک سوال پوچھ کراس نے اپنے سکھ ہونے پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ کہنے لگا کہ کیا پاکستان وچ کہنٹہ (گھنٹہ) ترہیاں(30) منٹاں دا ہوندا اے کیوں کہ جدوں اتھے اٹھ وجدے نے تے پاکستان وچ ساڑھے ست ہوندے نے ۔ہم اس بات کی تائید کے علاوہ اورکیا کہہ سکتے تھے ۔سگریٹ پینے والوں کوکیمپ کے افسر کھانا لانے والے سپاہیوں کے ہاتھ سگریٹ بھیجتے رہتے تھے جن میں سے کچھ یہ راستے میں اڑا لیتے تھے ۔ ان میں دو بہاری سپاہی بہت اچھے تھے اور باوجود خطرے کے کبھی کبھی ایک آدھ چپاتی فالتو لے آتے تھے ۔کافی دنوں تک مجھ سے ایک پوری چپاتی بھی نہیں کھائی جاتی تھی ۔ باقی آصف کو دیدیتا یا واپس کر دیتا۔

کیمپ میں واپس جانے سے ایک دن پہلے ایک ہندوستانی حوالدار آ کر

ہماری کمر اور پتلونوں کے پیچھے کالے پینٹ سے کراس (کاٹے کا نشاں) لگانے کے لیئے آیا۔ کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا کہ ہندوستانی اب اس حد تک ذلالت پر اتر آئے ہیں۔ میں نے اس سے کہا کہ کراس لگوانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ بضد ہوا تو میں نے اسے کیمپ کمانڈنٹ کو بلا لانے کے لیے کہا۔ لیکن وہ ایک نائب صوبیدار کو بلا لایا۔ اس نے بتایا کہ کیمپ میں سب افسروں نے کراس لگوا لیے ہیں۔اس کے ساتھ آئے ہوئے پاکستانی سپاہیوں نے بھی اس کی تائید کی۔ مجھے یہ کہہ کر چھوڑ دیا گیا کہ تھوڑی دیر اور سوچ لو ورنہ ہم کچھ اور طریقہ اختیار کریں گے۔

ان کے جانے کے بعد باقی افسروں میں کھسر پھسر شروع ہوگئی۔ کچھ مہر لگوانے میں ہی اپنی عافیت سمجھتے تھے۔ان کا خیال تھا کہ اگر ہم نے مزید انکار کیا تو شاید ہماری متوقع 'قیدِ تنہائی' سے ہماری رہائی کھٹائی میں پڑ جائے۔ حیرت تھی کہ کیپٹن ساجد جس نے بس میں میری نشان دہی کی تھی اور کیپٹن آصف میرا ساتھ دینا چاہتے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ ہر ایک کی اپنی مرضی ہے میں کسی کو نہیں کہتا کہ وہ نشان لگوائے یا نہ لگوائے۔ میں ان کی حالت جانتا تھا۔ پندرہ دنوں سے جس حال میں وہ رہ رہے تھے شاید اس سے زیادہ ان میں ہمت نہیں تھی خاص کر جب کہ انہیں پتہ چل گیا تھا کہ باقی افسروں نے اس طرح کا نشان لگوا لیا ہے۔

ہندوستانیوں نے دوبارہ آکر ہم تینوں کے علاوہ باقی افسروں کو نشان لگا دیئے۔ آصف اور ساجد بضد تھے کہ جب تک میجر قادر نہیں لگواتے ہم بھی نہیں لگوائیں گے۔ بہت کہا کہ آپ لوگ میری پرواہ نہ کریں لیکن وہ نہیں مانے۔حوالدار جو ہندو ذہنیت کا ایک مکمل نمونہ تھا اب دھاڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرے مسلسل انکار پر کیمپ سے ہمارے چار سپاہیوں کو پکڑ لایا کہ صاحب کو جکڑ کر مہر لگا دو۔ جوان جونہی آگے بڑھے میں نے ان سے کہا کہ خبردار جو مجھے ہاتھ

لگا یا تم یہ نشان میری لاش پر ہی لگا سکتے ہو۔ حوالدار عجیب تذبذب میں تھا کہ کیا کرے۔ بالآخر کیمپ میں آئے ہوئے ایک عمر رسیدہ کپتان کو بلا لایا۔ اس کے آتے ہی میں پھٹ پڑا اور جو کچھ منہ میں آیا کہہ ڈالا۔ اس نے لاکھ سمجھایا کہ نشان لگانے کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ قیدی فرار ہونے کے بعد پہچانے جا سکیں۔ لیکن میں نے اسے کہا کہ آپ لوگوں کا مقصد ہمیں مزید ذلیل کرنا ہے۔ پتلون کے پیچھے اتنا بڑا کراس لگانے کا اور کیا مقصد ہو سکتا ہے۔ اگر لگانا چاہتے ہو تو پائنچے پر بھی لگایا جا سکتا ہے۔ میں ایسی ذلت سے موت کو ترجیح دوں گا۔ بیچارہ کافی شریف آدمی لگ رہا تھا ہماری دگرگوں حالت سے کافی متاثر تھا۔ کہنے لگا کہ میں کمانڈنٹ کے فیصلے کے بعد بتاؤں گا۔ ہندوستانی سنتریوں نے اس دن ہم سے اچھا برتاؤ کیا اور آپس میں باتیں کرنے سے بھی نہیں روکا۔

دوسرے دن پندرہ دن قید تنہائی ختم ہونے پر ہمیں واپس بیرکوں میں بھیج دیا گیا لیکن کمرے کے باہر تالا لگا دیا گیا اور کسی سے بات کرنے کی اجازت نہیں دی۔ دو تین دن بعد یہ پابندی بھی ختم کر دی گئی تو میں واپس سگنلز کے افسروں کے کمرے میں آ گیا۔ کیپٹن آصف بھی میرے ساتھ اسی کمرے میں تھا۔ چند دن بعد ہم میں سے کچھ کو دوسری بیرک میں بھیج دیا گیا۔ وہاں زیادہ تر بھیرا ب بازار والے 27 بر گیڈ ہیڈ کوارٹر کے افسر تھے۔ ان میں سگنلز کا کیپٹن نسیم بھی تھا۔ ابھی تک میں زیادہ گھومنے پھرنے کے قابل نہیں تھا اس لیئے چارپائی پر ہی لیٹا رہتا تھا۔

کیمپ سے کچھ فاصلے پر ایک کیمپ میں فلم دکھائی جا رہی تھی۔ لوگوں کے کہنے پر میں بھی ان کے ساتھ چلا گیا۔ ہمیں بینچوں پر بٹھایا گیا۔ ہمارے سامنے جوان کمبل لپیٹے نیچے بیٹھے تھے۔ مجھے تصویر محل سینما لالکرتی راولپنڈی کا وہ وقت یاد آ گیا جب میں اور عبدالرحمان بچپن میں پانچ آنے کا ٹکٹ لے کر سکرین کے بالکل سامنے بنچوں پر

بیٹھ کر فلم دیکھتے تھے اور واپسی پر والد صاحب کی طرف سے سخت سرزنش اور کبھی مار بھی پڑتی تھی۔ کیونکہ تقسیم کے بعد والد صاحب کی پوسٹنگ GHQ ج۔ ایچ۔ کیو سگنل رجمنت میں ہوگئی تھی جہاں وہ 1952 تک رہے اور پہلے دو سال سرکاری گھر نہ ملنے کی وجہ سے ہمارا بچپن زیادہ تر لالکرتی میں اور اس کی گلیوں میں لڑائی بھڑائی میں گذرا اور شاید یہی تجربہ بعد میں ہم دونوں کے کام آیا۔ میرے سر میں سخت درد شروع ہوگیا لیکن چارو ناچار بیٹھا رہا کیونکہ باقی افسروں کے ساتھ ہی واپس جانا تھا۔ راستے میں جب ہمت نہ رہی اور سانس پھول گیا تو میجر انور اور میجر خالد نسیم نے گرنے سے پہلے تھام لیا اور تقریباً اٹھا کر مجھے کیمپ میں پہنچایا۔ فلم دیکھنے کا شوق پورا نہ ہوا البتہ باہر کے علاقے کا جائزہ لے لیا۔ ہمارے کیمپ اور جوانوں کے کیمپ کے درمیان تیس چالیس گز کا کھلا علاقہ تھا جہاں سے موقع ملنے پر بھاگا جا سکتا تھا۔

کیمپ میں مغربی کمان کا کمانڈر لفٹیننٹ جرنل بھگت آیا اور مجھے لیٹا دیکھ کر پوچھا کہ کیا ہوا ہے تو اسے وہی رٹی رٹائی کہانی سنائی۔ گو میں اُس کی تقریر سننے باہر نہیں گیا لیکن بعد میں افسروں نے بتایا کہ اس نے ہماری کوشش کی کافی تعریف کی اور ساتھ یہ بھی بتایا کہ کیپٹن عبدالرحمان اور ارشاد نیپال پہنچ چکے ہیں۔ خدا کا شکر ادا کیا کہ اب تو وہ جلد ہی وطن واپس چلے جائیں گے۔ کرنل رشید عموماً کافی پلانے کے لئے مجھے اپنے کمرے میں بلاتے تھے۔ باقی دونوں کرنیل مجھ سے نظریں چراتے تھے لیکن پھر بھی جب بھی سامنا ہوتا میں انہیں سلام کر دیتا تھا۔ اُن میں ایک کرنل پکے نمازی اور شریف آدمی تھے نہ جانے اس وقت کیا سوچ کر انہوں نے مجھے پکڑ لیا تھا۔ (اب کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اگر وہ مجھے کھینچ کر پیچھے نہ ہٹاتے تو پچھلے سنتری جنہوں نے ہتھیار واپس اٹھا لیئے تھے مجھے فائر کر کے ہلاک کر سکتے تھے)

باجماعت نماز پڑھنے کے بارے میں سوچا جارہا تھا۔ سامنے گروپ کمانڈر کا دفتر ہونے کی وجہ سے اونچی آواز میں اذان دینے کا مسئلہ تھا۔ میں خود ابھی تک نہ نماز پڑھتا تھا اور نہ ہی اذان دینی آتی تھی اس لیے کیپٹن عزیز سے کہا کہ اونچی آواز میں اذان دو کم از کم کچھ افسروں کا خوف و ہراس تو کم ہوگا۔ کئی ابھی تک سہمے سہمے سے رہتے تھے۔ میجر جلیل جس کا تعلق اے۔ایس۔سی ASC سے تھا اسی کور کے ایک انڈین سیکنڈ لیفٹیننٹ کے سامنے اٹینشن ہو کر کہہ رہا تھا کہ سر میں السر کا مریض ہوں اس لیے مجھے دودھ ملنا چاہیے۔

میں اپنا بازو دکھانے کے لیئے چند افسروں کے ساتھ ایم آئی روم M.I.Room گیا تو راستے میں سویلین پاکستانی شہریوں کا کیمپ نظر آیا۔ بے چارے بچے اور عورتیں کسمپرسی کی حالت میں رہ رہے تھے۔ تاروں اور جنگلوں کے درمیان کچھ بچے کھیلتے رہتے تھے۔ مردوں کا کیمپ علیحدہ تھا۔ ایم آئی روم میں کچھ سویلین آئے تو ان سے بات چیت ہوئی۔ ان کے حوصلے کافی بلند تھے۔ ہمارے مقابلے میں انہیں بہت کم مقدار میں کھانا ملتا تھا اور گوشت وغیرہ بالکل نہیں دیا جاتا تھا۔ انہیں ہفتے میں دو مرتبہ گھر والوں سے ملنے کی اجازت تھی۔ ریڈ کراس کے نمائندے بچوں کے لیئے دودھ کا بندوبست کر دیتے تھے۔ یہ جان کر کہ کئی عورتوں کے کپڑے پھٹ چکے ہیں ہم نے کیمپ میں واپس جا کر کچھ چادریں اور کپڑے ان لوگوں کے ہاتھ جن کے بچے اور بیویاں بھی کیمپ میں تھے بھیج دیئے۔ ہمارے ساتھ کیمپ نمبر 41 تھا جس میں 11 انجینئر بٹالین کے علاوہ وہ افسر بھی موجود تھے جو بھیراب بازار میں لڑائی کے دوران ہمارے ساتھ تھے۔ کیپٹن شیراز میرے ہاتھ کو سلنگ (sling) میں پڑا دیکھ کر کافی پریشان ہوا۔ موقع ملنے پر اس سے ایک آدھ بات ہو جاتی تھی کیونکہ ایک جگہ پر دونوں کیمپوں کے درمیان کوئی دس پندرہ گز کا

فاصلہ رہ جاتا تھا۔لیکن ٹاور پر کھڑے سنتری کو ہماری آپس کی بات چیت سے روکنے کی ہدایت تھی۔صبح اور شام سب افسروں کو اکٹھا کر کے گنتی کی جاتی لیکن ہندوستانی مجھے کمرے میں ہی آ کر گنتی میں شمار کر لیتے تھے جس کی وجہ سے باقی افسروں کو کچھ دیر صبح سویرے سردی میں مزید باہر کھڑا رہنا پڑتا تھا۔ یہ سوچ کر میں بھی آج باہر آیا تو حوالدار میری پتلون پر کراس نہ پا کر بپھر گیا۔ کہنے لگا کہ صاحب کراس لگوا لو ورنہ اچھا نہیں ہو گا۔اتفاقاً وہی کوارٹر ماسٹر کپتان کیمپ میں موجود تھا جسے وہ اس سلسلے میں پہلے بھی بلا کر لایا تھا۔وہ مجھے سمجھانے کے لیے اپنے ساتھ کیمپ کے سینئر پاکستانی کرنل اقبال کو لے آیا۔وہ دونوں مجھے سمجھاتے رہے لیکن میں کسی طور یہ بے عزتی برداشت کرنے کو تیار نہیں تھا۔اسی غصے اور جوش میں میں نے ایک اچھی خاصی تقریر کر ڈالی۔ان کے چلے جانے کے بعد میں واپس کمرے میں آیا تو میجر جیدی نے، جو کسی بریگیڈ میں بریگیڈ میجر تھا، میری باتوں سے متاثر ہو کر میرا ماتھا چُوم لیا۔تھوڑی دیر کے بعد حوالدار میرا بوریا بستر سمیٹ کر میس کے ساتھ والے ایک تنگ سٹور میں لے آیا۔

اب مجھے یہاں ہی رہنا تھا نہ جانے کب تک؟ کمرے میں صرف ایک چھوٹا سا روشندان تھا لیکن اسکا شیشہ اتنا دھندلا تھا کہ اس کے ہوتے ہوئے بھی سخت اندھیرا اور گھٹن محسوس ہوتی تھی۔ صبح اور شام کھانے کے لیئے دروازہ کھلتا تھا۔پچھلی قید کے برعکس کھانے میں ایک چپاتی صبح اور ایک شام کو دی جاتی تھی۔البتہ چائے پہلے کی طرح بند کر دی گئی تھی لیکن میں اس حال میں بھی مطمئن تھا۔دوسرے دن آنکھوں پر پٹی باندھ کر کیمپ کمانڈنٹ کے دفتر لے جایا گیا۔آنکھوں پر پٹی باندھ کر چلنے کا بھی ایک عجیب تجربہ ہوتا ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کولہو کے بیل کی طرح ایک ہی جگہ چکر کاٹے جا رہے ہیں۔ ہر قدم پر ٹھوکر لگنے کا اندیشہ رہتا ہے۔

کیمپ کمانڈر کے سامنے جا کر میری پٹی کھول دی گئی البتہ ہاتھ پھر بھی بندھے ہوئے تھے۔ پچاس پچپن سالہ میجر نکم میرے سامنے تھا۔ اس سے قبل میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے مجھے فردِ جرم پڑھ کر سنائی اور ایک بار پھر پوچھا کہ کراس لگواؤ گے یا نہیں؟ میرے انکار پر اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کہنے لگا کہ اس حالت میں میں تمہیں سزا نہیں دینا چاہتا لیکن میں مجبور ہوں۔ چودہ دن کی قید تنہائی کی سزا ملی۔ البتہ اس نے تاکید کی کہ ہر چار دن بعد مجھے پورا کھانا دیا جائے۔ اسکے علاوہ ایک گھنٹہ صبح اور ایک گھنٹہ شام جسمانی ورزش کے لیے باہر کھلی ہوا میں نکلنے کی اجازت تھی۔

میرے ساتھ والے کمرے میں جب افسر کھانا کھانے آتے تو میری کوٹھڑی کا دروازہ مقفل کر دیا جاتا اور کسی کو اس طرف آنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ ایک دن آرڈیننس کے میجر انیس نے سنتری سے آنکھ بچا کر دروازے کی پتلی سی دراڑ میں سے ٹوتھ پیسٹ کی خالی ٹیوب کے ذریعے چائے انڈیلی تو وہ زیادہ تر نیچے گر گئی۔ اتنے عرصے بعد چائے پینے (چکھنے) کا کافی مزا آیا۔ ایک انڈین مسلمان حوالدار میجر امید خان کبھی کبھی روٹی لپیٹنے کے بہانے پرانی اخبار پڑھنے کو دے جاتا تھا۔ میں دروازے کی باریک درزوں میں سے کافی دیر تک باہر دیکھتا رہتا حالانکہ باہر سنتریوں اور تاروں کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ پھر بھی کھلی فضا کا نظارہ کوٹھڑی کی بے کیف دیواروں سے بہتر تھا۔ صبح اور شام جب ایک گھنٹے کے لیے باہر ہوتا تو کسی کو اس طرف آنے کی اجازت نہیں تھی لیکن کیپٹن آصف اس دوران اپنے کمرے کی کھڑکی میں بیٹھا مجھے دیکھتا رہتا۔ میرے بارے میں کافی پریشان تھا۔ کسی طور اس نے مجھے خط پہنچایا کہ اس نے سب افسروں سے ہڑتال کرنے کو کہا کہ میری قید بیجا ہے لیکن ان کا موقف تھا کہ اس کا ذمہ دار میں خود ہوں۔ کہتے تو ٹھیک ہی تھے میں

نہیں چاہتا تھا کہ میری وجہ سے کسی کو تکلیف ہو۔ کچھ دنوں کے بعد اس ماحول کا اس قدر عادی ہو گیا کہ اکثر وقت ختم ہونے سے پہلے ہی کمرے میں واپس آ جاتا تھا۔ ہندوستانی افسر سمجھانے آتے رہے کہ کراس لگوا لو۔ خفیہ ادارے کے ایک میجر نے جو اپنے آپ کو ویلفیئر افسر ظاہر کرتا تھا ایک دو مرتبہ آ کر کہا کہ اگر میں کراس لگوا لوں تو سزا ختم ہو سکتی ہے۔ قید کے آخری دنوں میں ملٹری پولیس MP کے دو سکھ حوالداروں نے بتایا کہ آپ کو آگرہ بھیجا جا رہا ہے۔

سزا ختم ہونے سے ایک دن قبل گروپ کمانڈر کے ہمراہ مجھے ریڈ کراس والے دیکھنے آئے اور قید کی وجہ پوچھی تو میں نے انہیں ہندوستانیوں کی موجودگی کی بنا پر اپنے فرار کی نپی تلی داستان سنائی اور کہا کہ ہندوستانیوں نے مجھ پر بیحد تشدد کیا ہے اور میری بازو کی ہڈی بھی توڑ دی ہے۔ انہیں یہ بھی بتایا کہ کراس نہ لگوانے پر اب یہ قیدِ تنہائی کی سزا ملی ہے۔ وہ حیران تھے کہ اس میں کیا ہرج ہے۔ مجھے سمجھانے لگے کہ دوسری جنگِ عظیم میں بھی قیدیوں کے کپڑوں پر مخصوص نشان لگائے جاتے تھے لیکن میں اپنی پتلون اور قمیض کی پشت پر کراس کا نشان لگوانے کے لیے کسی صورت میں بھی تیار نہیں ہوا۔ اگلے دن آ کر میری بات تفصیل سے سننے کا وعدہ کرنے کے بعد وہ واپس چلے گئے کیونکہ اس وقت ہندوستانی انکے ساتھ تھے۔ ان کے خیال میں یہ لوگ بعد میں مجھے تنگ کریں گے۔ ان کے ساتھ موجود ڈاکٹر نے میرے زخموں اور بازو کی ہڈی کا معائنہ کیا اور ٹھیک علاج نہ ہونے پر افسوس کا اظہار کیا۔

دوسرے دن دوبارہ حسبِ وعدہ وہ لوگ آئے لیکن اب ان کے ساتھ کوئی ہندوستانی نہیں تھا۔ انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ کراس لگوا لو خواہ مخواہ یہاں پڑے رہنے سے کوئی فائدہ نہیں جب کہ باقی تمام قیدیوں نے یہ کراس لگوا لیئے ہیں۔ مغربی معاشرے میں شاید ایسی چیزوں کو معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ مجھ سے پوچھا کہ بس

میں تم نے ایک دم مونچھیں کیسے صاف کر لیں تھیں؟ غالباً میری پوری داستان انہیں تفصیلاً معلوم تھی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ ہم نے رپورٹ میں تمہارے ساتھ ناروا سلوک کے بارے میں لکھا ہے۔ اُن کے چلے جانے کے بعد قید تنہائی پوری ہونے پر رہائی ملی۔ پتلون کے پیچھے کراس لگانے کی پابندی غالباً ریڈ کراس کے مشورے پر اب ختم کر دی گئی تھی۔ ماہنامہ ''آجکل'' کے مسلمان ایڈیٹر شہباز کے ساتھ انڈین آرمی کا ایک فل کرنل اور چند دوسرے افسر کیمپ میں آئے اور تمام افسروں کو اکٹھا کر کے اس سے ایک لیکچر دلوایا گیا۔ زیادہ دیر وہ اسی بات کی وضاحت کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ ہم مسلمان ہندوستان میں زیادہ خوشحال ہیں اور پاکستان کا بننا ایک صریع غلطی تھی۔ سوال و جواب کے دوران گرما گرم بحث رہی۔ میرے ایک سوال پر اس نے اقبال کے جس مندرجہ ذیل شعر سے جواب دیا اس سے ظاہر تھا کہ اسے یہاں اپنی مرضی سے نہیں لایا گیا۔

؎ جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

رات کو سخت آندھی اور بارش آئی اور تقریباً پندرہ منٹ تک بجلی بند رہی۔ میرے پاس کیپٹن اصغر سمیت کچھ افسر آئے کہ فرار کا اچھا موقع ہے لیکن میں نے ان سے معذرت کر لی کہ میں تو ابھی ٹھیک طرح چل بھی نہیں سکتا۔ یوں بھی اب فرار کی صورت میں اکیلا ہی جاؤں گا اور کسی اور پر بھروسہ نہیں کرونگا۔ موقع تو اچھا تھا لیکن کسی نے بھی کوشش نہ کی۔ اس کے بعد کئی منصوبے بنتے رہے لیکن میں کسی میں بھی شامل نہ ہوا۔ البتہ ایک گروپ جس میں ایک سابق ایس۔ ایس۔ جی افسر بھی تھا کو میں نے کہا کہ اگر چاروں طرف سے گزرتی ہوئی بجلی کی تاروں پر ننگی تاروں کی رسی ڈال کر بجلی بند کر دی جائے تو بھاگنے میں آسانی ہوسکتی ہے۔ لیکن اس کیمپ سے اس کے بعد فرار کی کوئی کوشش نہیں ہوئی۔ کیمپ سے باہر پوچھ گچھ کے لیئے افسروں کو

اکثر لے جایا جاتا تھا۔ایک دن مجھے بھی آنکھوں پر پٹی باندھ کر لے جایا گیا۔میجر کی جگہ ایک سمارٹ سا افسر سویلین کپڑوں میں بیٹھا ہوا تھا۔اس نے ایک فارم میری طرف بڑھایا کہ اسے پر کر دو۔تقریباً تمام سوالات ہماری فوج کی مواصلاتی تنصیبات سے متعلق تھے۔میں نے اپنا نام،نمبراور رینک لکھ کر فارم واپس کر دیا تو پہلے اس نے نرمی سے اور پھر رعب سے سمجھایا کہ 5 سٹار ہوٹل میں بھجوا دوں گا۔ کال کوٹھڑی کو یہی نام دیا گیا تھا۔میں نے کہا کہ اس کا کافی تجربہ ہے اس لیئے مجھے کوئی اعتراض نہیں۔آخر تنگ آکراس نے مجھے واپس بھیج دیا۔

اس طرف اکثر پاکستانی غیر فوجیوں civilians کو بھی آنکھوں پر پٹی باندھ کر لے جایا جاتا تھا۔نجانے ان سے کیا پوچھا جاتا تھا۔ ڈھاکہ کی اخبار ''SUN'' کے ایڈیٹر (شاید سبحانی نام تھا) کو بھی وہاں ایک دومرتبہ لایا گیا۔سنا گیا تھا کہ اسے بھی آٹے کی بوریاں اُٹھانی پڑتی ہیں۔کئی عورتیں کیمپوں کی خاردار تاروں کے ساتھ لگی اپنے خاوندوں کو پہروں دیکھتی رہتی تھیں۔ایک دن ہمارے کیمپ کے سامنے سے پندرہ، بیس ہندو عورتیں گزر کران کےکیمپ میں تلاشی کے لیے گئیں اوران سے زیورو غیرہ چھین کر لے گئیں۔کوئی بھی تو ان کا پرسانِ حال نہیں تھا۔ کچھ دنوں بعد ہمیں اطلاع ملی کہ فرار کی کوشش کرنے والوں کو آگرہ بھیجا جارہا ہے۔ایک دن سکیورٹی کا وہی میجر ہمارے کمرے میں آیا تو اس کی تعظیم کے لیے کوئی بھی نہیں اٹھا۔بھڑ کر کہنے لگا کہ کیوں نہیں اٹھے؟ ہم نے اسے جواب دیا کہ ایک تو وہ سویلین کپڑوں میں ہے اور دوسرے وہ ہماری ہی طرح کا ایک میجر ہے ہم کیوں اٹھیں؟ غصے میں وہ باہر چلا گیا۔دوسرے دن اس کی یونٹ کا ایک حوالدار کمرے کے تمام افسروں کے کوائف لے گیا۔

CAMP ROUTINE ORDER (PW)
BY
MAJOR RD NIKAM COMMANDANT 40 POW CAMP

Dated : 24 Mar 72 Srl No : 2

4. PUNISHMENTS/PsW

PW No B-58/0617 Regt No PA-6745 Major ABDUL QADIR, SIGNALS was awarded 14 days detention deprived of previlages and put on half diet by Major RD NIKAM, Commandant 40 POW CAMP on 17 Mar 72.

Offence :- Vide AA Sec 42 (b) " Neglecting to obey Camp Routine Order" in that he while at Meerut at 1000 hrs on 16 Mar 72 neglected to obey the Camp Routine Order No 1, Para 1(b) which required marking of trousers at the bottom of the seat.

5. AMENDMENT DUTIES CAMP ROUTINE ORDER SRL NO 1 DATED 10 MAR 72. PARA 3(c) (1)

For "Lt Col KA RASHID"
Read " Lt Col MALIK ABDUS SALAM ALAVI"

(RD NIKAM)
Maj
COMMANDANT 40 POW CAMP

No 5000/3/PW
24 Mar 72

Distribution

Normal

Zcos Cage

پتلون کی پست پر کراس نہ لگوانے کی پاداش میں سزا کا آرڈر

میرٹھ سے آگرہ کیمپ 88

چند ہی دنوں بعد ہم سب کو آگرہ جانے کیلئے تیاری کا حکم ملا۔ اس روانگی میں کمرے کے سارے افسر شامل تھے لیکن بس سے فرار کی کوشش کرنے والوں میں سے صرف ہم تین ہی تھے۔ کیپٹن لیمبو کی پوسٹنگ سیکورٹی افسر کی حیثیت سے یہاں ہوگئی تھی۔ اس کا کورٹ مارشل تو ہوا تھا لیکن اسے زیادہ سزا نہیں ملی تھی البتہ اس کے ساتھ بس والے تمام جوانوں اور جے۔ سی۔ او کو فوج سے نکال دیا گیا تھا۔

ہماری روانگی کے وقت کیمپ کے سارے افسر باری باری آ کر ملے۔ کیپٹن ذہین، لفٹیننٹ مشتاق اور کرنل رشید کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ کیپٹن لیمبو نے ہمارا سامان چیک کیا۔ سب سے پہلے مجھے آنکھوں پر پٹی اور ہاتھ میں رسی باندھ کر لایا گیا۔ کیپٹن لیمبو نے مجھ سے اس دن کے واقع کے بارے میں معذرت کی۔ ہمیں ایک سویلین بس میں لے جایا جا رہا تھا۔ تاروں کا ایک جال بس کے اندر اور باہر لپیٹا گیا تھا۔ اگلی اور پچھلی سیٹوں کے درمیان تاروں کے بڑے بڑے گچھے تھے اس لئیے ہمیں تقریباً رینگ کر درمیانی سیٹوں تک جانا پڑا۔ دس سپاہی پچھلی سیٹوں پر اور دس ہی اگلی سیٹوں پر بیٹھے تھے۔ بس کے ساتھ ایک ٹرک میں مزید تیس آدمیوں کی ایک پلاٹون جا رہی تھی۔ بس کے شیشوں پر مٹی لگا دی گئی تھی۔ یہ سب حفاظتی اقدامات

صرف ہم سات افسروں کے لیئے کیئے گئے تھے۔ ہمارے دونوں ہاتھ پیچھے باندھ دیئے گے تھے۔ کچھ ہی دور جا کر میں نے رسی کو ڈھیلا کر کے ایک ہاتھ باہر نکال لیا۔ ہندوستانیوں کے پاس آنے پر دوبارہ ہاتھ رسی کے اندر ڈال لیتا تھا۔ پیچھے ہاتھ باندھنے سے بازوؤں میں سخت درد ہوتا تھا۔ آگرہ یہاں سے اڑھائی سو میل دور تھا۔ راستے میں کھانا کھانے کے لیے روکا گیا اور ایک ایک افسر کو نیچے اتار کر اس کے سامنے کھانا رکھا گیا۔ ہاتھوں سے رسی کھول دی گئی لیکن آنکھوں پر پٹی بدستور موجود رہی۔ اکثر نوالے سالن کی بجائے مٹی کے ساتھ لگا کر کھائے گئے۔

آگرہ کی مختلف سڑکوں سے گزرے تو تاج محل دیکھنے کے شوق میں پٹی کافی اوپر سرکالی۔ ماتھے کی اوپر نیچے کی حرکت سے پٹی سرکانے کی اب کافی مہارت ہوگئی تھی۔ حسرت سے لوگوں کو آزادانہ بازاروں میں گھومتے پھرتے دیکھا۔ تاج محل تو نظر نہیں آیا لیکن جب ہمارے سامنے سے لڑکیوں سے بھرا ہوا ایک ٹانگہ گزرا تو ہم سب نے اچک اچک کر انہیں دیکھنے کی کوشش کی۔ واقعی مورال پر حیرت انگیز اثر پڑا۔ ہمارے اس طرح دیکھنے سے سنتریوں کو شک پڑ گیا اور انہوں نے پٹیاں دوبارہ درست کر دیں۔

اونچی اونچی قلعہ نما دیواروں کے پاس آ کر بس رک گئی۔ گیٹ کے پاس کافی دیر تک روک کر ہماری تلاشی لی گئی۔ ہمارے ساتھ آئے ہوئے مدراسی جے سی او نے پوچھا کہ آپ لوگوں نے بنگلہ دیش میں کیا جنگی جرائم کیئے تھے جو یہاں لائے گئے ہیں۔ بہت سی اونچی چاردیواروں کے حصاروں میں سے گزر کر ہم لوگ کیمپ 88 میں پہنچے۔ جیل کی بیرکوں میں سینکڑوں پاکستانی سپاہی متجسس نظروں سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ افسروں کا کیمپ ایک اور اونچی چاردیواری کے اندر تھا۔ اس جگہ کا کل رقبہ بمشکل 60 X 60 فٹ تھا۔ آمنے سامنے دو بیرکیں تھیں جن کی کھڑکیوں اور

دروازوں کی جگہ لوہے کی موٹی موٹی سلاخیں تھیں۔ غالباً یہ کوئی مغلیہ دور کی پھانسی کی سزا پانے والے قیدیوں کی جیل تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ یہاں سے فرار ناممکن ہوگا۔ جب بیرکوں کے درمیان پہنچے تو سلاخوں کے ساتھ لگے ہوئے افسروں میں سے کسی نے ''قادر اوئے قادر'' کا نعرہ لگایا۔ میں نے ایس ایس جی کے اپنے دوستوں کیپٹن اقبال، کیپٹن ڈاکٹر حسین اور کیپٹن سعید (کٹا) کو پہچان کر ان کے پاس جانا چاہا لیکن سنتری نے روک دیا۔ 2 کمانڈو بٹالین کے زیادہ تر افسر یہیں پر تھے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم سب واقعی قتل کے مجرم ہیں۔

دونوں بیرکوں کے مزید دو دو حصے کر دیئے گئے تھے۔ جہاں ہمیں جگہ ملی وہاں آدھے حصے میں ہماری خدمت کے لیئے ہمارے اپنے جوان اور باقی حصے میں افسر تھے۔ ایک کونے میں نیوی کے کموڈور انعام الحق کا بستر تھا۔ انکے تین بھائیوں میں سے دو برگیڈئر منصور الحق (قیدی کی ڈائری کے مصنف) کا تعلق سگنل کور اور بریلی والے کیمپ 88 کے میجر منظور الحق کا تعلق آرٹلری سے تھا۔ صرف ایک بھائی برگیڈئر ظہور الحق جو سگنل کور سے تھے قید ہونے سے بچ گئے تھے۔ میرٹھ سے آئے ہوئے ہم سات افسر ایک ہی جگہ پر رہ رہے تھے۔ یہاں پہلی بار 2 کمانڈو بٹالین کے کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل حنیف سے ملاقات ہوئی۔ کافی شریف الطبع انسان تھے۔ ان سے جو پوچھا کہ سر آپ نے سرنڈر کیوں کیا آپ تو چٹاگانگ سے پوری بٹالین کے ساتھ فرار ہو سکتے تھے تو ان کی آنکھیں پرنم ہوگئیں اور کہنے لگے کہ ہمیں دھوکے میں رکھ کر لڑائی کے آخری دنوں میں رانگامتی سے چٹاگانگ اس لیئے بلایا گیا کہ برگیڈ کمانڈر برگیڈئر عطا اسے جنگ عظیم دوم کے دوران روس کے مشہور شہر سٹالن گراڈ کی طرح ایک مضبوط دفاعی حصار بنانا چاہتا تھا۔ لیکن برگیڈیر صاحب کا سٹالن گراڈ ایک دو دن ہی میں جھاگ کی طرح زمیں بوس ہوگیا۔ تمام یونٹوں کو

چٹاگانگ بلاکر ہندوستانیوں کے حوالے کر دیا گیا۔ کمانڈو کے چند جوانوں اور افسروں کو جو فرار کی غرض سے کافی دور نکل گئے تھے آدمی بھیج کر واپس بلا لیا گیا (سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ ان حالات میں کیوں واپس پلٹے)۔ جتنا عرصہ میں وہاں رہا ان کا رویہ میرے ساتھ نہایت مشفقانہ رہا۔کیمپ میں سب لوگ انکی بہت عزت کرتے تھے۔

زیادہ تر کرنل اورڈھا کہ مارشل لاء ہیڈکوارٹراور EPCAF ہیڈکواٹر کے افسر ہماری بیرک میں مقیم تھے۔ Pakistan cut to size والے ۳۱ بلوچ کے کرنل سلطان دوسری بیرک میں تھے۔وہ ہندوستانیوں کے ساتھ نوک جھونک میں لگے رہتے تھے۔شاعری کا شوق پورا کرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے فرار کے کئی منصوبے بھی بنا رکھے تھے جس کے لیئے جیل کے نقشے وغیرہ بناتے رہتے تھے۔مجھے بھی بلاکراپنا ایک منصوبہ تفصیل سے بتایا جو کافی پیچیدہ اور نا قابل عمل لگا۔

ان کا خیال تھا کہ بیرکوں کی کچھ سلاخیں کافی حد تک کاٹ کر چھوڑ دی جائیں اور موقع ملنے پر ان کو الگ کر کے باہر نکلنے کے بعد ہندوستانی سنتریوں پر جو ہماری بیرکوں میں ٹہلتے رہتے تھے حملہ کر کے ہتھیار وغیرہ چھین کر فرار ہو جائیں اور پھر وہاں موجود باقی کیمپوں کے افسروں اور جوانوں کو چھڑوا کر آگرہ کے ہوائی اڈے پر قبضہ کر لیں تا کہ ہمارے جہاز ہمیں یہاں سے اُٹھا سکیں۔ان کا یہ منصوبہ قابلِ عمل تو نہیں لگتا تھا لیکن کیونکہ روائیتی طریقوں سے یہاں سے نکلنا ناممکن تھا اس لیئے ذہن کو مصروف رکھنے کے لیئے نہایت کارآمد تھا۔پچھلے تلخ تجربوں کے بعد وثوق سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وقت پڑنے پر کتنے لوگ ان کا ساتھ دیں گے اور پھر پاکستان کی طرف سے بھی کوئی جہاز سیزفائر کے بعد بھیجے جائیں گے یا نہیں۔

انہوں نے اس غرض سے کیمپ میں کام کرنے والے مستریوں کی لوہے کی آری کا بلیڈ چرا لیا اور مجھے بلا کر کہا کہ جو کام تم نہ کر سکے میں نے کر لیا ہے۔ میں ایم آئی روم میں جو کیمپ 44 کے اندر تھا علاقے کا جائزہ لینے کے لیئے گیا تو آگرہ شہر کی کچھ عمارتیں نظر آئیں۔ اس کیمپ اور شہر کے درمیان اونچی فصیل تھی لیکن فاصلہ قدرے کم تھا اس لیئے کچھ باہمت افسروں نے یہاں سے ایک سرنگ کھودی لیکن راستے میں کسی گٹر کی وجہ سے انہیں اسے بند کرنا پڑا۔ دوسری جگہ سے کھدائی کی لیکن اس مرتبہ بھی کوئی بڑی نالی راہ میں آ گئی اور زمین دھنس گئی اور ہندوستانیوں کو اس کا پتہ چل گیا۔ ایم آئی روم کے ساتھ والی بیرک میں 2 کمانڈو بٹالین کے باقی افسر کیپٹن چیمہ اور میرے بھیراب بازار کے ساتھی کیپٹن اکبر دوڑ کر ملے۔ میرٹھ والی واردات کی کچھ اطلاع کرنل افضل سے انہیں مل چکی تھی۔ وہ انہیں بھی بلا لائے۔ بڑے تپاک سے ملے اور پوچھا کہ تم فرار کیوں نہیں ہوئے۔ اپنے افسروں کے طرزِ عمل پر کفِ افسوس ملا۔ بریلی سے آگرہ لا کر انہیں اٹھائیس دن قیدِ تنہائی میں رکھا گیا تھا۔ یہاں بیشتر لوگ مختلف کیمپوں سے یا تو اس طرح کی وارداتیں کر کے آئے تھے یا پھر بنگالیوں کی نشان دہی پر جنگی مجرموں کی فہرست میں رکھے گئے تھے۔ کمانڈو بٹالین کے باقی افسر بھی یہیں پر تھے۔

ہمارے کیمپ کا کمانڈنٹ گوردیو سنگھ بہت شریف آدمی لگتا تھا۔ جنگ کے دنوں میں 15 بلوچ کے بالمقابل اس کی یونٹ نبرد آزما رہی تھی۔ میجر جاوید مواذ کے ساتھ جو مشہور صحافی زیڈ۔ اے۔ سلہری کا داماد تھا اور اسی بٹالین سے تعلق رکھتا تھا اچھی طرح پیش آتا تھا۔ اکثر اسے اور میجر یونس کو جو اس برگیڈ کا بی ایم تھا بلا کر چائے وغیرہ پلاتا تھا۔ بہت سے لوگوں کو اس بات پر اعتراض تھا۔ بعض کے خیال میں یہ لوگ ہندوستانیوں سے مل گئے تھے لیکن میرے خیال میں ایسی کوئی بات تو نہیں

تھی لیکن ان کا اتنا ملنا جلنا بھی مناسب نہیں لگتا تھا۔

ہمارے کیمپ کے اندر سبزیوں اور ٹھنڈے مشروبات کی ایک کینٹین تھی۔ یہاں سے آرڈر پر مرغیاں تک منگوائی جا سکتی تھیں۔ ہم سات افسر اکٹھا ہی کھاتے پکاتے تھے۔ میجر نسیم کھانے پکانے میں خوب ماہر تھے اور مزیدار کھانوں کے ساتھ ساتھ میٹھی میٹھی باتوں سے بھی ہمارا دل بہلاتے رہتے تھے۔ ان کے دوست آرڈیننس کے میجر انیس کافی ذہین آدمی تھے۔ جہاں خالد، نسیم فربہ اندام تھے وہاں یہ ہڈیوں کا ڈھانچہ لگتے تھے۔ میں ان کے ساتھ عموماً ہر طرح کی بحث میں الجھتا رہتا تھا۔ بیرک کے اس حصے میں کافی زندہ دل لوگ تھے۔ اونچی دیواروں کی وجہ سے کیمپ میں خدا کی تخلیق کردہ چیزوں میں سے اپنے علاوہ صرف سکھ، جیل اور بیس فیصد آسمان نظر آتا تھا پھر بھی میں پہلے کیمپ کی نسبت یہاں زیادہ خوش تھا۔ بیرک اور دیوار میں بمشکل دس پندرہ گز کا فاصلہ تھا۔ اس دیوار کے پیچھے دو اور دیواریں تھیں۔ دروازوں اور کھڑکیوں کے آگے ہوا روکنے کے لیے کوئی چیز نہیں تھی۔ ہم نے سردی سے بچنے کے لیے بوریاں پھاڑ کر ان کے آگے لگا دی تھیں۔ اس قدر تنگ جگہ میں بھی ہوا کافی تیز چلتی تھی اور اس سے کچے فرش کی مٹی بگولے کی مانند چکر لگاتی رہتی تھی۔

ہمارے آنے کے کچھ دنوں بعد ہمارے کیمپ سے باہر واقع camp44 سے میجر سلیم عنایت، میجر اقبال، میجر مشتاق، میجر جنجوعہ اور ایس ایس جی کے ایک سابق افسر میجر اجمل آ کر ہم میں شامل ہو گئے۔ ان سب کا آپس میں کافی گٹھ جوڑ تھا۔ تاش کھیلنے کے علاوہ اونچی اونچی آواز میں اکثر ''ایں یاں اوں، ایں یاں اوں'' کی رٹ پر کوئی نیم فحش قسم کا گانا گاتے رہتے تھے۔ لیکن اس کے برعکس ان میں سے ایک افسر ہر وقت چارپائی پر لیٹا چاروں طرف اپنی آنکھیں گھماتا رہتا تھا۔ اس نے

لکڑی کے صندوق میں سامانِ خورد ونوش کافی مقدار میں اکھٹا کر رکھا تھا۔ اسکا بستر جوانوں کے حصے کے بالکل ساتھ تھا۔ گو بیچ میں کمبل لگا دیئے گئے تھے لیکن ان کی بات چیت سے جو زیادہ تر رات گئے شروع ہوتی تھی وہ بہت تنگ تھا۔ ہر منٹ دو منٹ بعد چپ رہو کا نعرہ لگا دیتا تھا۔ جوان بے چارے بھی کیا کرتے اسی وقت تو وہ اپنا دل باتوں اور اپنے گھر والوں کو یاد کر کے بہلاتے تھے۔

مغلیہ دور کی یہ عمارتیں ان کے ذوق اور صنع کاری کا اعلیٰ نمونہ تھیں۔ چھت بغیر شہتیروں کے اور گنبد نما تھے اور چنائی اتنی سخت تھی کہ اتنی مدت گزر جانے کے بعد بھی کہیں سے نہیں اکھڑی تھی۔ گرمیوں میں پنکھے لگانے کیلئے مستری اور مزدوروں کو چھینی ہتھوڑوں سے سوراخ کرنے کے لیئے کافی محنت اور وقت صرف کرنا پڑا۔ کیمپ کے دونوں حصوں میں والی بال زور شور سے کھیلا جاتا تھا۔ نشانے کی ذرا سی غلطی پر گیند دیواروں سے باہر نکل جاتی جہاں بور ہوتے ہوئے پاکستانی جوان اسکے ساتھ کھیلنا شروع کر دیتے اور ہر مرتبہ کچھ وقت لگا کر چیختے چلاتے بے تاب کھلاڑیوں کی طرف واپس پھینک دیتے تھے۔ ایک دن کیمپ میں ریڈ کراس کے نمائندے آئے تو ان سے عبدالرحمان کے بارے میں پوچھا۔ مجھے پہچان کر کہنے لگے کہ کیا تم وہی بڑی بڑی مونچھوں والے ہو؟ بڑے تپاک سے ملے اور بتایا کہ ہمارے نمائندے نیپال جانے والے دونوں افسروں کو پاکستان بھیجنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر ظفر امام کو ہندو پاک امن اور خوشگوار تعلقات کی اہمیت پر تقریر کے لیئے لایا گیا۔ بے چارے کی خوب درگت بنی۔ کرنل حق نواز نے اسکے جواب میں نہایت اچھی تقریر کی۔ میں نے ابھی تک نماز پڑھنی شروع نہیں کی تھی حالانکہ ہماری بیرک کے ایک سرے پر تھوڑی سی جگہ باجماعت نماز پڑھنے کے لیئے مخصوص کی گئی تھی۔ نیوی کے کیپٹن (بعد میں نیول چیف) ضمیر باقاعدہ جماعت کراتے تھے۔ ایک

دن وہ میلاد النبی ﷺ کے سلسلے میں کچھ افسروں کو اکھٹا کر کے حضور ﷺ کی سیرتِ طیبہ پر تقریر کر رہے تھے اور میں تین چار افسروں کے ساتھ پاس ہی بیٹھا تاش کھیلنے میں مصروف تھا اور کٹ فور آوٹ (cut for out) کی بنا پر اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا۔ نہ جانے کیا سوچ کر میں ان کے ذرا قریب کھسک گیا۔ وہ بڑے دھیمے اور موثر انداز میں باتیں کر رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں میری آنکھوں سے آنسوؤں کی ایک لڑی بہہ نکلی۔ تقریر کے بعد ہونے والی ظہر کی نماز کی جماعت میں میں بھی شامل ہو گیا۔ اپنی پچھلی کوتاہیوں پر سخت نادم ہوا۔ قید تنہائی کی وجہ سے میرے پاس الاؤنس کے کافی پیسے جمع ہو گئے تھے۔ ان سے قرآنِ پاک اور مولانا آزاد کی تفسیر منگوا کر باقاعدگی سے پڑھنی شروع کر دی۔

اچانک ایک دن ہمیں یہاں سے بھی روانگی کی اطلاع دی گئی۔ میرٹھ والوں میں سے صرف میں اور علاوالدین ایک کیمپ میں جا رہے تھے۔ میں نے کرنل حنیف سے جو کیمپ سینئر کی ڈیوٹی دے رہے تھے، کہا کہ ہمیں ایک ہی کیمپ میں بھیجا جائے لیکن وہ کہنے لگے کہ چونکہ جانے والوں کے نام جا چکے ہیں اس لیئے اب کوئی تبدیلی ممکن نہیں۔ میجر عبدالقیوم کے علاوہ کیمپ 44 سے آئے ہوئے تمام افسر بھی ہمارے ساتھ جا رہے تھے۔ عین آخری وقت پر کرنل سلطان کا نام جانے والوں کی لسٹ سے نکال دیا گیا تو انہوں نے لوہا کاٹنے والی آری کی آدھی پتری میرے حوالے کر دی۔ کیپٹن وصال اور میجر جنجوعہ بھی ہمارے ساتھ تھے۔ یہ لوگ بھی اب ہمارے گروپ میں شامل اور فرار کے کسی بھی منصوبے میں ساتھ دینے کے لیے تیار تھے۔

آگرہ سے رانچی اور ٹرین سے فرار کی کوشش

روانگی کے وقت باقی افسروں کی طرف سے ہماری کافی خاطر مدارات ہوئی۔ دو دو افسروں کو ایک ہتھکڑی میں یکجا کر دیا گیا۔ میں اور میجر جنجوعہ اکٹھے بندھے ہوئے تھے۔ ہمیں بند کنٹینروں میں ٹھونسا گیا۔ لوہے کی موٹی چادر سے بنے ہوئے یہ ڈبے سخت گرم ہو گئے اور سانس رکتا ہوا محسوس ہوا۔ ریلوے اِسٹیشن پر اتارا گیا تو جان میں جان آئی۔ یہاں 44 کیمپ سے آئے ہوئے کوئی بیس افسر پہلے سے موجود تھے۔ ان میں پاکستان سے میرے ساتھ آنے والا ایس۔ایس۔جی کا میجر نصیب اللہ بھی تھا۔ اس کی داڑھی کے بال اس قدر زیادہ تھے کہ چہرہ نظر نہیں آتا تھا۔ میں نے بھی داڑھی بڑھا رکھی تھی اور سر کے بال ہپیوں کی طرح شانوں تک پھیلا رکھے تھے۔ فرار کی صورت میں سکھوں کا روپ بآسانی دھارا جا سکتا تھا۔

ریل کے جن ڈبوں میں ہمیں بٹھایا گیا ان کی کھڑکیوں میں لوہے کی سلاخیں تھیں۔ باہر جانے کے راستوں میں گچھے دار تاریں پڑی ہوئی تھیں اور ان کے ساتھ تین تین سنتری بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک طرف چھوٹے چھوٹے بغیر دروازوں کے کمپارٹمنٹ اور دوسری طرف ایک لمبی سی راہداری تھی۔ میجر نصیب اللہ اپنے ساتھ بندھے ہوئے میجر جعفر کے ساتھ میرے سامنے ہی بیٹھا ہوا تھا۔ اسکے علاوہ

کیپٹن ہدایت (مکتی) اور کیپٹن گل خیز اسی حصے میں ہمارے ساتھ تھے۔ راستے میں فرار کے بارے میں نصیب اللہ کی رائے لی تو کہنے لگا کہ کیا کوئی بندوبست ہے۔ اسے بسکٹوں کے ڈبے کے گتے اور کور cover کے درمیان چھپائی ہوئی لوہے کی آری کی پتری کا ٹکڑا نکال کر دکھایا۔ طے پایا کہ رات ہوتے ہی ہمارے کمپارٹمنٹ کی کھڑکی کی سلاخ کاٹی جائے۔ ہم سب باری باری اسے کاٹنے کی کوشش کرتے رہے۔ صبح تین بجے کے قریب جب سلاخ کٹ گئی تو میں نے میجر جعفر سے جو ہم سب سے سینئر تھے پوچھا کہ سب سے پہلے کون جائے۔ ان کا مشورہ تھا کہ چونکہ منصوبہ تمہارا ہے اس لیئے پہلے تم ہی جاؤ۔ اس فیصلے پر کسی نے اعتراض نہیں کیا۔

میجر ذوالفقار علی جنجوعہ کا ہاتھ جو بڑا نازک اور چھوٹا سا تھا تھوڑی سی کوشش کے بعد ہماری مشترکہ ہتھکڑی سے باہر نکل آیا لیکن اسکے مقابلے میں میرا ہاتھ چونکہ کافی بڑا تھا اس لیئے ایسا ممکن نہیں تھا۔ اس لیئے ہتھکڑی کو کاٹنا ضروری تھا۔ اس دوران آری کا بلیڈ کیپٹن شجاعت اور کیپٹن نیازی اپنی ہتھکڑی کاٹنے کے لیے دوسرے کمپارٹمنٹ میں لے گئے۔ چونکہ دندانے کافی گھس چکے تھے اس لیئے انہیں صرف ہتھکڑی کی زنجیر کاٹنے میں بہت وقت لگا اور تقریباً ساڑھے چار بجے انہوں نے پتری واپس کی۔ اس وقت گاڑی کی رفتار بمشکل پچیس، تیس میل فی گھنٹہ تھی اور کسی بڑے شہر سے گزر رہی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ چونکہ یہ وقت موزوں ہے اس لیئے ہتھکڑی چھلانگ لگانے کے بعد کاٹ لوں گا۔ نیچے چھلانگ لگانے کے لیئے میں نے سر باہر نکالا لیکن نکلنے کے لیئے جگہ کم اور میرا جسم بہت زیادہ تھا اس لیئے کافی تگ و دو کے باوجود سر کی طرف سے باہر نہ جا سکا۔ بعد میں خیال آیا کہ پہلے ٹانگیں باہر نکال کر پھر سر باہر نکالنا چاہیے تھا۔

لیکن اب گاڑی کی رفتار پچاس میل یا اس سے بھی زیادہ ہوگئی تھی اس لیئے

کسی اور بہتر موقعے کا انتظار کرنے کا فیصلہ کیا۔شجاعت نے اپنی ہتھکڑی کاٹ لی تھی اور وہ اسی وقت چھلانگ لگانا چاہتا تھا۔ میں نے اسے بہت سمجھایا کہ رفتار بہت تیز ہے کچھ دیر رک جاؤ لیکن وہ نہ مانا۔اس کی بہادری پر رشک آرہا تھا کہ موت کے ساتھ کس جوانمردی کے ساتھ کھیلنا چاہتا ہے۔باہر نکل کر وہ میرے ایک ہاتھ کے ساتھ لٹکا ہوا تھا اور دوسرے ہاتھ سے اس نے کھڑکی کا سریا پکڑا ہوا تھا۔نہ چاہنے کے باوجود اسکے کہنے پر میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ایک دھماکے کی آواز کے ساتھ کچھ چنگاریاں اٹھیں۔اندھیرے میں بہت کم نظر آرہا تھا مگر یوں لگا جیسے وہ بے سکت پڑا ہوا ہے اور شاید اسکی ایک ٹانگ ساتھ والی ریلوے لائن پر آ گئی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد مخالف سمت سے ایک گاڑی آئی تو خیال میں آیا کہ چونکہ وہ بے ہوش ہے ضرور اس کی ٹانگ کٹ گئی ہوگی۔سب اس کے لیے افسردہ تھے۔

سخت حیرت تھی کہ ہندوستانیوں کو کوئی شک نہیں ہوا۔پیرا بٹالین پرائیڈ آف انڈین آرمی ThePride of Indian Army کے نام سے مشہور تھی اور اس کی ایک کمپنی خاص طور پر ہمارے ساتھ رکھی گئی تھی۔ ہمارے دونوں اطراف کے ڈبوں میں ان کے جوان بیٹھے ہوئے تھے۔ان میں زیادہ تعداد سکھوں کی تھی۔شجاعت کے بعد ہم میں سے کسی اور کی ہمت نہیں تھی کہ گاڑی کی اس رفتار کے دوران فرار کی کوشش کرے۔روشنی کافی پھیل چکی تو مغل سرائے کے پاس پہنچنے سے پہلے گاڑی کی رفتار کچھ آہستہ ہوئی۔ میں نے باہر نکلنے کی جونہی کوشش شروع کی تو مجھے بتایا گیا کہ سکھ حوالدار ہمارے کمپارٹمنٹ کی طرف گنتی کے لیئے آرہا ہے۔جگہ چھوٹی تھی اس لیے تیزی سے نہیں نکل سکتا تھا اس لیئے میں نے باہر نکلی ہوئی اپنی ٹانگ واپس کھینچ لی۔گاڑی مغل سرائے جو شاید انڈیا اور پاکستان کا سب سے بڑا ریلوے جنکشن ہے پہنچ کر رک گئی۔سکھ گنتی کر رہا تھا مگر پھر بھی اُسے ایک افسر کی کمی

کا احساس نہیں ہوا۔ میں نے سلاخ کو دوبارہ سیدھا کر کے اس پر سکاچ ٹیپ اور لال پالش لگا کر ایک حد تک چھپا دیا۔ سکاچ ٹیپ کسی افسر کے سامان سے برآمد ہوئی تھی۔

یہاں آ کر پتہ چلا کہ سفر ایک رات اور جاری رہے گا۔ کاش یہ خبر ہمیں پہلے ملتی تو فرار اگلی رات تک ملتوی کر سکتے تھے اور اس طرح بہت سے افسر نکل جاتے۔ اب بھی ہوسکتا تھا کہ شجاعت کے بارے میں ہندوستانیوں کو پتہ نہ لگتا اور ہمیں آنے والی رات نکلنے کا موقع مل جاتا۔ میں نے ہندوستانیوں کو دھوکہ دینے کے لیے غسل خانے کی لکڑی کی کھڑکی اسلیئے توڑ دی کہ وہاں سلاخوں کے درمیان فاصلہ قدرے زیادہ ہونے کی وجہ سے ہندوستانیوں کو شک ہوسکتا تھا کہ کوئی دُبلا پتلا آدمی وہیں سے نکل گیا ہوگا۔

مغل سرائے کے بعد گاڑی کوئی گیارہ بجے پٹنہ پہنچی۔ سائیڈنگ پر ہمارے ڈبے لگا دیئے گئے۔ سکھ حوالدار نے یہاں ایک گورکھے حوالدار کو چارج دینا تھا۔ دو چار مرتبہ گننے کے بعد بھی ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ سکھ کا اصرار تھا کہ افسر پورے ہیں لیکن گورکھے کو شک پڑ گیا کہ تعداد پوری نہیں۔ ہم بڑی تیزی سے غسل خانے میں آ جا رہے تھے تاکہ ان کے لیئے گنتی مشکل ہو جائے۔ بالآخر جب انہیں اندازہ ہوگیا کہ دو افسر کم ہیں تو غسل خانے کے پاس جا کر کہا کہ دو افسر غسل خانے میں اکھٹے کیا کر رہے ہو۔ لیکن جب ایک ہی افسر برآمد ہوا تو گاڑی میں کھلبلی مچ گئی۔ بار بار گننے کے باوجود جب ایک افسر کم نکلا تو وہ اپنے کپتان کو بلا لائے۔ اس واقعہ کے باوجود وہ بڑے تحمل کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ غسل خانے کی ٹوٹی ہوئی کھڑکی سے ایک دبلے پتلے سپاہی کو گذارا گیا تو وہ تھوڑی سی تگ و دو کے بعد باہر نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس طرح انہیں اس بات کا یقین ہوگیا کہ بھاگنے والا غسل

خانے سے ہی نکلا ہے۔ اس غسل خانے کو بند کر کے اسکے آگے کانٹے دار تاریں ڈال دی گئیں اور آئندہ ہمیں دوسرا غسل خانہ استعمال کرنے کو کہا گیا۔ یہ غسل خانہ باہر جانے والے دونوں دروازوں کے درمیان میں تھا۔ سنتری بھی وہیں بیٹھے ہوئے تھے۔ کپتان باری باری لسٹ میں افسروں کے ناموں پر نشان لگاتے ہوئے ہمارے کمپارٹمنٹ کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے نیچے سے سلاخ کو اپنی کہنی سے سہارا دے رکھا تھا تاکہ باہر کھڑے ہندوستانیوں میں سے کسی کا ہاتھ نہ پڑ جائے۔ ایک سکھ لانس نائیک کو کمپارٹمنٹ کے باہر آگے ہو کر باتیں سننے کی جگہ نہیں ملی تو وہ بور ہو کر پیچھے ہٹا اور سہارے کے لیئے غیر ارادی طور پر اپنا ہاتھ بالکل اسی سلاخ پر رکھ دیا۔ شومئی قسمت کہ اسی وقت اسے انگڑائی لینے کی سوجھی۔ سلاخ بھی اس کی انگڑائی کے ساتھ ساتھ اپنی جگہ سے ہٹ گئی۔ یہ محسوس کر کے کہ شاید اس نے نقصان کر دیا ہے اور کہیں بیرک ڈیمرج (Barrack Demurrage) نہ پڑ جائے پہلے ردِ عمل کے طور پر اس نے اُسے سیدھا کرنے کی کوشش کی۔ میں بھی اس کے ساتھ ہو کر ایک سرے پر لگے سکاچ ٹیپ کے کھو کھلے حصے میں سلاخ کا دوسرا سرا ڈال کر جوڑنے کی کوشش کرنے لگا تو اچانک اسکے ذہن میں یہ بات آ گئی کہ معاملہ کچھ گڑ بڑ ہے۔ اس نے فوراً سلاخ کو الگ کر کے گھبرائی ہوئی آواز میں اپنے ساتھیوں کو بلایا۔ کپتان جو اس وقت ہمارے کمپارٹمنٹ میں ہاتھ میں لسٹ اٹھائے کھڑا تھا سلاخ کو ایک نظر دیکھ کر پھر لسٹ پر متوجہ ہو کر دوبارہ ہمارے ناموں پر نشان لگانے شروع کر دیئے۔ سلاخ کے نزدیک آ کر دیکھا تک بھی نہیں۔ معلوم نہیں اس کے ذہن میں کیا کیا خیالات آ جا رہے تھے۔ ہمیں منزل تک پہچانے کی ساری ذمہ داری تو اسی کی ہی تھی۔

ہمیں بتایا گیا کہ رات کو کسی وقت ہمارے ڈبوں کو رانچی جانے والی ٹرین

کے ساتھ لگایا جائے گا۔ اس حادثے کے باوجود کپتان نے اس رقم سے جو ہم نے چلنے سے پہلے اکٹھی کر کے اُسے دی تھی ہمیں اسٹیشن سے کھانا لا کر دیا۔ پوری کمپنی اس بات پر سخت برہم تھی کہ ہمارے ساتھ ابھی تک اچھا سلوک کیوں روا رکھا جا رہا ہے۔ ایک سکھ صوبیدار اور دو سکھ حوالدار جن کے منہ پر کمینگی برس رہی تھی بار بار اکٹھے ہو کر راز و نیاز کرتے رہے۔ انہیں کپتان کا ہمارے ساتھ رویہ ناگوار گزر رہا تھا۔ ان کے بس میں ہوتا تو ہم میں سے کسی کو بھی زندہ نہ چھوڑتے۔ ہم پاکستانیوں کا خیال ہے کہ سکھ ہمارے اچھے دوست ہیں اور ہمارے قریب آ سکتے ہیں لیکن جو کچھ ہم نے دیکھا میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان کی کوئی قوم مسلمانوں سے سکھوں جتنی نفرت نہیں کرتی اور اس کے بعد شاید بالترتیب ڈوگرے، مرہٹے اور پنجاب اور ہریانہ کے ہندو آتے ہیں۔ جنوبی ہندوستان کے لوگوں کا رویہ سب سے بہتر ہے۔ شاید وہ اس لیئے کہ وہ ان باقی قوموں سے زیادہ مہذب ہیں۔

تقسیمِ ملک کے وقت سکھوں نے ہماری عورتوں کی جو بے حرمتی اور مہاجروں پر جو مظالم ڈھائے اسکی تاریخِ انسانی میں بہت کم مثالیں ملتی ہیں۔ لیکن ہمارے روائتی طور پر کمزور حافظے کا برا ہو کہ ہم سب کچھ جلد بھلا بیٹھتے ہیں۔ سکھوں کو ہندوستانی فوج میں ایک برتر حیثیت حاصل ہے۔ اعلی عہدوں پر فائز ہونے کے علاوہ تجارت بھی کافی حد تک ان ہی کے پاس ہے۔ انہیں کیا پڑی کہ ہندوؤں کو چھوڑ کر ہم مسلمانوں کے ساتھ مل جائیں جبکہ انہیں ہندوؤں پر نفسیاتی برتری بھی حاصل ہے۔ کیپٹن نیازی کے ہاتھ میں ہتھکڑی کا باقی حصہ بدستور موجود تھا۔ ابھی تک انہیں پتہ نہیں لگا تھا کہ بھاگنے والا کسی کے ساتھ بندھا ہوا بھی تھا یا نہیں۔ بڑی تگ و دو کے بعد اسکی ہتھکڑی کو کاٹ کر باہر پھینک دیا گیا۔ وصال نے جو شروع ہی سے کسی کے ساتھ بندھا ہوا نہیں تھا غسل خانے سے واپسی پر اسکے ساتھ اپنا ہاتھ بندھوا لیا۔ ٹرین رات کے آٹھ

بجے کے قریب چلی۔ کمینے قسم کے دونوں حوالدار سنتریوں کے ساتھ ہمارے ڈبے میں موجود تھے۔ میں نے اور میجر جنجوعہ نے غسل خانے میں جانے کے لیئے تاروں کے پاس جا کر ہتھکڑی کھلوائی۔ جنجوعہ غسل خانے کے ساتھ والے کمپارٹمنٹ میں بیٹھ گیا اور میں تاروں کو ایک طرف کر کے غسل خانے کی طرف چلا گیا۔ یہاں سے باقی افسر نظر نہیں آتے تھے اور غسل خانے کا دروازہ باہر جانے والی راہداری میں کھلتا تھا۔ ہمارے بعد میجر نصیب اللہ اور میجر جعفر غسل خانے کی طرف گئے۔ میجر جعفر ساتھ والے کمپارٹمنٹ میں بیٹھے اس کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے کہ اچانک فائر کی ایک بوچھاڑ کی آواز آئی۔ میں نے میجر جعفر سے پوچھا کہ کیا ہوا۔ کہنے لگے کہ میرا قیاس وہی ہوسکتا ہے جو تمہارا ہے۔ گاڑی رک گئی اور سکھ سنتریوں نے رائفلیں ہماری طرف تان لیں اور کہا کہ خبردار جو حرکت کرنے کی کوشش کی۔ گاڑی کسی ویران علاقے میں کھڑی ہوگئی اور ایسے لگا جیسے ہمارے ساتھ کوئی ڈرامہ کھیلا جانے والا ہے۔ میں کاریڈور میں جنجوعہ کے ساتھ فرش پر لیٹا اس سنتری کی طرف دیکھ رہا تھا جس نے بندوق میرے سر پر تان رکھی تھی۔ بس والا سین نظروں کے سامنے گھوم گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد کپتان نے آ کر بتایا کہ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ میجر نصیب اللہ فرار ہوتے ہوئے ہماری گولیوں کا نشانہ بن گیا ہے۔ کپتان کو شاید ان سکھوں کی عیاری کا علم نہیں تھا اس لیئے ہمارے کہنے پر وہ کرنل حق نواز اور میجر جعفر کو لاش دکھانے کے لیئے نیچے لے گیا۔ انہوں نے واپس آ کر بتایا کہ گولیاں اس کے سینے پر لگی ہیں حالانکہ فرار کی صورت میں گولیاں پشت پر لگنی چاہیے تھیں۔ علاوہ ازیں میجر نصیب اللہ نے فی الحال فرار کا ارادہ عارضی طور پر ترک کر دیا تھا اور اپنے پاس جو رقم تھی وہ بھی کیپٹن ہدایت کو دے دی تھی۔ وردی کے نیچے سویلین کپڑے بھی نہیں پہنے تھے۔ اس کو مارنے کی وجہ اس کا حلیہ اور اسی کمپارٹمنٹ میں ہونا تھا جس کی

سلاخ کاٹی گئی تھی۔اسی بنا پر میرے ساتھ بھی یہی سلوک چند منٹ پہلے ہو سکتا تھا۔عجیب بے بسی کا عالم تھا۔ایک ساتھی کو ہمارے سامنے بلا وجہ شہید کر دیا گیا اور ہم میں کچھ کرنے کی ہمت نہیں تھی۔

شجاعت ریل گاڑی سے چھلانگ لگانے کے بعد بیہوش ہو کر ریل کی دونوں لائنوں کے درمیان بے حس وحرکت پڑا رہا۔صبح کسی باریش مسلمان نے اسے دیکھا تو اس نے نزدیک کے کسی پولیس چوکی میں رپورٹ درج کرادی۔اس وقت تک عام ہندوستانیوں کو کسی قیدی کے فرار ہونے کا علم نہیں تھا۔انہوں نے اس کے ہاتھ میں کٹی ہوئی ہتھکڑی دیکھی تو اندازہ لگایا کہ شاید یہ آدمی جیل سے فرار ہو کر آیا ہے۔ بعد میں جب انہیں پتہ لگا کہ یہ پاکستانی فوجی ہے تو اسے پٹنہ کے ہسپتال میں پہنچا دیا گیا۔گرنے سے اس کی زبان زخمی ہوگئی تھی اس لیے کافی دنوں تک وہ اپنے بارے میں کچھ نہ کہہ سکا۔ماتھے پر بھی گہرا زخم آیا تھا۔شاید اس کی قسمت ہی اچھی نہیں تھی۔ اگر وہ بے ہوش نہ ہوتا تو جس علاقے میں وہ اترا تھا وہاں مسلمانوں کی اکثریت ہونے کی وجہ سے اسے کسی نہ کسی مسلمان کی مدد مل سکتی تھی۔وہاں سے واپس لا کر اسے سیل میں رکھا گیا اور بعد میں وہ پہلے سے طے شدہ کیمپ 98 میں بھیج دیا گیا کیونکہ کیمپ تبدیل ہونے پر کوئی کمانڈنٹ اس جیسے نڈر قیدی کو کسی نہ کسی بہانے قبول کرنے کو تیار نہیں تھا۔ان کا کہنا تھا کہ دہلی میں کسی کمپیوٹر میں تمام قیدیوں کے کوائف بھر دیئے گئے ہیں اس لیے اب قیدیوں کو ایک سے دوسرے کیمپ میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔یوں آخر کار بجائے آگرہ جیل یا کیمپ 98 میں جانے کے شجاعت یہاں لایا گیا۔پورے ہندوستان کا چکر لگا کر میں پھر بنگال کے قریب پہنچ گیا تھا۔یہاں سے فرار کی صورت میں پاکستان پہنچنے میں کافی وقت لگنا تھا۔بعض لوگوں کا خیال تھا کہ ہمیں جنگی جرائم کے مقدمے کے سلسلے میں بنگال سے قریب تر لایا گیا ہے۔رانچی پہنچنے

پر میجر نصیب اللہ شہید کی کمبل میں لپٹی لاش بڑی بے دردی سے ہندو ٹرک میں رکھ رہے تھے۔ بقول انکے وہ اسے مسلمانوں کے کسی قبرستان میں دفنانے جا رہے تھے۔

رانچی کا شہر چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے اوپر پھیلا ہوا تھا۔ دوسری جنگِ عظیم میں انگریزوں کے برمی محاذ کا ہیڈکوارٹر یہیں پر تھا۔ سمندر سے کوئی تین ہزار فٹ کی بلندی پر ہونے کی وجہ سے یہاں کی آب و ہوا خوشگوار تھی۔ کیمپ کے اندر جانے سے پہلے ہمیں ایک دوسرے کیمپ میں ٹھہرایا گیا۔ گیٹ کے پاس کچھ قیدی کوٹھریاں نظر آئیں۔ ایک کوٹھری میں ہماری فوج کا ایک سپاہی عجب کسمپرسی کے عالم میں پڑا ہوا دکھائی دیا۔ ہمارے جوان ہمارے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔ یہاں سے جب کیمپ 98 میں لے جایا گیا تو ایک جگہ روک کر باری باری سب کی تلاشی لی گئی۔ کچھ فاصلے پر کیمپ میں موجود کوئی ساٹھ، پینٹھ افسر ایک پاکستانی افسر کے زیرکمان قطاروں میں کھڑے دکھائی دیئے۔ سینئر پاکستانی افسر سفید رنگت، لال بکھری ہوئی داڑھی اور لمبے لمبے بالوں کے ساتھ عیسائیوں کا روائتی فادر کرسمس لگ رہا تھا۔ چھوٹے سے قد کے ساتھ چھریرا سا جسم اپنے ہاتھوں کی حرکات وسکنات سے بڑا عجیب تاثر دے رہا تھا۔ تلاشی کے بعد ہمیں مختلف کمروں میں بھیج دیا گیا۔

چلتی ٹرین سے چھلانگ۔ شجاعت کی کتاب 'یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے' سے اقتباس

حال ہی میں شجاعت کی سوانح حیات 'یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے' کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ ریل گاڑی سے چھلانگ کے بارے میں جو کچھ اس نے لکھا ہے وہ سیاق وسباق کے ساتھ نیچے درج کیا جا رہا ہے۔ پچاس سال بعد یہ کتاب لکھنے کی وجہ سے وہ بعض چیزیں بھول چکا ہے لیکن میں نے ان میں اپنی طرف سے کوئی تبدیلی نہیں کی۔

ابھی مجھے یاد نہیں پڑتا کہ آگرہ سے رانچی جاتے ہوئے راستے میں کون کون سے اسٹیشن آئے۔ البتہ جہاں گاڑی رکتی، چاہے ریلوے اسٹیشن ہو یا سگنل ڈاؤن نہ ہونے کی صورت میں، تو ہم سے اگلے اور پچھلے ڈبوں میں سوار ہندوستانی فوج کے سپاہی ہمارے والے ڈبے کو گھیرا ڈال کر بندوقوں کا رخ ہماری طرف تان لیتے۔ ڈبے میں موجود ہم سب کی گنتی کی جاتی اور پھر سب اچھا کی رپورٹ کیپٹن راٹھی کو دی جاتی۔ ریل گاڑی کے ڈبے کی ہر کھڑکی میں چار لوہے کی سلاخیں متوازی حالت میں جڑی ہوئی تھیں۔ چوری کی ہوئی اس چھوٹی سی لوہے کی ریتی (آری کی پتری) کی قدر کا احساس ہوا۔ میجر قادر ہمارے ماسٹر مائنڈ ساتھی

تھے۔ہم نے منصوبہ بنایا کہ ریتی کے ساتھ سب سے نچلی والی سلاخ کو کاٹیں گے تاکہ اس کو ایک طرف موڑنے کے بعد بیچ میں سے گزرنا ممکن ہو۔ چنانچہ اسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اندھیرے کا انتظار کرنے لگے تاکہ تاریکی اور گاڑی کی چھک چھک کی آواز میں ہم بآسانی اپنا کام پورا کرسکیں۔ڈبے کا ہمارے والا حصہ ہندوستانی پہرے داروں کی نظروں سے اوجھل تھا۔ ان پہرہ داروں کے طور طریقوں کا ہم بخوبی جائزہ لیتے رہے۔ہم میں سے کسی کو بھی واش روم میں جانے کی حاجت ہوتی تو حوالدار کو آواز دی جاتی جو لچھے دار تار کو ایک طرف کر کے اندر داخل ہوتا اور بقیہ دو اسٹین گنیں تان کر پیچھے وہیں کھڑے رہتے۔ ہتھ کڑی کھولی جاتی اور ڈبے میں موجود WC کو استعمال کرنے کی اجازت دی جاتی۔ رفع حاجت کے بعد جب افسر واپس آتا تو دوبارہ اس کو ہتھ کڑی لگا دی جاتی۔ رات کے تقریبا نو بجے ہونگے کہ ہم نے سلاخ کاٹنے کا کام شروع کیا۔ سب سے نچلی سلاخ کو داہیں کونے سے کاٹنا شروع کیا۔ پتری بہت چھوٹی تھی اور اس کا پکڑنا مشکل، خدشہ تھا کہ کہیں کاٹتے کاٹتے ہاتھ سے کھڑکی میں سے باہر نہ گر جائے۔اس بات کا ہمیں خاص دھیان رکھنا پڑتا تھا۔ جب گاڑی رکتی تو ہم اپنا کام روک دیتے اور جب دوبارہ چلتی تو ہم اپنا کام مزید گرم جوشی سے شروع کر دیتے۔ جب افسروں کا ایک جوڑا تھک جاتا تو اس کی جگہ دوسرا لے لیتا،

آگرہ جیل میں رانچی تک کے سفر کے بارے میں باتوں باتوں میں کیمپ میں موجود ہندوستانی سپاہی یا افسر سے معلومات حاصل کرنی کی کوشش کی گئی تھی۔ بتایا گیا کہ آگرہ سے رانچی کا سفر ایک دن اور رات کا ہے۔رات پڑ چکی تھی اور ہمارا کام تیزی سے جاری تھا، صبح تقریبا تین بجے ہم سلاخ کاٹنے میں کامیاب ہو گئے۔ اب مسئلہ تھا ہتھ کڑی کا۔ چنانچہ ساتھ والے کمپارٹمنٹ میں بیٹھے کیپٹن احسن صدیق کے

پاس ہم دونوں گئے یعنی میں اور نیازی۔ میرے کہنے پر اس نے کڑیوں کو کاٹنا شروع کیا۔ تقریبا آدھ گھنٹے کے بعد کڑی کٹ گئی، اب میری کلائی میں صرف ہتھ کڑی کا ٹکڑا تھا۔ ایک عجیب خوشگوار احساس پیدا ہوا کہ میں اب آزادی حاصل کرنے والا ہوں۔ کیپٹن احسن کے پاس کچھ ہندوستانی روپے تھے۔ میں نے اس سے بیس روپے لیکر اپنی جیب میں ڈال لیئے۔ سلاخ کھینچ کر سب سے پہلے میجر قادر نے اپنا سر باہر نکال کر گاڑی کی رفتار کو جانچا اور سر واپس ڈبے میں کر لیا، یہ کہہ کر کہ رفتار تیز ہے۔ ایک دم سناٹا چھا گیا۔ اس سناٹے کو توڑتے ہوئے میں نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے تمام افسروں سے اجازت لی کہ اگر کسی کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں بھاگنے کی کوشش کر سکتا ہوں۔ سب نے مثبت میں جواب دیا۔ چنانچہ سب کو اللہ حافظ کہنے کے بعد میں کھڑکی سے باہر نکلا۔ اوپر والی سلاخ کو میں نے اپنے بائیں ہاتھ سے مضبوطی سے تھام لیا۔ میجر قادر نے میرے داہیں ہاتھ کو تھامے رکھا۔ میں نے اردگرد کے زمینی حالات کا جائزہ لیا۔ ہماری گاڑی کے متوازی ریل گاڑی کی ایک اور پٹڑی بھی تھی۔ ہم نے یہ بھی پہلے سے نوٹ کر چکے تھے کہ جونہی گاڑی کی رفتار آہستہ ہوتی ہے تو آگے اور پیچھے والے ڈبوں میں موجود ہندوستانی سپاہی دروازاں میں کھڑے ہو کر ہمارے ڈبے کی طرف دیکھتے رہتے ہیں کہ آیا کوئی بھاگنے کی کوشش تو نہیں کر رہا۔ موجودہ رفتار پر وہ یہ نہ کر سکتے تھے کہ ایک تو شاید یہ امید نہیں تھی کہ گاڑی کی اس رفتار میں کوئی بھاگنے کی کوشش کرے گا اور دوسرا یہ کہ ان کی آنکھوں میں گرد و غبار پڑتی تھی۔ ذہنی طور پر میں بالکل تیار تھا کہ مجھے چوٹیں ضرور آئیں گی اور یہ کہ کہ میں بے ہوش نہ ہوا یا میری ٹانگ نہ ٹوٹی تو بھاگنے میں کامیابی کے زیادہ امکانات ہوں گے۔ میرا خیال تھا کہ میں دونوں پٹڑیوں کے درمیان چھلانگ لگاؤں گا اور جونہی میرے قدم زمین سے ٹکرائیں گے تو para

course کے دوران پیراشوٹ لگانے کے طریقے کے مطابق پیرالینڈنگ اینڈ فال (PLF) کرتا ہوا سنبھل جاؤنگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک خطرناک چانس تھا جس کو میں کسی بھی طور گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ میں ڈبے کی سائڈ سے پورا لٹکا ہوا تھا، دوسرے ہاتھ سے میں نے میجر قادر کواشارہ کیا کہ وہ مجھے چھوڑ دیں۔ انہوں نے میرے ہاتھ کو چھوڑا تو میں نے باقاعدہ ڈبے سے پرے جھولا swing لیا اور لوہے کی سلاخ کو اپنی گرفت سے آزاد کر دیا۔ اس کے بعد مجھے معلوم نہیں کہ کیا ہوا۔

نوٹ: (اس کے بعد اس کے ساتھ رانچی کیمپ میں ہمارے ساتھ دوبارہ ملنے تک کیا ہوا اس کا مختصر بیان پہلے آچکا ہے اور جسکی تفصیل اس کی اپنی کتاب میں دیکھی جاسکتی ہے)

کیمپ 98 میں

میجر جنجوعہ، علاؤالدین اور مجھے ایک چھوٹا سا کمرہ ملا۔ سگنل کے میجر سلیم ملک اور اپنے کورس میٹ میجر سعید اعظم کے علاوہ جاننے والے کچھ افسر ملنے کے لئیے آئے۔ میجر سعید اعظم کے سسر دوسری جنگ عظیم میں سبھاش چندر بوس کی آئی۔ این۔ اے INA (انڈین نیشنل آرمی) کی وجہ سے شہرت پانے والے جنرل شاہنواز اس سے ملنے ہمارے کیمپ میں آئے۔ تقسیم ہند کے بعد ہماری انگریزوں کے ساتھ وفاداری ابھی تک قائم تھی اس لئیے پاکستان نے تو انہیں قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا لیکن ہندوستان میں ان لوگوں کی بہت پذیرائی ہوئی۔ وہ اس وقت اندرا

کی کابینہ میں انڈسٹری کے وزیر تھے اور رانچی میں کسی اسٹیل مل کے دورے پر آئے ہوئے تھے۔ سفید بش شرٹ جس کا کالر پیچھے سے گھسا ہوا تھا اور سفید ہی رنگ کی پتلون میں ملبوس وہ ایک چھوٹی سی consul کونسل کار میں آئے۔ شاید یہ بھی پراپوگنڈا ہو لیکن 1985 میں جب مجھے ایشیا پیسفک ٹیلی کمیونٹی کے سٹڈیز گروپس کے چیئرمین کی حیثیت سے ہندوستان جانا پڑا تو وہاں بھی کچھ وزرا اور سرکاری افسروں کو بھی نہایت سادہ لباس میں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔

کیمپ نمبر 98 تین بیرکوں پر مشتمل تھا اور اس کے اندر اسقدر کھلا علاقہ تھا کہ بآسانی فٹ بال کھیلا جا سکتا تھا۔ آگرہ، بریلی اور میرٹھ کے تنگ ماحول کے مقابلے میں یہ بہت بہتر تھا لیکن فرار کے لیے اتنا موزوں نہیں تھا کیونکہ وہ چاروں طرف سے دوسرے کیمپوں میں گھرا ہوا تھا۔ یہاں پر پہلے سے موجود افسروں کا خیال تھا کہ کیمپ 95 اس کیمپ سے زیادہ بہتر ہے۔ کیمپ 95 میں سرنگ کھودنے کی پاداش میں دونوں کیمپوں کے افسروں کو آپس میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ جس دن ہم وہاں پہنچے اسی دن تیس افسر جو سرنگ کھودنے میں پیش پیش تھے ہماری جگہ آگرہ بھیج دیئے گئے تھے۔ ہماری تبدیلی انہی افسروں کی وجہ سے ہوئی تھی۔

کیمپ کمانڈنٹ کرنل مان سنگھ بریلی والے میجر آلووالیہ کا بڑا بھائی لگتا تھا۔ ہمیں فالن کر کے اس نے پیدل انگریزی میں تقریر جھاڑنے کی کوشش کی۔ مجھے یاد ہے بالکل اسی طرح جس طرح بے بس جونیئر کیڈٹوں کے سینئر اپنے لیکچریٹ lecturette کی صلاحیتوں کو ابھارنے کے لیئے انٹ شنٹ قسم کی انگریزی بولتے رہتے تھے جس میں یو بلڈی ایڈیٹ (you 'blady' idiot) ہر دوسرے تیسرے فقرے میں ضرور دہرایا جاتا تھا۔ پی ایم اے میں تو ذہن میں مسکرانے تک کا تصور نہ آتا تھا لیکن یہاں تو بے روک ٹوک ہنسی جاری ہو جاتی۔ لگتا

تھا کہ ہندوستانی فوج میں انگریزی کو زیادہ اہمیت حاصل نہیں۔

کرنل رضا یہاں ایس پی (سینئر قیدی) اور کرنل جنجر کے نام سے مشہور تھے۔ ہندوستانیوں سے گفت و شنید میں کافی ماہر تھے اور ان کی حکمتِ عملی کی وجہ سے ہندوستانی ہمارے معاملات میں بہت کم دخل دیتے تھے۔ لیکن ان کی یہ بات مجھے اچھی نہیں لگی کہ وہ صبح و شام گنتی کے لیئے آنے والے ہندوستانی فوج کے صوبیدار کے سامنے اٹینشن ہو جاتے تھے۔ میں نے جب انہیں کہا کہ یہ پاکستانی افسر کے شایانِ شان نہیں تو انہیں یہ بات ناگوار گزری اور کہنے لگے تم نہ ہونا میں ہو جایا کروں گا۔

یہاں کے اکثر افسر مشرقی پاکستان سے بڑے آرام کے ساتھ لائے گئے تھے اور بڑے مزے کی زندگی گزار رہے تھے۔ انکا اب تک ہندوستانیوں سے کسی معاملے میں بھی ٹکراؤ نہیں ہوا تھا۔ آگرہ سے آئے ہوئے افسروں نے میری اٹینشن ہونے والی بات کی حمایت کی لیکن پہلے سے موجود افسروں کا خیال تھا کہ ہم ہیرو بننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کرنل رضا نے بعد میں یقین دلایا کہ وہ اس معاملے میں کرنل مان سنگھ سے بات کریں گے۔ یہاں ہم نے میجر نصیب اللہ شہید کے سفاکانہ قتل پر احتجاج کرنے کو کہا لیکن اس میں بھی کیمپ کے پرانے افسروں نے ساتھ دینے سے یہ کہہ کر انکار کیا کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

یہاں سب کی زندگی بڑے آرام سے گزر رہی تھی۔ اچھی بھلی میس تھی۔ کھانا تو وہی تھا جو ہمارے جوانوں کو بھی ملتا تھا لیکن الاؤنس کی صورت میں ملنے والی رقم سے اس کی حالت بہتر کر لی جاتی تھی۔ ابھی تک کئی لوگوں کے پاس ہیٹر اور امرشن راڈ موجود تھے اور ان کی مدد سے ہر کمرے میں سالن کو تڑکا لگایا جاتا تھا۔ اس کیمپ میں ایک افسر اپنے ساتھ اٹھارہ بھرے ہوئے صندوق لایا تھا۔ دودھ

کے ڈبے چاکلیٹ ڈرنک اور بورن ویٹا جو شاید پاکستان میں بھی استعمال نہ کیا تھا جان بنانے کے کام آتا رہا۔ کینٹین کا سامان عموماً دس پندرہ دن لیٹ آتا اور اس بات پر ہندوستانیوں سے نوک جھونک لگی رہتی تھی۔ کچھ افسروں کا خیال تھا کہ یہ آگرہ سے آئے ہوئے افسروں کی کمینگی ہے۔ لیکن میرا خیال تھا کہ کسی نہ کسی بات پر تکرار ہی نفرت کی اس دیوار کو قائم اور پختہ رکھ سکتی ہے جو ہمارے دلوں میں ان کے لیئے ہمیشہ سے ہے۔ میجر جنرل شاہ بیگ سنگھ جو مکتی باہنی کا ایک بانی تھا جب ایک دفعہ ہمارے کیمپ میں آیا تو اس کی کسی بات پر میں نے اونچی آواز میں کہا کہ ضرور اس وقت بارہ بج رہے ہونگے لیکن میری بات اس نے سنی ان سنی کر دی۔ کرنل مان سنگھ کو جب میرے بارے میں پتہ لگا کہ میں پرانا چارج شیٹر ہوں تو اس نے مجھے کرنل رضا کے کمرے میں بلا کر کہا کہ ہمیں تحریری طور پر اس بات کا وعدہ چاہیے کہ تم آئندہ کبھی فرار ہونے کی کوشش نہیں کرو گے۔ میرے انکار پر اس نے کہا کہ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ تم فرار کے منصوبے بنا رہے ہو۔ میں نے جواب دیا کہ فی الحال تو ایسا کوئی ارادہ نہیں لیکن یہ حق جو ہر قیدی کا ہے میں گنوانا نہیں چاہتا۔ خیر اگر میرا رویہ یہ نہ ہوتا کہ ان کی کوئی غیر مناسب بات نہیں مانتی تو میرے لکھ دینے سے میری فرار کی کوششوں پر کوئی اثر نہیں پڑنا تھا۔ مان سنگھ کی سوچ سکھوں والی تھی اسلیئے اس کے خیال میں میرے لکھ کر دینے سے یا تو اس کی نیند پر مثبت اثر پڑ سکتا تھا یا پھر وہ اپنے سینیئرز سے داد وصول کر سکتا تھا

افسر یہاں سارا دن برِج، شطرنج کرکٹ اور والی بال کھیلتے رہتے تھے۔ ان کھیلوں کے باقاعدہ مقابلے ہوتے اور جیتنے والوں کو انعامات دیئے جاتے۔ کرنل رضا اس لحاظ سے قابلِ تحسین تھے کہ وہ افسروں کو اس طرح کے مشاغل میں مصروف رکھتے تھے۔ خود اُن کے منہ سے کبھی بیوی بچوں کا ذکر نہیں سنا تھا۔ لیکن ان

سے یہ گلہ ضرور رہا کہ وہ ہمیشہ ہندوستانیوں سے نرم رویہ رکھنے کا درس دیتے رہے۔ بقول انکے زیادہ تر افسر بھی یہی چاہتے تھے۔شاید وہ اس خیال میں حق بجانب تھے۔

اولمپک ہاکی کے مقابلے ہو رہے تھے اور ہندوستان اور پاکستان کے درمیان فائنل میچ تھا۔اکثر لوگوں کے پاس ریڈیو تھے اس لیئے ہر کوئی اس سے کان لگائے بیٹھا تھا۔ایسا محسوس ہور ہا تھا جیسے ہاکی کا مقابلہ نہیں دونوں ملکوں میں باقاعدہ جنگ ہو رہی ہو۔گیند کی ہر حرکت پر دل کبھی خوشی اور کبھی خوف سے دھڑکتا۔ پاکستان کے پہلے گول پر اللہ اکبر اور پاکستان زندہ باد کے فلک شگاف نعرے لگائے گئے۔خوشیوں سے بھرپور یہ صدائیں اتنی اونچی تھیں کہ ان میں سنتریوں کی سیٹیوں اور چیخوں کی آوازیں دب گئیں۔ٹین کے ڈبے' تالیوں کی تال اور ہے جمالو پر رقص خوشی اور وطن سے محبت وعقیدت کا منظر پیش کر رہے تھے۔

مشرقی پاکستان کے الگ ہونے کے بعد مغربی پاکستان کی سلامتی کی فکر رہتی تھی۔پاکستان میں کچھ لوگوں کا مطالبہ تھا کہ بنگلہ دیش تسلیم کرو اور قیدی واپس لے لو لیکن زیادہ تر قیدیوں کو بظاہر یہ بات پسند نہیں تھی۔ بیرونی ملکوں میں پاکستانی عورتوں کا جا کر رونا دھونا تو بہت ہی تکلیف دہ بات تھی۔ ہندوستانی اخباروں اور رسالوں نے تو ان چیزوں کو اور بھی زیادہ اچھالا تھا۔جنگی قیدیوں کی بیویوں کے اسلام آباد میں سفارتی نمائندوں کے سامنے جا کر ہماری واپسی کے مطالبے نے دل پر جو نشتر زنی کی اس کا کوئی مداوا نہیں تھا۔ایک ویکلی رسالے میں پاکستانی عورتوں کے ایک جلوس کی تصویر کے نیچے لکھا تھا۔

"POW's wives show their shalwar and saris to foreign diplomats"

(قیدیوں کی بیویوں نے اپنی شلواریں اور ساڑھیاں غیر ملکی سفارت کاروں کو دکھائیں)۔ایک اور تصویر کے نیچے یہ الفاظ تھے۔ "Bring back o u r husbands we cannot live without them " (ہمارے خاوندوں کو واپس لاؤ ہم ان کے بغیر نہیں رہ سکتیں)۔ میں نے گھر خط لکھ کر (ہر قیدی کو ریڈ کراس کی طرف سے ہفتے میں دو لفافے ملتے تھے) انہیں سختی سے منع کیا کہ وہ لوگ اس طرح کے جلوسوں میں شامل نہ ہوں اور نہ ہی ریڈیو وغیرہ پر کوئی پیغام دیں کیونکہ ہمیں کسی عارضی مورال بوسٹر کی ضرورت نہیں۔ ہمیں لیکچر دینے کے لیئے کسی مسلمان صنعت کار کو بلایا گیا۔لیکن غیر متوقع طور پر اس نے لیکچر دینے سے زیادہ اپنی غزلیں سنائیں جن میں پروپیگنڈے کی کوئی بات نظر نہیں آئی۔ ہمارے کچھ نوخیز شاعروں نے بھی موقع دیکھ کر اپنی غزلیں سنا ڈالیں۔مہمان شاعر کو پاکستانی شاعر ناصر کاظمی سے گہرا لگاؤ تھا اور اس نے اس کا ذکر بڑی عقیدت سے کیا۔ جب کسی افسر نے بتایا کہ وہ وفات پا چکا ہے تو وہ آبدیدہ ہو گیا۔ایک ہم پھوہڑ کہ اس کے نام تک سے بھی واقف نہیں تھے۔ قیدی شاعروں میں ڈاکٹر میجر ترین کا کلام بہت پسند کیا گیا۔ چاروں طرف پھیلے ہوئے جوانوں کے کیمپوں میں تقریباً پانچ جوانوں کا تعلق ہمارے گاؤں سے تھا۔ان میں ایک میرا قریبی رشتہ دار حوالدار انور حسین بھی تھا۔کبھی کبھی ان لوگوں سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ دوسری جنگِ عظیم میں کوئی دوسو فوجی جوان ہمارے گاؤں سے شامل تھے جن میں میرے والد میجر فضل حسین کے علاوہ پانچ سگے تائے اور ایک چچا بھی تھے۔ چچا عبدالرحمان مشرقی معاذ پر لڑائی کے دوران فوت ہوئے اور مشرقی پاکستان کے علاقے کاکس بازار میں مدفون ہوئے۔ اب کوئی پینتیس کے قریب بھارت کے مختلف کیمپوں میں اسیر تھے۔ پہلے یہ قید انگریزوں کی تھی اور اب ہندوؤں کی۔میجر جعفر کے علاوہ چند

اور افسروں کو آنکھوں پر پٹی باندھ کر پوچھ گچھ کے لیئے لے جایا گیا تو راستے میں انہوں نے ٹرک کے فرش پر بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ اس بات پر سنتریوں سے ان کا جھگڑا ہو گیا۔ جھگڑے کی پاداش میں میجر جعفر کو قیدِ تنہائی کی سزا سنائی گئی۔ اس فیصلے پر پورے کیمپ میں غم و غصے کا اظہار کیا گیا۔ کرنل طیب ان میں پیش پیش تھے۔ کسی نے ان کی شکایت کر دی کہ وہ باقی افسروں کو اس معاملے پر بھڑکا رہے ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ شکایت کرنل رضا نے کی ہے۔ لیکن ہندوستانیوں کا کہنا تھا کہ ان کے پاس ہی کھڑے کسی ہندوستانی سنتری نے ان کی اشتعال انگیز باتیں سن کر شکایت کی ہے۔ کرنل طیب کو بھی سیل میں منتقل کر دیا گیا۔ کرنل رضا کی تگ و دو اور باقی سب کے احتجاج پر چند دنوں کے بعد انہیں کیمپ میں واپس لایا گیا۔ اس حادثے کی وجہ سے تلخی بڑھ گئی تھی۔ یہ خبر سن کر کہ ارشاد اور عبدالرحمٰن نیپال سے وطن واپس پہنچ گئے ہیں کافی خوش ہوا کہ گھر والوں کو اس کے آنے سے کافی تسلی ہو جائے گی۔

باقی مشاغل کے علاوہ قصر نماز پر بحث چلی تو کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ قصر نماز پڑھنی چاہیے اور کچھ مخالفت میں تھے۔ علماء کو خطوط لکھ کر ان سے رائے طلب کی گئی کیونکہ یہاں ہر ایک کی اپنی رائے اور سوچ تھی۔ میں نے نمازِ قصر کے خلاف ایک خیمے میں قائم مسجد میں تقریر کی۔ مذہبی معاملات پر میری یہ پہلی کاوش تھی لیکن پھر بھی کچھ اثر پذیر لگی۔ اس کے باوجود ''مولویوں'' کے آگے ہم اناڑیوں کا زور زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا۔ بہر حال میں کمرے میں ہی پوری نماز پڑھ لیتا تھا۔

کیمپ 98 سے 95 اور سرنگ کا آغاز

ایک دن ہمیں خوش خبری ملی کہ ہمیں دوبارہ کیمپ 95 میں منتقل کیا جائے گا۔ خوشی اس بات کی تھی کہ وہاں سے پہلے بھی ایک سرنگ نکالی گئی تھی۔ اس کے دو اطراف میں کوئی اور کیمپ نہ ہونے کی وجہ سے آسانی کے ساتھ فرار کا کوئی پہلو نکل سکتا تھا۔ اس لیئے کافی عرصے سے افواہیں سن کر وہاں جانے کے لیئے میں بہت بے تاب تھا۔ ایک دن اچانک ہم سے کہا گیا کہ اپنا اپنا سامان گیٹ سے باہر رکھ دیں۔ اس طرح بہت سے افسروں کے دفینے وہیں رہ گے جو بعد میں خفیہ روابط قائم ہونے پر آہستہ آہستہ اپنے مالکوں کے پاس پہنچتے رہے۔

گیٹ سے باہر ایم پی' کا ایک جے سی او اور کچھ این سی اوز چھان بین کے لیے کھڑے تھے۔ ہمارے ہیٹر heaters اور immersion rods مرشن راڈ اسی چھان بین کی نذر ہو گئے۔ میں نے نظر بچا کر جو ایک ہیٹر سے تار اُدھیڑنا چاہی تو شومئی قسمت سے وہ کسی سوراخ میں اٹک گئی۔ جے سی او نے نعرہ لگایا کہ میں نے جو کہا ہے کہ الیکٹرک کی چیزوں کو ہاتھ مت لگائیں۔ اس کے بعد میرا سامان اس نے بڑے غور سے دیکھا۔ مجھے فکر تھی کہ سلیپنگ بیگ میں چھپائے گئے قمیض اور پاجامے کا اسے کہیں پتہ نہ لگ جائے۔ وہ اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر غور سے ٹٹول رہا

تھا۔ اس نے اسے ایک طرف پھینکا تو میرے چہرے پر اطمینان کا تاثر دیکھ کر پھر اٹھا لیا اور ایک بار پھر خوب باریکی سے چھان بین کی۔ اس کو شک گذرا کہ اس میں شاید کوئی پستول یا نوٹ چھپے ہوں لیکن اس مرتبہ بھی اسے مایوسی ہوئی۔ ہمارے پاس سے دوسرے کیمپ کے کچھ افسر گزرے ان میں شجاعت بھی ایک گاڑی میں سوار ہو کر جا رہا تھا۔

دوسرے کیمپ میں پہنچے تو مجھے دیکھتے ہی شجاعت دوڑ کر گلے ملا۔ ایسا لگا جیسے میرا مدتوں سے بچھڑا ہوا بھائی آن ملا ہو۔ یہاں کیپٹن شجاعت کے علاوہ ورثے میں تین کرنل ڈاکٹر بھی ملے جنہیں دوسرے کیمپ میں نہیں بھیجا گیا تھا۔ یہ کیمپ پہلے کیمپ سے زیادہ کشادہ تھا۔ کسی افسر میس اور اس کے ساتھ ملحقہ افسروں کے کمروں کو کیمپ میں تبدیل کیا گیا تھا۔ تین اطراف میں دیواریں تھیں جس کی وجہ سے سنتری (سوائے ٹاور والوں کے) بہت کم نظر آتے تھے۔ گو یہاں بھی تاروں کی تین تین قطاریں تھیں لیکن یوں لگتا تھا کہ کسی اندھیری یا طوفانی رات کو یہاں سے نکلنا نسبتاً آسان ہوگا۔ نقص تھا تو صرف اتنا کہ بیرکوں سے باڑ کافی دور تھی جس کی وجہ سے درمیان کا خالی علاقہ عبور کرتے ہوئے سنتریوں کی نظروں سے بچنا ناممکن لگتا تھا۔ کم بختوں نے گز گز لمبی ٹارچیں پاس رکھی ہوئی تھیں۔ اور اس پر ستم یہ کہ بجلی فیل ہونے کی صورت میں جنریٹر خود بخود آن ہو جاتا تھا۔

اس کیمپ میں آتے ہی سرنگ کھودنے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ پچھلے کیمپ والوں نے پہلی سرنگ پکڑے جانے کے بعد بیرک سے دور لگے سوپر کے ٹینٹ سے بھی کوشش کی تھی لیکن چار فٹ کی گہرائی پر پانی نکل آنے کی وجہ سے کام ملتوی کر دیا تھا۔ اس علاقے میں بارش بہت زیادہ ہوتی ہے۔ زیر زمین پانی کی سطح بلند ہو کر زمین کے اوپر تک آ جاتی ہے۔ لگتا تھا کہ ہمیں کم از کم دو مہینوں تک انتظار کرنا پڑے

گا۔اس دوران سرنگ شروع کرنے کے لیے مختلف جگہوں کو جانچا اور رد کیا۔ چونکہ مقصد اسے نہ صرف ہندوستانیوں سے چھپانا تھا بلکہ پہلی سرنگ کے انجام سے سبق لیتے ہوئے اپنے بیشتر جوانوں اور افسروں کی نظروں سے بچانا بھی ضروری تھا ۔ یہاں پر پہلے سے موجود افسروں کا خیال تھا کہ اپنے ہی افسروں میں سے ہی کچھ لوگوں نے ہندوستانیوں کے آگے مخبری کی تھی جس کے نتیجے میں سرنگ پکڑی گئی تھی ۔ پاکستان پہنچنے پر ان کا خیال درست نکلا۔ مجھے حیرت اس بات پر ہوئی کہ میرے ساتھ تندہی سے کام کرنے والا ایک افسر بھی ان میں شامل تھا۔

ہمارا خیال تھا کہ دسمبر کے آخر میں پانی کی سطح کم ہو چکی ہو گی اس لیئے موزوں جگہ کی تلاش زور وشور سے جاری ہوگئی۔ہم جس بیرک میں رہ رہے تھے اسی میں سے پہلی سرنگ بھی نکالی گئی تھی۔ چونکہ باقی بیرکوں اور باڑ کا فاصلہ زیادہ تھا اس لیئے انتخاب یہیں سے ہونا تھا۔فرش پختہ تھا اس لیئے سرنگ کا آغاز چھپانا مشکل نظر آیا۔آخری کمرے کے غسل خانے کا فرش کچھ اکھڑا ہوا تھا۔اسے مزید اکھیڑ کر چیکنگ کا انتظار کرتے رہے۔جب معمول کے مطابق ہندوستانی سلاخوں سے اس جگہ کو خوب ٹھوک بجا کر چلے گئے تو طے ہوا کہ یہیں سے آغاز مناسب رہے گا۔

آخری کمرے میں ہم سب کی انتہا ہی خوش قسمتی تھی کہ اس میں کیپٹن شجاعت اور کیپٹن احسن صدیق موجود تھے۔کیپٹن احسن نے مشرقی پاکستان میں کمال پور پوسٹ پر مٹھی بھر جوانوں کے ساتھ 11 دسمبر تک ہندوستانیوں کی پیش قدمی روکے رکھی تھی۔ چونکہ وہ دشمن کے سخت گھیرے میں تھا اس لیئے کوشش کے باوجود بٹالین اس تک کوئی کمک نہ پہنچا سکی تھی۔اس کا تعلق آگرے والے کرنل سلطان کی بٹالین 31 Baluch سے تھا۔ان دو بہادر افسروں کا ذکر ایک متعصب ہندو مورخ D.R. Manekar کی کتاب پاکستان کٹ ٹو سائیز '' Pakistan cut

'to size' میں شاندار الفاظ میں کیا گیا ہے۔اس میں درج ہے کہ کرنل سلطان نے مخالف بریگیڈ کمانڈر بریگیڈئر کلیر سنگھ کے خط کے جواب میں، جس میں اس نے لکھا تھا کہ تم لوگ گھیرے میں ہواس لیئے ہتھیار ڈال دو، لفافے میں گولی بند کر کے لکھا کہ مجھے امید ہے ہم میدانِ جنگ میں ملیں گے اور وہاں دیکھا جائے گا کہ کیا واقعی تم ہتھیار استعمال کرنے میں اتنے ہی ماہر ہو جتنا قلم کے استعمال میں۔ اس کے علاوہ حال ہی میں اس وقت کے انڈین آرمی چیف مانک شاہ نے بھی ایک ٹی وی انٹرویو میں کیپٹن احسن کی بہت تعریف کی لیکن غلطی سے اس کے ایکشن کی جگہ ہلی بتائی جو دراصل کمال پور تھی۔کیپٹن شجاعت اور کیپٹن احسن کے علاوہ کیپٹن قادر، کیپٹن آغا طالب (برنجالی)، کیپٹن اظہر (پھڈے شاہ) اور میجر اجمل اسی کمرے میں رہ رہے تھے۔ان میں میجر اجمل کافی عرصے تک ایس ایس جی میں رہ چکے تھے اور جنگ کے دوران کسی بریگیڈ میں بریگیڈ میجر تھے۔سوائے میجر اجمل کے باقی سب پورے کیمپ میں ہلڑ بازی اور نت نئی شرارتوں کی وجہ سے مشہور تھے۔

شروع شروع میں میجر ذوالفقار جنجوعہ کے علاوہ اپنے کمرے میں بھی کسی کو منصوبے کے بارے میں علم نہیں تھا۔غسل خانے کے علاوہ متبادل سکیم یہ تھی کہ ساتھ والے سٹور اور شجاعت وغیرہ والے کمرے کے درمیان اینٹوں سے چُنی ہوئی دیوار میں سے سوراخ نکال کر سرنگ دوبارہ وہیں سے شروع کی جائے۔ چونکہ اسٹور روم میں زمین سے ایک ڈیڑھ فٹ کی بلندی پر دیوار میں سیمنٹ کے تختے لگے ہوئے تھے اس لیے خیال تھا کہ سرنگ کے داخلے کی جگہ جو فرش اور پہلے تختے کے درمیان دیوار کاٹ کر بنانا تھی ہندوستانیوں کی نظروں سے پوشیدہ رہ سکے گی۔اس جگہ سوراخ کو اسبسٹاس asbestos کی شیٹوں سے جو کیمپ میں موجود تھیں اچھی طرح ڈھانپا جا سکتا تھا۔مسئلہ صرف اتنا تھا کہ سٹور روم اور کمرے کے درمیان والی دیوار کی اینٹوں کو

ہر روز دوبارہ ایسے کس طریقے سے جوڑا جائے کہ کسی کو شک نہ پڑے۔ گو کینٹین کا سامان اور کچھ فرنیچر اس کے آگے رکھا جا سکتا تھا لیکن پچھلی سرنگ کے پکڑے جانے کے بعد تلاشی اتنی باریکی سے کی جاتی تھی کہ کبھی نہ کبھی اس کا پتہ لگ جانا ممکن تھا۔

اسٹور کا ایک دروازہ شجاعت وغیرہ کے کمرے کے اندر کھلتا تھا اور گذشتہ سرنگ کے پکڑے جانے کے بعد اسے لکڑی کے تختے اور کیلیں لگا کر بند کر دیا گیا تھا۔ میں نے کمرے کے افسروں سے کہا کہ اسے احتیاط سے کھول کر دیوار میں مناسب سوراخ کرنا شروع کر دیں تاکہ سٹور روم تک رسائی حاصل ہو سکے۔ چونکہ ہر کمرے کے باہر سرِ شام تالا لگا دیا جاتا تھا اس لیے میرے لیئے اسطرف جانا ممکن نہیں تھا۔ اس مرحلے پر میں نے اپنے کمرے کے باقی تین افسروں میجر سلیم ملک، میجر علاؤالدین اور میجر ذوالفقار جونیئر کو بھی آگاہ کر دیا۔

ہمارے کمرے کی چھت پر ایسبٹاس Asbestos کی فالس سیلنگ false ceiling میں ایک چھوٹی سی کھڑکی رکھی گئی تھی تاکہ بجلی میں نقص پڑنے پر مستری وغیرہ سیڑھی لگا کر آسانی سے اوپر چڑھ سکیں۔ ہم نے اوپر چڑھنے کے لیئے چارپائیوں کی نواڑ اور مچھر دانی کے ڈنڈوں سے سیڑھی بنا لی جو استعمال کے بعد کھول کر الگ کر دی جاتی تھی تاکہ کسی کو شک نہ پڑے۔ آخری کمرے کی چھت سے بھی اسبٹاس کی ایک شیٹ کی چوکاٹ ہٹا کر وہاں تک آنے جانے کے لیئے چھت والے راستے کو استعمال کرنا شروع کر دیا۔ رات کے اندھیرے اور سناٹے میں اتنی لمبی بیرک کی چھت پر سے اکڑوں ہو کر خاموشی سے گزرنا مشکل تھا۔ آخرکار ہماری اس رات کی آمدورفت کی وجہ سے باقی کمروں کے افسروں کو شک پڑ گیا اور کچھ کھسر پھسر شروع ہو گئی۔

اینٹوں کے ردوں کو آہستہ آہستہ کریدا گیا تاکہ سنتریوں کے علاوہ ساتھ

جڑے ہوئے کمرے کے لوگوں کو بھی خبر نہ ہو۔ کام کے دوران ریڈیو کی آواز اونچی کر دی جاتی تا کہ شور اس آواز میں دب جائے۔ ایک دن شجاعت نے خوش خبری سنائی کہ دیوار سنگل کی بجائے دوہرے ردے کی ہے۔ میرے ذہن میں فوراً خیال آیا کہ کیوں نہ سرنگ کا آغاز اسی دیوار کے نیچے سے کیا جائے۔ جب اپنے خیال کا اظہار سب کے سامنے کیا تو کوئی بھی اس حقیقت کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا کہ اتنے تنگ سوراخ میں سے نیچے جایا جا سکتا ہے۔ میں نے دو چار پائیوں کو جوڑ کر ان میں نو انچ کا فاصلہ رکھ کر اس میں سے گذر کر دکھایا تو کچھ مطمئن ہوئے۔ طے پایا کہ دیوار کو محراب کی شکل میں اس طرح کریدا جائے کہ فرش کے نزدیک وہ صرف ایک ڈیڑھ انچ موٹی رہ جائے اور ہمیں آٹھ انچ چوڑا سوراخ سرنگ کے اندر جانے کے لیئے مل جائے۔ دیوار اور دروازے کے درمیان ایک آدھ انچ جگہ کے علاوہ ایک انچ دروازے کی موٹائی بھی شامل کر لی جائے تو کسی نہ کسی طرح ہمارا سرنگ کے اندر جانا ممکن ہو سکے گا۔ دروازے کی تختیاں چوکھٹ کے ساتھ سے اُکھیڑ کر پورے پیچوں کی جگہ سوراخوں میں ان کے کٹے ہوئے چھوٹے ٹکڑے ڈال دیئے۔ چٹخنی کے پیچ کھول کر اس کے نیچے سوراخ کر کے دروازے اور چوکھٹ کے درمیان لوہے کا ایک بڑا پیچ لگا دیا تا کہ ہندؤں کو شک بھی پڑ جائے تو چٹخنی کھولنے کے بعد دروازہ نہ کھلنے پر انہیں یہی محسوس ہو کہ تختیاں اپنی جگہ پر مضبوطی کے ساتھ لگی ہوئی ہیں اور ایسا لگے کہ شاید دیوار بنانے سے پہلے دوسری طرف سے دروازے کو چٹخنی لگا دی گئی تھی۔

آواز باہر نکلنے کے خطرے کی وجہ سے اینٹوں کو رات کے وقت آہستہ آہستہ کریدنا شروع کیا لیکن اس طریقے سے کام کی رفتار اتنی سست تھی کہ دو ہفتوں میں بھی کوئی خاص پیش رفت نہ ہو سکی۔ اس لیئے دوپہر کو تقریباً دو بجے جب سب لوگ مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے چلے جاتے تو لنگر کی کلہاڑی سے پانچ، دس منٹ تک تیز

تیز وار کر کے دیوار کو تیزی سے کاٹنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد فرش اور سیمنٹ سے چنی ہوئی انیٹوں کی بنیادوں کے آٹھ دس ردوں نے کافی وقت لیا۔ اسطرح ایک رات میں بمشکل ایک دو ردے ہی اُکھڑتے تھے۔ اے کاش کہ یہ عمارت کسی پاکستانی ٹھیکیدار نے بنوائی ہوتی!

جب اس بات کا پورا یقین ہوگیا کہ سرنگ کے آغاز کے لیے یہ جگہ بالکل موزوں ہے تو میں نے مناسب سمجھا کہ بیرک کے تمام افسروں کو اس راز میں شامل کر لیا جائے۔ کیمپ کی باقی بیرکوں میں رہائش پذیر افسروں کو اس لیے نہیں بتایا کہ ایک تو وہ رات کو کمرے مقفل ہونے کی وجہ سے کھودنے میں ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتے اور دوسرے یہ کی جتنے زیادہ لوگوں کو اس کا علم ہوگا اس بات کا راز میں رہنا اتنا ہی مشکل ہوگا۔

تمام افسروں کو اس راز ہیں شامل کرنے کے لیئے ان کو اپنے کمرے میں اکھٹا کر کے اس منصوبے سے آگاہ کیا۔ اور ساتھ ہی فرار کی کمیٹی Escape Committee لیکشن کی تجویز پیش کی۔ چونکہ بیرک میں پانچ افسر مجھ سے سینئر تھے اس لیئے ان میں سے کسی ایک کو چیئرمین کی ذمہ واری قبول کرنے کو کہا۔ لیکن انہوں نے یہی مناسب سمجھا کہ یہ بار میں ہی اُٹھائے رکھوں۔ اس کمیٹی میں ہر کمرے سے ایک نمائندے کا انتخاب ہوا۔ چونکہ پہلی سرنگ کے بارے میں کسی افسر نے ہندوستانیوں کے آگے مخبری کی تھی اس لیئے میں نے اس راز میں شامل ہر افسر سے قرآن مجید پر ہاتھ رکھ کر رازداری کی قسم کھانے کی شرط رکھی۔ کافی دنوں تک تو لوگ انکار کرتے رہے لیکن چونکہ یہ پہلو میرے خیال میں بے حد ضروری تھا اس لیئے میں مصر رہا کہ سرنگ کا آغاز اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک سب لوگ قسم نہ اٹھالیں۔ کچھ تگ و دو کے بعد سوائے ایک افسر کے جس نے پہلے ہی اس منصوبے

میں شامل ہونے سے انکار کر دیا تھا سب افسروں نے قسم کھا لی۔ قسم کے الفاظ کچھ یوں تھے۔ 'میں خدا کو حاضر ناظر جان کر اور قرآنِ پاک پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاتا ہوں کہ سرنگ کے بارے میں کسی ایسے شخص کو جسے اس کا پہلے سے علم نہ ہو یا چیئر مین اسکو بتانے کی اجازت نہ دے زبان سے یا اشارے سے آگاہ نہیں کروں گا حتیٰ کہ میں پاکستان پہنچ جاؤں'۔

بیرک میں کل تیس افسر تھے جنہیں آٹھ آٹھ کے تین گروپوں میں بانٹ دیا۔ باقی چھ افسروں کو جن میں اکثریت عمر رسیدہ اور بیمار لوگوں کی تھی سنتری ڈیوٹی کے لیئے مقرر کر دیا۔ تین شفٹ لیڈر مقرر کیئے جن میں، میجر اجمل (بعد میں بریگیڈیئر) اور میجر مرزا عبدالحق (سابقہ بریگیڈ میجر اور بعد میں بریگیڈیئر) شامل تھے۔ افسروں کے علاوہ اپنے کمرے کے دو اور سرنگ والے کمرے کے دو اردلیوں شریف اور سرور کو بھی اس منصوبے میں شامل کرنا پڑا۔ سرنگ کھودنے کے لیئے مختلف ہتھیار مختلف مرحلوں پر بنتے اور استعمال ہوتے رہے۔ تنور سے چرائی ہوئی روٹی نکالنے والی دو سلاخیں جن کا منہ کوٹ کوٹ کر چپٹا کر دیا گیا تھا سرنگ کھودنے میں بہت مدد دیتی رہیں۔ لیکن کیپٹن الیاس نے، جس کا مشغلہ ہی نت نئے ہتھیار بنانا تھا، دروازے کی چوکٹیں اور دیوار کے درمیان لگے ہوئے لوہے (بیرے) کو نکال کر جو ''تیشے'' بنائے اس کی وجہ سے کام کی رفتار بہت بڑھ گئی تھی۔ مٹی نکالنے کے لیئے ہندستانیوں کے عنایت کردہ سخت اور کھردرے فوجی تولیوں کو سی کر اور نواڑ کے ہینڈل لگا کر تھیلے بنائے گئے۔ اس سے قبل جو سرنگ کھودی گئی تھی ہندوستانیوں نے اسے مختلف جگہوں سے گڑھے کھود کر اینٹوں اور مٹی سے بھر دیا تھا۔ لیکن ہمارا خیال تھا کہ اب بھی اس کا کچھ حصہ محفوظ ہو گا اس لیئے سرنگ کا آغاز اسی سمت میں کیا۔ میجر اجمل کی پارٹی کام پر لگی ہوئی تھی کہ رات کے دو بجے کے قریب مجھے بلایا گیا۔ ہر

کوئی نہایت جذباتی ہو رہا تھا۔ سرنگ کھودتے ہوئے ایک جگہ سوراخ ہوا تو پتہ چلا کہ ہماری اور پرانی سرنگ کا سنگم ہو چکا ہے۔ اس سنگم پر سب بہت خوش تھے۔ یوں بھی اس دن 23 مارچ کا دن تھا اس لیئے ہماری خوشی دو چند ہو گئی۔ جلدی جلدی سوراخ کھلا کر کے اندر گھسے تو کچھ مایوسی ہوئی۔ نہ صرف یہ کہ یہ حصہ کیچڑ سے بھرا ہوا تھا بلکہ چھ سات فٹ کے بعد بند ہو جاتا تھا۔

سردی اور کیچڑ کی پرواہ کیے بغیر کام پوری تندہی سے جاری رہا۔ شروع شروع کے دنوں کی بات تھی جب سرنگ کا منہ بن گیا تو میرے کمرے والوں کو دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ ہم واپس چھت کے راستے آنے کے لیئے اوپر چڑھ رہے تھے کہ میجر سلیم ملک توازن برقرار نہ رکھ سکا اور چھت کی ایک شیٹ سمیت نیچے آن گرا۔ دھماکے کی آواز پوری بیرک میں گونج گئی لیکن اسکے باوجود کسی سنتری نے آواز دے کر نہیں پوچھا کہ کیا ہوا؟ لیکن ہمارے لیے مسئلہ چھت ٹوٹنے کا تھا اور صبح ہندوستانیوں کے آنے پر ہمارا پول کھل جانا تھا۔ ساری رات کی محنت کے بعد اس حصے کو ایک سفید چادر کے ساتھ ڈھک کر دوبارہ پھٹیاں لگا دی گئیں۔

چونکہ اس کمرے کی کسی بھی چیز کے مشکوک ہونے پر تفصیل سے تلاشی کا خطرہ تھا اس لیئے اگلے دن بیرک کے دوسری طرف آخری کمرے کی چھت سے ایک 5x5 کی ایسبٹاس asbestos شیٹ اکھیڑ کر یہاں فٹ کر دی اور خالی جگہ پر چادر لگا کر اس پر چونا کر دیا۔ اس کمرے کا اوپر سے کسی اور کمرے کی چھت سے رابطہ نہیں تھا اس لیئے اگر کسی کو شک پڑتا بھی تو اس قدر کہ کوئی افسر کپڑے چھپانے کی غرض سے اوپر چڑھا ہو گا جس کی وجہ سے شیٹ ٹوٹ گئی ہو گی۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا تھا کہ اس کمرے میں سرنگ ڈھونڈنے کے لیئے مکمل تلاشی لی جاتی۔

مٹی جو زیادہ تر گارے کی صورت میں تھی چھت کے کناروں پر اس طرح

لگانی شروع کی کہ پہلی نظر میں دیکھنے پر کم روشنی کی وجہ سے یوں محسوس ہو جیسے سیمنٹ کا موٹا موٹا پلستر کیا گیا ہے۔ چونکہ asbestos کی شیٹیں جو نیچے سے لکڑی کی پتلی پتلی لکڑیوں سے فٹ کی گئی تھیں مٹی کا وزن سہار نہیں سکتیں تھیں اس لیئے ہم لنگر سے لکڑیاں چرا چرا کر مٹی کے نیچے رکھتے رہے۔ لنگر سے لکڑیاں چرانا ایک ایسا کٹھن مرحلہ تھا کہ اگر ذرا بھی احتیاط نہ برتی جاتی تو راز افشا ہونے کا ڈر تھا۔ لنگر کے عین سامنے ٹاور پر کھڑے سنتری کی نظروں سے بچا کر لانے کے علاوہ اپنے لانگریوں، اردلیوں اور باقی افسروں کی تیز نگاہوں سے بھی دور رکھنا پڑتا تھا۔ لنگر سے لکڑیوں کو بکسوں وغیرہ کے نیچے رکھنے کے بہانے دن کے وقت لا کر رات کو یا تو سرنگ کی شٹرنگ کے لیئے یا چھت پر مٹی کے نیچے رکھنے کے کام میں لاتے۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہ کام میرے 2IC (سیکنڈ ان کمانڈ) کیپٹن شجاعت کی ان تھک محنت اور ہوشمندی کے بغیر ممکن ہوتا۔ وہی ہر شفٹ کے دورانیہ کے بعد دروازہ بند کرتا اور چھت کی شیٹ کے گرد تختیاں لگاتا۔

سردیوں کی لمبی راتوں اور مسلسل کوشش اور محنت کے باوجود روزانہ مٹی کے بمشکل چالیس، پینتالیس تھیلے نکلتے اور اس سے سرنگ صرف دو اڑھائی فٹ آگے رینگتی۔ راستے میں چونکہ سرنگ اوپر سے کھود کر کچی مٹی سے بھر دی گئی تھی اور ان جگہوں پر اس کے دھنسنے کا خطرہ تھا اس لیئے کافی وقت اور محنت اس کے نیچے لکڑی کی پلیاں بنانے میں صرف ہوگئی۔ روشنی کے لیئے تاروں کا بندوبست سرنگ کی رفتار کے ساتھ ساتھ ہوتا رہا۔ اس مقصد کے لیے کمروں میں لگائی گئی فالتو اور غیر ضروری تاریں اُدھیڑ لی گئیں۔ کیمپ میں آئی ہوئی قوال پارٹی کے سپیکر سے تاریں چرائی گئیں یا پھر اپنے دیرینہ محسن صوبیدار ڈونگر سنگھ سے بھی کسی نہ کسی بہانے تار منگوائی گئی۔ لیکن یہ سوچ کر کہ اگر سرنگ پکڑی گئی تو اس پر حرف نہ آئے اس کے استعمال کو ملتوی کیے

رکھا۔

میں حیران ہوں کہ دشمن کی فوج میں ہوتے ہوئے بھی وہ اپنوں سے زیادہ مہربان تھا۔ اس کے باوجود میں نے اس سے کبھی اپنے ذاتی استعمال کے لیے کوئی چیز نہیں منگوائی۔ بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ اسے بآسانی مسلمان بنایا جا سکتا ہے (ہمارے پاکستان آنے کے بعد اس نے کسی افسر کو لکھا تھا کہ اس نے اسلام قبول کرلیا ہے)۔ لیکن میں نے اس کے ساتھ اس موضوع پر کبھی بات نہیں کی۔ ڈونگر کے چہرے پر ہر کسی کے لیے مسکراہٹ ہوتی تھی۔ صبح صبح ہر ایک کمرے میں جا کر سب کا حال پوچھتا۔ اسکا کمروں میں جانے کا مقصد یہ بھی تو ہوسکتا تھا کہ کچھ غیر ضروری کاروائی تو نہیں ہو رہی۔ میجر عبدالحق مرزا سے کیمپ کے ایڈم افسر ہونے کی وجہ سے اس کی گاڑھی چھنتی تھی۔ کبھی کبھی تو وہ اس کے بے وقت کمرے میں آکر بیٹھ جانے سے سخت تنگ پڑتے تھے۔ سرنگ میں روشنی کے لئیے تاروں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے جوڑ کر اوپر کپڑے کے ٹکڑے لپیٹ دیئے گئے تھے تاکہ بجلی کے جھٹکوں سے بچ سکیں۔ لیکن سرنگ میں نمی سے وہ جلد گیلے ہو جانے کی وجہ سے خطرے کا باعث بن جاتے تھے۔ ایک رات مجھے اطلاع ملی کہ انجینئرز کا کیپٹن ناصر بجلی کا جھٹکا لگنے سے بے ہوش ہوگیا ہے۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ وہ بہت جلد ہوش میں آ گیا۔

ہماری دن رات کی محنت سے کوئی ڈیڑھ دو مہینے میں سرنگ کافی آگے تک پہنچ گئی لیکن بدقسمتی سے اس جگہ کے اوپر کوئی نالی تھی جس کی وجہ سے پانی رس رس کر سرنگ میں آنے لگا۔ کوشش کے باوجود جب پانی بند نہ ہوسکا اور پرانے افسر بھی یہ فیصلہ نہ کر پائے کہ پہلی سرنگ یہیں ختم ہو جاتی ہے یا یہاں سے کچھ اور آگے تک کھودی گئی تھی تو مجبوراً بیس، پچیس فٹ کھودے ہوئے حصے کو چھوڑ کر سرنگ کا رخ موڑنا پڑا۔ چونکہ سمت کا تعین کرنا مشکل تھا اس لیئے ریڈیو کے سپیکر کے مقناطیس کے ساتھ

سوئی رگڑ کر کمپاس بنا لیا گیا تھا۔ لیکن پھر بھی ہر شفٹ میں کام کرنے والوں کا خیال ہوتا تھا کہ سرنگ کا رخ صحیح نہیں اس لیئے وہ اپنے طور پر اس کی سمت تبدیل کرتے رہتے تھے جس کی وجہ سے سرنگ کی شکل ایک بل کھائے ہوئے سانپ کی طرح ہوگئی تھی۔ جس جگہ سے سرنگ کا رخ موڑا گیا اس جگہ کا نام چاندنی چوک رکھ دیا گیا۔ اس جگہ کے عین اوپر ہوا کے لیے ایک کیف نما سوراخ بنا دیا گیا تھا۔ سرنگ میں ایک آدھ گھنٹے کام کرنے کے بعد سخت گھٹن محسوس ہوتی تھی اور کاربن ڈائی آکسائڈ اور مونو آکسائڈ کی زیادتی کی وجہ سے ایسا لگتا تھا جیسے ہم کسی کوئلے کی کان کے اندر کام کر رہے ہوں۔ تازہ ہوا کے لیئے چوہوں کے بل ہمارے بہت کام آئے۔ یہ جان کر حیرت ہوئی کہ وہ رہنے کے لیئے آٹھ، نو فٹ کی گہرائی تک بل بناتے ہیں۔

چونکہ فاصلہ آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا اس لیئے مٹی کو پیچھے لے جانے کے لیئے مختلف ترکیبیں آزمائی گئیں۔ فروٹ (جی ہاں فروٹ) کے خالی ڈبوں میں سیمنٹ (چونکہ کیمپ کے اندر چھوٹی موٹی کچھ نہ کچھ تعمیر ہوتی رہتی تھی اس لیئے سیمنٹ، چونا وغیرہ آسانی سے مل جاتا تھا) بھر کر ٹرالی کے لیئے پہیے بنائے گئے۔ لیکن ہر طرح کی نئی نئی ترکیبوں کے باوجود مٹی کے پیچھے لانے میں آخر تک دشواری رہی۔ اس کی بڑی وجہ سرنگ کے فرش پر سخت مٹی کی جگہ کیچڑ کی تہہ کا ہونا تھا جس میں پہیے دھنس جاتے تھے۔ کئی مرتبہ اس دشواری کو ختم کرنے کے لیئے فرش کو کھرچا گیا لیکن کچھ عرصے بعد پھر وہی حالت ہو جاتی تھی۔ جب یہ بات ممکن نہ رہی کہ لمبی رسی کے ساتھ ایک سرے سے ٹرالی کو کھینچا جائے تو سرنگ کے منہ کے پاس کنویں سے پانی نکالنے کی طرح کی چرخی لگا دی گئی۔ یہ چرخی ایک کیمپ اسٹول سے بنائی گئی تھی۔ لیکن جب کچھ عرصے بعد یہ طریقہ بھی زیادہ کارآمد نہ رہا تو تانگے کے گھوڑے کی طرح ٹرالی کے آگے ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل افسر خود مٹی ایک سرے سے دوسرے سرے تک لے

جانے لگے۔ یہی طریقہ سب سے زیادہ کارآمد رہا اور آخر تک استعمال ہوتا رہا۔

یہ جاننے کے لیئے کہ سرنگ تاروں کی باڑ کے باہر کہاں تک پہنچی ہے سرنگ کے آخری سرے پر چھت کے اندر ایک سوراخ نکال کر نیچے سے سگرٹ کا ہلکا سا دھواں چھوڑا گیا جسے دیکھنے کے لیئے میں خود باہر کھڑا رہا۔ دھویں کا ایک چھوٹا سا حلقہ باڑ سے صرف نو دس فٹ آگے نمودار ہوا۔ گو یہ جان کر خوشی تو ہوئی کہ کم از کم سرنگ کیمپ سے باہر تک پہنچ گئی ہے لیکن کامیابی کے ساتھ نکلنے کے لیئے ابھی مزید ساٹھ ستر فٹ کھدائی کرنی تھی۔ برسات کی متوقع آمد کے پیش نظر کام کی رفتار کو بڑھانے کی تگ ودو شروع کر دی گئی۔

وہ دروازہ جہاں سے سرنگ کا آغاز کیا گیا تھا۔ (دروازے کے دائیں اوپر لمبا پیچ اور نیچے چھٹی کے ساتھ دو کٹے ہوئے پیچ دکھائے گئے ہیں۔ دروازہ بند کرنے کے لیئے صرف لمبے پیچ کو چوکاٹ کے ساتھ کسا جاتا تھا)

کیا راز افشاء ہو جائے گا؟

مئی کی شاید 15 تاریخ تھی کہ ایک ایسا واقع پیش آیا جس سے پورے منصوبے پر پانی پھر سکتا تھا۔ ہوا یوں کہ چھت پر کام کرنے والی پارٹی نے اطلاع دی کی ایک جگہ فالس سیلنگ false ceiling کچھ اکھڑ گئی ہے۔ چونکہ دن کے وقت میں سرنگ میں زیادہ دیر تک کام کرتا رہا تھا اور بے حد تھک گیا تھا اس لیئے چھت کا جائزہ اگلے دن تک ملتوی کر دیا۔ دوسرے دن میں اور میجر غلام رسول ساھی اوپر چڑھ کر اس جگہ کو دیکھ رہے تھے کہ اچانک کمرے کی سیلنگ میں حرکت اور پھر گھڑ گھڑاہٹ ہوئی اور آدھی چھت لکڑیوں اور منوں مٹی سمیت نیچے آ گئی لیکن جس حصے پر ہم کھڑے تھے وہ محفوظ رہا۔ ایک افسر جو اس کمرے کے باہر برآمدے میں سویا ہوا تھا گبھراہٹ میں اٹھا اور ایک دلدوز چیخ ماری جو پورے علاقے میں گونج گئی۔ وہ تو اسکی قسمت اچھی تھی کہ کمرے سے باہر تھا ورنہ وہ میجر مرتضیٰ اور کیپٹن بٹ یقیناً بری طرح زخمی ہو جاتے۔ چیخ اتنی اونچی اور دھماکہ اتنے زور سے ہوا کہ کیمپ کے تمام افسر جاگ اُٹھے۔ سنتریوں نے زور زور سے سیٹیاں بجانی شروع کر دیں اور ہم سے پوچھا کہ کیا ہوا؟ ہم میں سے کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ نیچے اتر کر میں نے فوراً کام بند کروا دیا اور سب کو جمع کر کے یہ تجاویز پیش کیں۔

(1) صبح تک چھت کی کسی طریقے سے مرمت کر لی جائے اور مٹی سرنگ کے اندر پھینک دی جائے۔ ہندوستانیوں کو دھوکہ دینے کے لیئے آخری کمرے کی ایک دو sheets گرا کر یہ تاثر دیا جائے کہ آواز وہاں سے آئی تھی۔

(2) تازہ مٹی دوبارہ سرنگ کے اندر ڈال دی جائے اور ہندوستانیوں سے کہا جائے کہ دھیمک لگ جانے کی وجہ سے چھت گر گئی ہے اور باقیماندہ خشک مٹی کے بارے میں یہ کہا جائے کہ وہ اس وقت کی ہے جب پہلی سرنگ کھودی گئی تھی۔

(3) تیسری صورت میں، چونک اب سرنگ تاروں سے کافی باہر جا چکی ہے اس لیئے اسی وقت اسکا منہ کھول کر جتنے بھی افسر نکل سکتے ہیں نکل جائیں۔

کیپٹن قدیر اور ایاز نے آخری تجویز کی مخالفت اس بنا پر کی کہ چونکہ بعض لوگوں کے کیمپ میں دوست ہیں اس لیئے جب تک ان کو ساتھ نہ لیا جائے کسی کو بھی جانے نہ دیا جائے۔لیکن یہ بات سب پر عیاں تھی کہ سرنگ کا منہ عین سنتریوں کے سامنے ہونے کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ پانچ، چھ افسر ہی نکل سکتے ہیں اور ان میں سے بھی کچھ گولیوں کا نشانہ بن سکتے ہیں۔اس لیئے سارے کیمپ کو مدعو کرنے کی کوئی تک نہیں تھی۔ میں آخری تجویز کے حق میں تھا اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ سوائے کسی کرشمے کے ایسی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی جس کے پیش نظر سرنگ کو ہندوستانیوں کی نظروں سے بچایا جا سکے۔اس لیئے میں نے کہا کہ اگر اسے ہم نے ابھی استعمال نہ کیا تو دوبارفرار کا موقع ملنا مشکل ہوگا۔لیکن کچھ افسر ایسے بھی تھے جو ہمارے ساتھ کام میں تو شریک رہے لیکن فرار کا شروع سے ہی ان کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ یہی لوگ اب سخت مخالفت کر رہے تھے۔

بہرحال میں نے انہیں کہا کہ یہ کوئی حتمی بات نہیں آپ سب مل کر جو بھی فیصلہ کریں گے اسی پر عمل ہوگا۔اچانک وہی چیخ مارنے والا افسر مجمع میں سے نکل کر

گیٹ کی طرف بھاگ پڑا اور زور زور سے کہنے لگا کہ چھت گر گئی ہے۔ ایک دو افسروں نے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن وہ کرنل رضا کے کمرے کی طرف نکل گیا۔ اس شور اور ہنگامے کی وجہ سے ساتھ کی بیرک کے افسر بھی یہ پوچھنے کے لیئے آنے لگے کہ کیا ماجرا ہے (رات کو دروازے مقفل کرنے کا عمل کچھ عرصہ پہلے ختم کر دیا گیا تھا)۔ بڑی مشکل سے انہیں واپس بھیجا لیکن کیپٹن منظر اس افسر کی باتوں اور ہمارے چہروں کے تاثرات سے سمجھ گیا کہ سرنگ کھودی جا رہی ہے۔ اس نے میرے پاس آ کر کہا کہ اگر سرنگ کھودنی تھی تو ایسے لوگوں کو آپ نے اپنے ساتھ کیوں شامل کیا۔ یہ سوچ کر کہ اسے شک پڑ گیا ہے میں نے اس سے پوچھا کہ اس نے کیا کچھ سنا ہے تا کہ ایسا نہ ہو کہ وہ کیمپ کے باقی افسروں کو بھی بتا دے۔ اُسے یقین دلایا کہ فی الحال ارادہ ہی کر رہے تھے اس لیئے وہ اس بات کو صیغہ ءراز ہی میں رکھے۔

ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد کیمپ کمانڈنٹ کرنل موہن سنگھ کچھ سپاہیوں کے ساتھ پہنچ گیا اور اس نے سب افسروں کو باہر لان میں فالن کیا اور اس واقع کے بارے میں پوچھ گچھ کی۔ ہم نے اسے بتایا کہ پچھلے سال کی سرنگ کی مٹی کے نیچے رکھی ہوئی لکڑیوں کو دیمک کھا گئی ہے اور زیادہ بوجھ کی وجہ سے چھت گر گئی ہے۔ کمرے میں اندھیرا تھا اس لیئے انہیں گیلی مٹی نظر نہیں آئی۔ اس کے باوجود موہن سنگھ نے کہا کہ ضرور چھت پر کوئی کام کر رہا ہوگا جس کی وجہ سے وہ گر گئی ہے۔ لیکن ہماری خوش قسمتی تھی کہ ان کے جاسوس نے انہیں پہلے سے سرنگ کے بارے میں اطلاع نہیں دی تھی اور نہ ہی کوئی افسر اوپر سے گرنے کی وجہ سے زخمی ہوا تھا اس لیئے ہماری بات کا اسے کچھ کچھ یقین آ گیا۔

دوسرے دن کیمپ کمانڈنٹ اور کئی دوسرے افسر آئے لیکن ہمارا بہانہ کام

آ گیا۔ گیلی مٹی ہم نے راتوں رات تمام چھت کے اوپر تقریباً آدھی انچ خشک مٹی کی تہہ میں ڈھانپ دی تھی۔ سفید کپڑوں میں ملبوس خفیہ یونٹ کا ایک گروپ آیا اور کیمپ کا کونہ کونہ چھان مارا لیکن انہیں سرنگ کا کوئی سرا ہاتھ نہ آیا۔ ایک آدمی کو چھت پر بھی چڑھایا گیا جس نے مٹی کے پاس جائے بغیر دور سے ہی کہہ دیا کہ ہر طرف مٹی ہی مٹی پڑی ہوئی ہے۔ غالباً اسے اندیشہ تھا کہ کہیں باقی چھت بھی ٹوٹ کر نیچے نہ گر جائے اس لیے فوراً ہی سیڑھی سے نیچے اتر آیا۔ اب کیمپ کمانڈنٹ کو فکر تھی کہ اگر کسی سینئر کمانڈر کو پتہ لگ گیا کہ پچھلے سال کی سرنگ کی مٹی ابھی تک اوپر ہی ہے تو یہ اس کے لیئے خوش آئند بات نہ ہوگی۔ اس لیئے اس نے ہمیں حکم دیا کہ تمام مٹی فوراً نیچے اتار دی جائے۔

کیمپ کا پاکستانی ایڈمن آفیسر میجر عبدالحق مرزا ہماری ہی بیرک سے تھا اس لیئے ہم نے صرف ان چار جوانوں میں سے دو کو مٹی اتارنے کے کام کے لیئے اوپر جانے کی اجازت دی جن کو سرنگ کے بارے میں پہلے سے علم تھا۔ نیچے کام کے لیئے بھی اپنے کمرے میں کام کرنے والے سپاہی شفیق اور ایک دوسرے جوان کو لگایا۔ ان پر ہمیں پورا بھروسہ تھا کہ اگر انہیں سرنگ کے بارے میں پتہ لگ بھی گیا تو وہ ضرور پہلے ہم سے بات کریں گے۔ اس غرض سے کہ لوگوں کو شک نہ پڑے میں نے مٹی اتروانے کے کام میں بہت کم دلچسپی کا اظہار کیا۔

بہت سی جگہوں پر ابھی مٹی خشک نہیں ہوئی تھی اس لیے یہ بہانہ بنایا گیا کہ کیچڑ سوکھ کر اتنا سخت ہوگیا ہے کہ جب تک اسے پانی سے گیلا نہ کر لیا جائے اس کا کھرچنا مشکل ہوگا۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ نہ تو نیچے کام کرنے والوں اور نہ ہی بار بار آ کر دیکھنے والے کیمپ کے باقی افسروں اور ہندوستانیوں کو شک پڑا کہ مٹی تازی کھدی ہوئی ہے۔ ویسے دن کے وقت مکمل خشک مٹی ہی اتاری جاتی تھی۔ شام کو مٹی

باہر کم پھینکی جاتی اور اوپر سے مٹی اتارنے کا کام برابر جاری رہتا۔ اور اس طرح کمرے میں ایک انبار لگ جاتا جسے صبح سویرے باہر پھینک دیا جاتا۔ احتیاط کے طور پر سرنگ کے اندر کام بند کر دیا گیا تا کہ ہندوستانی چھاپے کی صورت میں، جو کسی بھی وقت متوقع تھا راز افشا نہ ہو جائے۔ البتہ سرنگ کے منہ کے پاس ہی ایک نئی سمت میں سرنگ کھودنی شروع کر دی گئی۔ اس میں سے نکلی ہوئی مٹی دریوں پر بچھا کر پنکھے کے نیچے رکھ دی جاتی تا کہ اس کا گیلا پن کچھ کم ہو سکے۔ ابھی اندھیرا ہی ہوتا تو زیادہ گیلی مٹی ہمارے دو سپاہی شریف اور سرور اٹھا کر باہر پھینک دیتے اور اس کے اوپر دو چار بالٹیاں خشک مٹی کی ڈال دیتے۔ چھوٹی سرنگ کا مقصد یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ مٹی باہر پھینکی جا سکے اور اس سرنگ سے حاصل شدہ خشک مٹی اس گیلی مٹی کو چھپایا جا سکے۔ دوسرا مقصد یہ بھی تھا کہ بعد میں بڑی سرنگ کی مٹی کی کھپت کے لیئے کوئی موزوں جگہ مل سکے کیونکہ اب ایسی کوئی جگہ نہیں تھی جہاں مٹی ڈالی جا سکے۔ صرف ایک آدمی سرنگ کے منہ کے قریب ہی اندر کام کر رہا ہوتا تھا اس لیئے چھاپے کی صورت میں فوراً کام بند کیا جا سکتا تھا۔ چھت سے مٹی اتر جانے کے بعد کافی دنوں تک پورے طور پر کام نہ ہو سکا کیوں کہ ہمیں ابھی تک یقین نہیں تھا کہ ہندوستانی اتنی آسانی سے ہمارے دھوکے میں آ گئے ہوں گے۔ ہمارا خیال تھا کہ ضرور ہندوستانی ٹاوروں کے اوپر سے اور دیواروں کے ساتھ رات کو آ کر ہماری حرکات وسکنات کا جائزہ لیتے رہتے ہونگے۔

مون سون کی آمد اور کام میں تعطل

رانچی میں برسات مئی کے مہینے میں ہی شروع ہو جاتی ہے اور اس لحاظ سے ہمارے پاس دس بارہ دن ہی رہ گئے تھے۔ ان تھوڑے سے دنوں میں کامیابی کے ساتھ نکلنے کے لیے کم از کم ساٹھ، ستر فٹ آگے جانا تھا۔ کام دوبارہ شروع ہو گیا اور ساتھ ساتھ احتیاط بھی زیادہ برتی گئی۔ چھت گرنے کا جو دوسرا نقصان ہوا وہ یہ کہ کچھ ایسے لوگوں کو بھی اس بات کی بھنک پڑ گئی جن کی وجہ سے ہمیں پہلے ہی راز افشا ہونے کا خطرہ تھا کیونکہ وہ مسلسل اس کھوج میں رہنے لگے کہ کسی طور انہیں سرنگ کے بارے میں پتہ لگ جائے۔

کچھ نوجوان افسروں نے پچھلی سرنگ میں کام کیا تھا لیکن اس کی پاداش میں باقی لوگوں کی طرح انہیں آگرہ نہیں بھیجا گیا تھا۔ شاید ان کے نام سرنگ میں کام کرنیوالوں نے ہندوستانیوں کو ان کی کم سروس کی وجہ سے نہیں بتائے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ چھت کے اوپر جتنی مٹی ڈالی گئی تھی وہ اتار لی گئی تھی اور مٹی کا وزن سہارنے کے لیئے اس کے نیچے لکڑیاں بھی نہیں رکھی گئی تھیں۔ ان میں آفتاب لودھی، عارف، لیاقت اور عماد پیش پیش تھے۔ وہ بار بار آ کر مجھ سے پوچھتے اور میں ان سے کہہ دیتا کہ مجھے کچھ علم نہیں اور اگر انہیں شک ہے تو اس کمرے والوں سے پوچھیں

جن کی چھت گری ہے۔

اس افسر نے جس نے ابھی تک راز داری کا حلف نہیں اٹھایا تھا زور شور سے اپنی یونٹ 26 ایف ایف کے افسروں کو منصوبے میں شامل کرنے کی مہم شروع کر دی۔ مجھ سے بحث میں اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر ہم انہیں مطلع نہیں کریں گے تو وہ خود بتا دے گا۔ عجیب بے بسی کا عالم تھا۔ اس کی کمینگی دیکھ کر پہلی بار یوں محسوس ہوا کہ مجھ میں اب ہمت نہیں کہ اپنے آپ کو مزید کنٹرول کرسکوں۔ اگر زندگی میں کسی کو جان سے مار ڈالنے کا خیال آیا تو وہ یہی افسر تھا۔ قید سے پہلے کا روائتی مسلمان اور صوم و صلٰوات کے پابند آدمی سے ایسی بات کی توقع نہیں ہو سکتی تھی۔ کھدائی میں اس نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اور اب جبکہ فرار کا وقت قریب آیا تو اس کی تمام تر کوشش تھی کہ منصوبہ ناکام ہو جائے۔ بہرحال ان لوگوں کو چپ کرانے کے لیے عماد، لیاقت، عارف، لودھی اور کیپٹن منظر کو متفقہ رائے سے منصوبے میں شامل کر لیا گیا۔ اس کے بعد بھی تعداد آہستہ آہستہ بڑھتی رہی۔ ان میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو قابلِ اعتماد تھے اور کھدائی میں مدد دے سکتے تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جنہیں کچھ لوگوں نے قسم کھانے کے باوجود منصوبے کے بارے میں بتا دیا تھا۔ شاید انہیں یہ خدشہ تھا کہ بعد میں وہ ان سے ناراض نہ ہو جائیں۔ اب ہندوستانی ہماری ہر حرکت شک کی نگاہوں سے دیکھتے تھے اور چیکنگ بھی اب پہلے سے سخت اور کم وقفوں سے کی جاتی تھی۔

سرنگ کی کھوج کے لئے باقاعدہ چھاپہ

آخری کمرے کے میجر اجمل اپنی پارٹی سمیت دن کی شفٹ میں کام کر رہے تھے کہ ہندوستانیوں کا چھاپہ کچھ اتنی سرعت سے پڑا کہ ہم بچاؤ کی کوئی ترکیب نہ اپنا سکے۔ اس میں کچھ سستی میری بھی تھی کہ باہر نگاہ رکھنے کے لیئے کسی افسر کو متعین نہیں کیا تھا۔ آناً فاناً کیمپ کی تینوں بیرکوں کو ایک ایک ہندوستانی افسر کی زیرِ نگرانی گھیر کر تلاشی لینی شروع کر دی گئی۔ ہماری بیرک کے لیئے متعین کیپٹن کنول سنگھ نے باقی کمروں کی تلاشی لینے کے بعد جب آخری کمرے کا بند دروازہ کھٹکایا تو میں نے اسی وقت بڑی مشکل سے اس کے ساتھ والے کمرے کے بند دروازے سے انہیں پیغام پہنچایا کہ ہندوستانی تلاشی کیلئے باہر پہنچ چکے ہیں۔

ابھی شفٹ میں کام ختم ہونے کا وقت نہیں ہوا تھا اور ایک سو پچاس فٹ تنگ سرنگ میں پیغام پہنچانا اور پھر ان لوگوں کا فوراً باہر نکلنا ناممکن نظر آتا تھا۔ کیمپ کے باقی تمام افسروں کو کمروں سے باہر نکال کر کھڑا کر دیا گیا۔ اس بات کا پختہ یقین تھا کہ کسی کی اطلاع پر چھاپہ مارا جا رہا ہے اور اب کوئی صورت بچ نکلنے کی نہیں لگتی تھی کیونکہ سرنگ میں کام کرنے والی پارٹی ابھی تک اس کے اندر ہی تھی۔ اس اضطرابی کیفیت میں منصوبے میں شامل کچھ افسروں نے آپس میں سرگوشیاں شروع

کر دیں جس کی وجہ سے باقی لوگوں کا شک مزید پختہ ہو گیا کہ ضرور کوئی معاملہ ہے جو اس بیرک کے افسر اس قدر بے چین ہیں۔ بڑی مشکل سے سب کو صورتِ حال کا احساس دلایا کہ اس وقت اس بے چینی کا اظہار ہم سب کے لیئے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔شاید میرا اپنا چہرہ بھی مضطرب جذبات کا آئینہ دار تھا۔تھوڑی دیر کے بعد سب افسر باہر پہنچ گئے لیکن آخری کمرے کے افسر ابھی تک نہیں آئے تھے۔ہم شدید ذہنی کشمکش کا شکار تھے کہ نجانے وہاں کیا ہو رہا ہے۔آخر کار وہ لوگ بھی بھاگم بھاگ ہمارے ساتھ آن ملے۔میجر اجمل نے آنکھ کے اشارے سے بتایا کہ فی الحال خیریت ہے۔تقریباً پونے گھنٹے کی تلاش و جستجو کے بعد جب ہندوستانی منہ لٹکائے واپس گئے تو سکھ کا سانس لیا۔

میجر اجمل نے بتایا کہ وہ لوگ مقررہ وقت سے بہت پہلے ہی سرنگ سے باہر آ گئے تھے کیونکہ جب کام کرنے والے کسی افسر سے وقت پوچھا گیا تو اس نے دو بج کر دس منٹ کی بجائے تین بج کر دس منٹ بتایا۔ چونکہ ان کی شفٹ نے تین بجے تک کام کرنا تھا اس لیئے وہ فوراُ باہر نکل آئے۔جب یہ لوگ باہر آ کر سرنگ کا دروازہ بند کر رہے تھے تو اسی وقت ہندوستانیوں نے دروازہ کھٹکایا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ والے کمرے سے پیغام ملا کہ ہندوستانی چیکنگ کے لیئے آ گئے ہیں۔ان سب کے کپڑے کیچڑ سے لت پت تھے اس لیے دو نے تو اسی کمرے کے اور دو نے ساتھ والے کمرے کے غسل خانے میں فوراً نہا کر خشک کپڑے پہن لیے اور گندے کپڑے سرنگ میں پھینک دیئے۔سرنگ کا دروازہ اچھی طرح تو بند نہ ہو سکا پھر بھی اتنا کر دیا گیا کہ ایک نظر میں اس کے بارے میں شک نہ پڑے۔سرنگ کے منہ کے آگے کیچڑ لگ گیا تھا اس لیے اس جگہ کو پانی کا گھڑا توڑ کر صاف کر دیا گیا۔اس ساری کاروائی میں پانچ، چھ منٹ لگ گئے لیکن جب یہ لوگ باہر نکلے

تو کیپٹن کنول سنگھ بجائے ناراض ہونے کے یا شک کرنے کے معذرت خواہ ہوا کہ آپ لوگوں کی نیند میں مخل ہوا ہوں۔ اس کمرے کی ہر چیز باہر نکالی گئی لیکن پھر بھی انہیں سرنگ کا سراغ نہ مل سکا۔ دوسرے دن شام کو کرنل رضا اور کرنل موہن نے میجر مرزا کو بلوا بھیجا۔ انہوں نے واپس آ کر بتایا کہ کل دہلی سے ایک جرنیل اس غرض سے آ رہا ہے کہ آپ لوگ جو دوسری سرنگ کھود رہے ہیں اس کے بارے میں تحقیق کی جائے۔ اس بات سے یہ واضع ہو گیا کہ ہندوستانیوں کو یہ خبر مل چکی ہے کہ سرنگ کھودی جا رہی ہے لیکن جگہ کا تعین نہ ہو سکنے کی وجہ سے ابھی تک تذبذب کا شکار تھے۔ اس کے بعد ایک دو سخت تلاشیوں کے بعد جب مایوسی ہوئی تو انہیں اس بات کا یقین ہو گیا کہ ان کے جاسوسوں نے غلط خبر دی ہے۔ انہیں خبر پہنچانے والا ایک تو ہمارا مسلمان سوپیر ہو سکتا تھا یا 26 ایف ایف کا ایک سپاہی۔ سوپیر نشے کا عادی تھا اور تلاشی کے دوران اس سے کافی مقدار میں کوئی نشہ آور شے برآمد ہوئی تھی۔ یہ سوپیر باہر گیٹ پر متعین سنتریوں کے خیمے کی صفائی بھی کرتا تھا اور کئی مرتبہ ہندوستانیوں کے ساتھ مشکوک انداز میں باتیں کرتے دیکھا گیا تھا۔ اور یہی حال ایف۔ ایف کے سپاہی کا تھا۔ کام پوری تندہی سے دوبارہ شروع کر دیا گیا لیکن بدقسمتی سے ساتھ ہی برسات بھی شروع ہو گئی۔ چوہوں کے بل جو تازہ ہوا کے لئے پہلے کسی نعمت سے کم نہ تھے اب ہمارے منصوبے کی تباہی کا ذریعہ بن گئے۔ دن رات کی مسلسل محنت اور جدوجہد کے باوجود کوئی ترکیب سرنگ میں پانی کو جانے سے روکنے کے لیئے کارگر ثابت نہ ہوئی۔ دو تین دنوں میں سرنگ کا آخری حصہ جو باقی سرنگ کی نسبت زیادہ گہرا تھا پانی سے بھر گیا۔ ایسے تشویشناک حالات میں میں بخار کے باوجود سرنگ کے اندر سوراخ بند کرنے کی غرض سے اکیلا چلا گیا۔ سرنگ کے آخری حصے میں چھت اور پانی کی سطح کے درمیان بمشکل تین چار انچ کا فاصلہ رہ گیا

تھا۔ میں ناک اور منہ کو پانی سے باہر نکالے کافی دیر تک سوراخوں میں کپڑے میں لپٹے لکڑی کے ڈنڈے ٹھونستا رہا۔ ذراسی حرکت سے پانی چھلک جاتا اور غوطہ آ جاتا۔ ڈوب مرنے کی بھی کیا خوب جگہ تھی۔ کھدائی کا ہتھیار سرنگ کے آخری سرے پر رہ گیا تھا۔ اسے نکالنے کے لیئے مجھے پندرہ، بیس فٹ پانی جس کی سطح چھت تک تھی میں سے ہو کر جانا پڑا۔ الٹا تیرتے ہوئے جب میں ہتھیار اٹھا کر واپس مڑا تو حرکت کی وجہ سے چھلک کر پانی چھت تک چلا گیا۔ سانس پھول گیا اور میں بمشکل ہوا تک واپس پہنچا۔ ایک چھوٹے سے ہتھیار کی خاطر جان پر کھیل جانا بھی کیا حماقت تھی۔ برسات اس قدر برسی کہ ہماری تمام کوششیں رائیگاں گئیں اور جب پانی سرنگ کے منہ تک پہنچ گیا تو مجبوراً کام بند کرنا پڑا۔ ہمارے چہرے مایوسیوں کی علامت بنے ہوئے تھے۔ کم از کم چھ مہینے تک پانی خشک ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا اور اس دوران راز کے افشاء ہونے کا ڈر بھی تھا۔

اسپتال سے فرار کا منصوبہ

سرنگ سے ناامید ہو کر میں ایک بار پھر فرار کی دوسری صورتوں کی طرف متوجہ ہوا۔ سنا تھا کی ہسپتال سے بھاگنے کے امکانات زیادہ روشن ہیں۔ میجر جنجوعہ کی ایک بازو جو ریڑھ کی ہڈی کے مہروں میں کسی پیچیدہ مرض کی وجہ سے کمزور ہو گیا تھا اور میری بازو کی ہڈی اسپتال جانے کے معقول بہانے تھے۔ چنانچہ ہسپتال جانے کے لیے کوششیں شروع ہو گئیں۔ کرنل ڈاکٹر ضیاء نے جو ایم آئی روم کا انچارج تھا اور

کسی معاملے میں ہمارا بے حد ممنون تھا ہسپتال تک جانے میں ہماری بڑی مدد کی۔ مجھ سے پہلے جنجوعہ کو کیمپ ہسپتال بھیجا گیا۔ چونکہ بڑی بڑی مونچھوں کی وجہ سے میرے ارادے خطرناک لگ سکتے تھے اور میں پچھلے " گناہوں" کی وجہ سے بھی کافی مشہور تھا اس لیئے سی۔ایم۔ایچ جانے سے پہلے میں نے اپنے چہرے کی صفائی کر ڈالی۔ مورال پر اس کا یہ اثر ہوا کہ کیمپ میں مزدوری کے لیئے آئی ہوئی ایک خوبصورت بہاری لڑکی جس نے بالوں میں چمپا کا پھول اڑسا ہوا تھا میرے قریب سے گزرتے ہوئے مسکراہٹوں کے پھول نچھاور کر گئی۔ ہرجائی! شاید لیکن وہ وقت کہ جب صنف نازک سے بات کیے ہوئے مدت گزر گئی تھی ہمارا اس طرح محظوظ ہونا اپنی دانست میں اتنی معیوب بات نہیں لگی۔ بہرحال شوکت تھانوی مرحوم کے ریلوے عشق کی طرح میرے یہ لطیف جذبات بھی چند ہی لمحوں کے مہمان رہے۔ سِک رپورٹ پر باہر جانے والے افسروں کو کیمپ کمانڈنٹ کے دفتر سے ہوکر جانا پڑتا تھا۔ وہاں ہم تین چار افسروں کو ایک نہایت کمینے کیپٹن ڈھاکہ سے واسطہ پڑا۔ مجھ سے سی ایم ایچ جانے کی وجہ پوچھی تو میں نے اسے بتایا کہ میری بازو کی ہڈی ٹوٹی ہوئی ہے تو پوچھنے لگا کہ کس طرح ٹوٹی ہے۔ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا کہ آپ ہی لوگوں کا کیا دھرا ہے۔ لیکن ایک دم اپنی حماقت کا احساس ہوا کہ اگر اسے پتہ لگ گیا کہ میں نے فرار کی پاداش میں مار کھائی ہے تو وہ مجھے کبھی بھی سی ایم ایچ جانے کی اجازت نہیں دے گا۔ شاید اسے فی الحال میری فرار کی کوششوں کا علم نہیں تھا۔ کہنے لگا کیسے؟ تو میں نے فوراً پینترا بدلا اور کہا کہ ہندوستانی حملے کے پیش نظر جب ہم رات کے وقت ڈھاکہ کی طرف آ رہے تھے تو اچانک ایک نالے میں گر جانے سے بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی جس کا بروقت علاج نہ ہو سکا۔ اسکے جواب میں اس نے جو بات کہی اس کی کاٹ میں نے بری طرح محسوس کی۔ اس نے کہا تھا '' تم بہت تیز بھاگے ہوگے''۔

ہمیں آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر ہسپتال لے جایا گیا۔

رانچی کا یہ ہسپتال ایک نہایت سرسبز علاقے میں تھا اور اس کے لان پھولوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ ہمیں اسپیشلسٹ کے کمرے کے باہر برآمدے میں پٹیاں کھول کر بٹھا دیا گیا۔ ہمارے قریب ہی آرمڈ کور کا ایک کپتان اور اسکی نہایت ہی خوبصورت بیوی بڑے پیار سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ دل میں ہلکی سی ٹیس اٹھی۔ برسات کا موسم تو یوں بھی جذبات کو بھڑکا دیتا ہے۔ اس وقت ہم بہت سی متجسس نگاہوں کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ میرا معائنہ ایک سرجیکل سپیشلسٹ نے کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ کہنی کی ہڈی کے ٹوٹے ہوئے ایک چھوٹے ٹکڑے کو نکالنے کے لیئے سرجری کرنی پڑے گی۔ اس نے بجلی لگانے اور ہسپتال میں داخلے کی سفارش کی۔ یوں محسوس ہوا جیسے امید کا دامن بھرنے والا ہے۔ واپس پہنچ کر مجھے پی او ڈبلیو POW کیمپ ہسپتال میں جو ہمارے کیمپ کے برابر ہی میں تھا بھیج دیا گیا۔ یہاں سے کاغذات کی تکمیل کے بعد سی ایم ایچ جانا تھا۔ میجر ذوالفقار علی جنجوعہ یہاں پہلے سے موجود تھا۔ اپنے ڈاکٹروں خاص کر کیپٹن منیر کی سفارش پر سی ایم ایچ جانے کے لیے اس کا کیس بھی تیار کیا گیا۔ کیمپ میں بہت سے لوگوں کو یقین تھا کہ میں ضرور فرار کے لیئے ہسپتال جا رہا ہوں اس لیئے سب نے الوداع کہا۔ میجر ذوالفقار جونیئر اور کیپٹن منظر کو میرے جانے کا بے حد دکھ تھا۔ ان کے خیال میں انہیں اس طرح چھوڑ کر میں خودغرضی کا ثبوت دے رہا تھا۔

تین چار دن کے بعد مجھے ہسپتال بھیج دیا گیا۔ قیدیوں کی وارڈ ہسپتال کے ایک گوشے میں بنائی گئی تھی اور اس کے چاروں طرف تاروں کی دوہری باڑھ تھی۔ گو چھوٹی سی بیرک کے گرداگرد دو سنتری ہر وقت موجود رہتے تھے لیکن پھر بھی یہاں سے فرار نسبتاً آسان تھا۔ مجھے اپنی فوج کے کچھ جے سی اوز کے ساتھ افسروں

کے لیے مخصوص وارڈ میں ٹھہرایا گیا۔ میرے لیئے کھانا بھی ان کی اپنی افسر وارڈ سے پک کر آتا تھا۔ چونکہ گوشت جھٹکے کا ہونے کا شک تھا اس لیے میں دال سبزی پر ہی اکتفا کرتا رہا۔ ہمارے جوانوں اور جے سی اوز کو بتایا گیا کہ ان کے لیے الگ کھانا تیار ہوتا ہے۔ لیکن کھانا دینے والے اردلی کی اس اطلاع کے باوجود کہ جہاں سے باقی مریضوں کو کھانا ملتا ہے وہیں سے اس بیرک کے لیے بھی آتا ہے یار لوگوں نے گوشت سے جو کیمپ کی نسبت زیادہ ملتا تھا ہاتھ کھینچنا کفرانِ نعمت سمجھا۔ اردلی نے یہ بھی بتایا کہ ان کے اپنے تمام مسلمان سپاہیوں کو بھی یہی گوشت کھانا پڑتا ہے۔ شاید مجبوریوں کے بوجھ تلے دب کر ہندوستانی مسلمانوں کی ذہنیت ہی بدل گئی ہے۔ اب تو وہاں کچھ مسلمانوں نے اپنی بیٹیوں کی شادیاں ہندو لڑکوں سے کھلے بندوں کرنی شروع کر دی ہیں۔ شاید ان کا خیال ہے کی ایک مسلمان جولاہے سے ایک کھاتا پیتا ہندو بہتر ہے اور بیٹیوں کے مستقبل کا بہتر ضامن بھی۔ غریب لوگ البتہ ابھی اس صورتِ حال سے دوچار نہیں ہوئے۔ ہندوستان کے اپنے رسائل کے مطابق مسلمانوں کا یہاں کوئی مستقبل نہیں اور ان کے مستقبل کے سنورنے کا بہترین ذریعہ ان کا ہندو مذہب میں داخل ہو جانا بتایا جاتا ہے۔ انڈیا کے ایک سابق صدر ڈاکٹر ذاکر نے اپنی نواسی کا بیاہ ایک ہندو سے رچا کر اس سمت میں ایک مثال قائم کی تھی۔ ہمارے نوجوانوں کا ایک طبقہ اور کچھ سیاسی رہنما ہندوؤں سے راہ و رسم بڑھانے کے لیئے کس قدر کوشاں اور بیتاب رہتے ہیں۔ یہ سب ہماری نئی نسل پر ٹی وی اور فلموں کے ذریعے ہندو کلچر کی مسلسل یلغار سے ممکن ہوا ہے۔ سیاسی جماعتوں کے کچھ لیڈر گاندھی، نہرو اور اندرا کی ذہنی گرفت سے ابھی تک باہر نہیں نکل سکے تھے۔ انہیں مسلمانوں کے مفادات سے زیادہ ہندوؤں سے اپنے پرانے تعلقات استوار رکھنے میں اور اقتدار حاصل کرنے میں زیادہ دلچسپی تھی۔

اسپتال کی اس وارڈ کا انچارج ایک مسلمان لیفٹینٹ تھا۔رانچی کا ہی باسی تھا۔نہ جانے مجھ سے بات کرنے سے کیوں کتراتا تھا۔کوشش کے باوجود مجھ سے دور دور رہتا تھا۔اس ہسپتال کی میٹرن کیرالہ(Kerala) کی رہنے والی میجر رابعہ تھی۔ہاتھ میں چھتری تھامے وہ میرے ساتھ دیر تک باتیں کرتی رہتی تھی۔تقسیم ہند سے پہلے ہمارے علاقے کے مختلف شہروں کی اس کے ذہن میں بے شمار یادیں تھیں جو وہ دہراتی رہتی تھی۔عمر شاید چالیس، بیالیس سال تھی۔مجھے پڑھنے کے لیئے ایک دو کتابیں لاکر دیں جن میں مشہور کتاب Woman of Rome بھی شامل تھی۔میں نے جب اس سے پوچھا کہ ایسی کتابیں کیوں پڑھتی ہو تو شرمندہ سی ہوگئی۔تین چار دنوں میں میں نے فرار کا منصوبہ مکمل کر لیا لیکن حسبِ وعدہ میجر ذوالفقار جنجوعہ کا انتظار تھا۔چوتھے دن وہ بھی پہنچ گیا لیکن اسی دن ہمارا نیا کیمپ کمانڈنٹ کرنل ھوز وارڈ میں مریضوں کو دیکھنے کے لیئے آیا۔مجھے دیکھتے ہی حیران ہوکر پوچھا کہ تم یہاں کیسے پہنچ گئے ہو۔اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار نمایاں تھے۔خوش قسمتی سے اُسی رات زبردست بارش ہوئی لیکن خلافِ معمول چاروں طرف باوجود بارش کے سخت پہرہ لگا دیا گیا تھا۔ہماری کھڑکی کے عین سامنے تاروں اور بیرک کے درمیان گارڈ کمانڈر خود اسٹین گن کا رخ ہمارے کمرے کی طرف موڑے تمام رات اس تیز بارش میں پہرہ دیتا رہا۔میں اور جنجوعہ باری باری اُٹھ کر موقع کی تلاش میں رہے لیکن پہرے میں کوئی کمی نہ ہوئی۔

غالبًا یہ شدید پہرہ کرنل ھوز کے کہنے پر تھا۔آخر کار تھک ہار کر میں دو بجے کے قریب سو گیا لیکن جنجوعہ کو نیند نہ آئی۔میں جانتا تھا کہ وہ اس بات کے لیے بھی تیار ہے کہ انجام کی پرواہ کیے بغیر تاروں کی دونوں باڑوں کو پھلانگ کر فرار ہونے کی کوشش کرے۔اس طرح اچانک بھاگنے اور سنتریوں کو دھکا دے کر تاریں پھلانگنے

سے شاید کامیابی کے کچھ امکانات تو تھے لیکن جنجوعہ کے بازو بیحد کمزور تھے اور مجھے یقین تھا وہ آسانی سے تاریں پھلانگ نہیں سکے گا اور خواہ مخواہ سنتریوں کی گولیوں کا نشانہ بن جائے گا۔ لیکن اس کی ہمت اور جرأت قابلِ تحسین تھی۔

دوسرے دن بغیر کسی علاج اور وجہ بتائے ہمیں ہسپتال سے واپس بھیج دیا گیا۔ جنجوعہ کو آئے ابھی ایک ہی دن ہوا تھا اور میرا ابھی آپریشن ہونا باقی تھا۔ یقیناً کرنل ھوز کو میرے نامئہ اعمال کا علم تھا۔ یوں کچھ عرصہ ہسپتال میں رہنے کے بعد ہم واپس کیمپ میں آ گئے۔ رفیق کار ہماری واپسی سے خوش تھے چونکہ ان کی خواہش تھی کہ جو منصوبہ بھی بنایا جائے اس میں سب کو شامل ہونا چاہیے۔ لفٹیننٹ قصور اپنے والد کی وفات پر انسانی ہمدردی کے تحت پاکستان جا رہا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ عبدالرحمان کو پیغام بھیجا کہ آئندہ کسی پارسل میں مجھے کچھ پسا ہوا بارود کسی چیز کے اندر چھپا کر بھیج دے۔ سرنگ پر بھی مسلسل نظر تھی۔ بارشوں کی وجہ سے پانی کی سطح جو بہت بلند ہوگئی تھی اب نہایت آہستگی سے نیچے جا رہی تھی۔

شملہ معاہدہ اور سرنگ پر دوبارہ کام کی مخالفت

ایک دن اچانک اس جگہ سے جہاں سے پہلی سرنگ بند کرنے کے لیے گڑھا کھودا گیا تھا مٹی اندر دھنس گئی۔ یہ عین وہ جگہ تھی جہاں اوپر ٹاور پر دو سنتری متعین تھے۔ فوراً گھاس وغیرہ ڈال کر عارضی طور پر اس کو چھپا دیا گیا اور پھر کیاریاں کھودنے کے بہانے اس جگہ کو ہموار کر کے سبزی لگا دی گئی۔ اس طرح وہاں کسی کے چلنے سے

زمین کے دوبارہ دھنس جانے کا خطرہ بھی کم ہوگیا۔اس دوران ہماری واپسی کے لیے شملہ معاہدہ ہوگیا اور بہت سے لوگوں نے فرار کے بارے میں سوچنا بھی چھوڑ دیا۔ ہمارے چند ساتھیوں کے علاوہ باقی سب لوگوں کو اس بات پر آمادہ کرنا بھی مشکل ہوگیا کہ سرنگ کی کھودائی دوبارہ شروع کی جائے۔ بہرحال ہم پانچ چھ افسر پانی کی سطح کم کرنے میں مصروف ہوگئے۔ میں نے قصوراور منظر کی مدد سے پانی نکالنے کے لیے ایک پمپ بنایا تھا جسے ٹیبل فین کے ساتھ جوڑ کر چلانے کی کوشش کی تھی لیکن چونکہ پنکھے کی طاقت کم تھی اس لیے وہ پمپ کو نہ چلا سکا۔ پھر بالٹیوں کے ساتھ نکالنے کی کوشش کی گئی لیکن لوگوں کی تعداد کم تھی اس لیے کوئی خاص کامیابی نہ ہوسکی۔

ایک دن جو سرنگ کا منہ کھولا تو پانی حیرت انگیز طور پر کم ہو چکا تھا۔فوراً اندر جا کر جائزہ لیا لیکن حالات بہت مایوس کن تھے۔ دیواروں پر لگائی گئی مٹی گارا بن کر نیچے آ گئی تھی جہاں سے سرنگ نیچے دھنس گئی تھی وہ جگہ بند تھی اور پُل کی لکڑیاں سڑ گل کر نیچے آ گئی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے ہماری متوقع روانگی سے قبل یہ کام ناممکن ہوگا۔ بڑی تگ ودو کے بعد کچھ مزید ساتھیوں کو کام میں شمولیت کے لیئے رضامند کیا لیکن ان کی بددلی واضع تھی۔ان کا خیال تھا کہ فرار اب پاگل پن ہے۔کئی کیمپ اب آہستہ آہستہ خالی ہورہے تھے اور عنقریب ہمارے کیمپ کا نمبر آنے والا تھا۔سردی اور پانی کے باوجود ہم نے سرنگ کو اس قابل بنا لیا کہ کام پھر سے جاری ہو سکے۔لیکن بدقسمتی سے ہمارے کیمپ سے پہلے گروپ کے جانے کی خبر آ گئی۔اس سے قبل جو لوگ خفیہ طور پر مخالفت کر رہے تھے اب کھل کر سامنے آ گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے کمرے کے افسروں میجر ذوالفقار جنجوعہ، میجر علاالدین، میجر ذوالفقار، میجر سلیم ملک، کیپٹن شجاعت، کیپٹن امیر خان (امام جماعت) کیپٹن منظر، لیفٹینینٹ لودھی، لیفٹینینٹ عارف اور کیپٹن ہدایت کے علاوہ تمام لوگ ہم سے

الگ ہو گئے ۔ ہم سے الگ ہونے والوں کے لیڈر وہ لوگ تھے جو پہلے ہمارے ساتھ تند ہی سے کام کر رہے تھے ۔ ان کا خیال تھا کہ سوائے اپنے آپ کو ہیرو ثابت کرنے اور جنون کے اب بھاگنا بے مقصد ہے کیونکہ اب تو ہم لوگ ویسے بھی وطن جا رہے ہیں ۔ مجھے معلوم تھا ایسے لوگوں کے ساتھ بحث فضول ہے ۔ جن لوگوں کو انتظار تھا کہ یہ منصوبہ فیل ہو جائے تا کہ ان کی عزت بچی رہے وہ فرار کے لیے شاید شروع ہی سے تیار نہیں تھے ۔ یہ تلخ تجربہ تو مجھے بس والے واقعے ہی سے ہو گیا تھا لیکن اب صورتِ حال یہ تھی کہ وہ اس پر مصر تھے کہ ہم لوگ بھی اس کو استعمال نہ کریں ۔ ان کے خیال میں اس سے باقی لوگوں کی پاکستان واپسی پر اثر پڑ سکتا تھا ۔ ایک دو دن بعد یہ تجویز پیش کی گئی کہ اگر استعمال بھی کی جائے تو صرف ان لوگوں کے لیے جنہیں ہماری دانست میں جنگی جرائم کے سلسلے میں روک لیا جانا تھا ۔ اس معاملے پر بحث کے لیے ایک میٹنگ بلائی گئی جس کا اہتمام اپوزیشن گروپ ، جواب اکثریت میں تھا ، نے کیا ۔ چیئر مین کی حیثیت سے پہلے میں نے لوگوں کو بتایا کہ فرار کی تگ و دو اب بھی کیوں ضروری ہے؟ میں نے کہا کہ اس میں شک نہیں کہ واپسی شروع ہو چکی ہے لیکن اس قسم کی مہم جوئی جس میں قید سے فرار اور فرار کی تگ و دو کے بعد مشکلات کے تجربے کا ہمیں پھر موقع نہیں مل سکے گا ۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس قید کی ذلت کا داغ اپنے دل و دماغ سے مٹانے کے لیے ہمارے لیئے یہ قدم اٹھانا نہایت اہم ہے ۔ تیسری بات جو سرنگ کے حق میں میں نے کہی وہ یہ تھی کہ اس سے ہندوستانیوں کے وقار کو شدید دھچکا لگے گا کہ اتنے بہت سے قیدی ان کے حفاظتی اقدامات کے باوجود بھاگ گئے ۔ اس کے علاوہ ہم اپنی فوج کا وقار اور اعتماد بحال کر سکیں گے ۔ پھر سال بھر کی محنت سے بنائی گئی سرنگ کو جواب تقریباً پایہء تکمیل تک پہنچ چکی ہے ، استعمال نہ کرنا سخت بزدلی کی بات ہو گی ۔ اور جب ہمارے جانے

کے بعد ہندوستانیوں کو سرنگ کے بارے میں پتہ لگے گا کہ سرنگ بنا کر بھاگنے کی ہمت نہ ہوئی تو مزید تذلیل ہوگی۔

اس دوران کچھ افسروں نے ہنگامہ کھڑا کرنے کی کوشش کی لیکن ہم میں سے بعض نے انہیں سمجھایا کہ اسے پوری بات کرنے کا موقع دیا جانا چاہیے۔ لیکن میں جانتا تھا کہ یہ میٹنگ بلائی ہی اس لیئے گئی ہے کہ مخالف اپنی طاقت کا مظاہرہ کرسکیں۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ کہا گیا کہ جو سرنگ کے نزدیک گیا اس کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی۔ میں نے بحثیت چیئرمین اپنا استعفیٰ پیش کیا تو میرا ایک دیرینہ محسن کیپٹن ایاز کہنے لگا کہ آپ کو چیئرمین بنایا ہی کس نے تھا؟ بمشکل اپنے جذبات کو قابو میں رکھا۔ لیکن اتنا کہا کہ چونکہ اب میں چیئرمین نہیں رہا اس لیئے ایک فرد کی حیثیت سے فرار میرا ذاتی حق ہے جو مجھ سے کوئی چھین نہیں سکتا نہ ہی سرنگ کے استعمال سے روک سکتا ہے۔ اپوزیشن کے چند لوگوں سمیت بہت سے لوگوں نے کہا کہ اپنا استعفیٰ واپس لے لو لیکن میں اپنے اس فیصلے پر کاربند رہ کر کہ میں سرنگ کو استعمال کروں گا کیسے ان لوگوں کی بات مان لیتا؟ اگر مجھے گلہ تھا تو ان طوطا چشموں پر جن کی وفاداری پر مجھے ناز تھا۔ سگنل کور کے میجر سلیم عنایت نے باوجود مجھ سے کسی اور بات پر ناراضگی کے میری بہت طرفداری کی۔ اب میرے ساتھ صرف آٹھ نو افسر رہ گئے تھے۔ چونکہ باقی سب جن میں شجاعت کے علاوہ سرنگ والے کمرے کے افسر شامل تھے مخالف کیمپ میں تھے اس لیئے سرنگ کی کھدائی کا کام جاری رکھنا مشکل ہوگیا۔ میں گھنٹوں افسروں کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن بے سود۔ سوائے کیپٹن احسن کے جسے اس کے دوست قدیر نے گمراہ کیا تھا کوئی بھی دوبارہ منصوبے میں شامل نہ ہوا۔ ان ہنگاموں کے دوران ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ ہوا یوں کہ مخالفین میں کچھ نے کہا کہ ہم سرنگ کے بارے میں باقی لوگوں کو بتانا چاہتے ہیں تو

میں نے انہیں ان کا حلف یاد دلا کر ایسا کرنے سے باز رکھا۔ دوسرے تیسرے دن لفٹینٹ طارق احمد حسن ، جو ایک مشہور برگیڈئر حسن ، کا بیٹا تھا ایک عجیب حالت میں نظر آیا۔ اسنے سر، مونچھوں ، ابروں سمیت اپنے جسم کے تمام بال سیفٹی سے صاف کر لیئے تھے۔ پوچھنے پر اس نے کہا کہ اس نے کسی سے قسم توڑنے کے بارے میں پوچھا تو اسے بتایا گیا کہ کفارے کے طور پر اسے اپنے جسم کے تمام بال صاف کرنے پڑیں گے۔ شاید اس کے بعد اسے کچھ عقل آ گئی اور اس نے کسی اور کو نہ بتایا۔

افسروں کی اکثریت نے فیصلہ کیا کہ کرنل رضا کو سرنگ کے بارے میں بتا دیا جائے۔ اس فیصلے کا مقصد اس معاملے کو مزید الجھانا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ فرار کی کبھی حمایت نہ کریں گے اور اپنی روائتی سیاست سے تب تک فیصلہ نہ ہونے دیں گے جب تک سب لوگوں کی واپسی نہ ہو جائے۔ لیکن چونکہ فیصلہ اکثریت کا تھا اس لیئے میں نے کرنل رضا کو جب یہ بات بتائی تو وہ بھونچکا رہ گئے۔ ان کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ ایک سال تک اِنہیں اس بات کا پتہ نہ چل سکا حالانکہ ان کا دعویٰ تھا کہ کیمپ میں کوئی بات ان سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ خلافِ توقع انہوں نے بہت داد دی کہ تم نے اتنے عرصے تک اس بات کو صیغہء راز میں رکھا لیکن کہا کہ تم لوگوں نے برے عناصر کو اپنے ساتھ شامل کر لیا ہے جو بدقسمتی سے اکثریت میں ہیں اور گڑ بڑ کا خدشہ ہے۔ بہر حال انہوں نے کہا کہ تم لوگ اپنا کام جاری رکھو۔ ان الفاظ کو اپنے کانوں سے سن کر بھی اپنی سماعت پر یقین نہ آیا۔ میں نے ان کے فیصلے سے سب کو مطلع کر دیا تو دوسرے گروپ کے وہ لوگ جو ان کے خاص الخاص حلقے میں سے تھے فوراً ان کے پاس پہنچے۔ بظاہر وہ بھی مطمئن واپس لوٹے۔ میری ان کے ساتھ ایک دو ملاقاتوں میں ظاہر ہو گیا کہ کرنل رضا ہر ایک کو خوش کرنے کے لیے شاید دوہری پالیسی اِختیار کیے ہوئے ہیں۔ بڑی تگ ودو کے بعد ہم میں سے کافی لوگ

اس بات پر متفق ہو گئے کہ صرف ان لوگوں کو جنہیں شک ہے کہ ان کو جنگی جرائم میں ملوث ہونے کی بنا پر رکھ لیا جائے گا سرنگ کے ذریعے بھاگنے کا موقع دیا جائے ۔اس طرح سرنگ کا کام دوبارہ شروع ہو گیا۔ لیکن کام کرنے والے وہی دس، بارہ دیرینہ ساتھی ہی تھے۔

آخری کوشش

کام زیادہ جوش اور محنت سے جاری ہو گیا اور ساتھ ہی میجر مرتضیٰ کو نیا چیرمین چن لیا گیا۔ وہ دوسرے گروپ کا سرغنہ تھا اور کام کے بارے میں عدم دلچسپی کا اِظہار کر رہا تھا۔اس سے پہلے وہ معمر ہونے کی وجہ سے صرف سنتری ڈیوٹی پر مامور تھا۔ مبینہ طور پر وہ اس بات کی کوشش میں لگا ہوا تھا کہ کسی طرح سرنگ کے سلسلے کو بالکل ختم کر دیا جائے۔ کرنل رضا سے اس کی طویل ملاقاتوں' سڑک پر چلتے چلتے کُھسر پُھسر اور کام کرنے والوں کو ورغلانے اور اپنی اپنی یونٹ کے افسروں پر دباؤ ڈالنے کا سلسلہ جاری رہا۔ایک عجیب تماشہ تھا جو کیمپ کے اندر دیکھنے میں آرہا تھا۔سیکنڈ لیفٹیننٹ لودھی اور سیکنڈ لیفٹیننٹ عارف ان قابلِ ذکر جونیئر افسروں میں سے تھے جنھوں نے اپنی اپنی یونٹوں کے سینئر افسروں کی بے شمار کوششوں اور حربوں کے باوجود ہمارا ساتھ نہ چھوڑا۔ ان بے چاروں کو باری باری تمام افسر لیے لیے پھرتے رہے کہ کسی طور ہم سے الگ ہو جائیں لیکن پھر بھی ان پر کوئی اثر نہ ہوا حالانکہ جنگ سے قبل ان کی سروس صرف دو یا تین مہینوں کی تھی بلکہ بعض تو

پی۔ایم۔اے کی نامکمل ٹریننگ کے بعد سیدھے مشرقی پاکستان میں موجود یونٹوں میں پوسٹ کر دیئے گئے تھے۔

ایک دو ہفتوں کے اندر اندر ہم نے مزید بیس فٹ سرنگ کھود لی۔ اسطرح اب اس کی کل لمبائی تقریباً ایک سو اسی فٹ ہوگئی تھی۔ ہم بارہ افسروں کے علاوہ کوئی بھی سرنگ کے قریب نہ پھٹکتا تھا لیکن پروگریس معلوم کرنے کے لیئے وہ ہم سے برابر رابطہ رکھے ہوئے تھے۔ نئے چیئرمین نے استعفیٰ دے دیا۔شاید اسے ڈر تھا کہ اگر سرنگ پکڑی گئی تو اس کو ذمہ وار ٹھہرایا جائیگا۔ہم سرنگ میں کام کرنے والے اس بات پر نالاں تھے کہ ہم سے ایک سو پچانوے افسروں کے بارے میں وعدہ لینے کے باوجود باقی لوگ کام کیلئے کیوں نہیں آتے۔ساتھیوں نے باہم مشورے کے بعد مجھے دوبارہ چیئرمین بننے کے لیے کہا۔ ان کا موقف تھا کہ چونکہ باقی لوگ اب منصوبے میں شامل نہیں اس لیے وہ ہم پر کوئی فیصلہ نہیں ٹھونس سکتے۔ مخالفین کو یہ فیصلہ ہمارے خلاف استعمال کرنے کا موقع مل گیا۔ انہیں پہلے سے ہی خدشہ تھا کہ کسی دن یہ لوگ بھاگ جائیں گے۔اب انہوں نے پھر بھرپور تحریک اس بنا پر چلائی کہ مجھے دوبارہ لیڈر کیسے منتخب کر لیا گیا ہے جبکہ وہ بھی ابھی تک اس منصوبے میں شامل ہیں۔انہوں نے الٹی میٹم دے دیا کہ سرنگ پر مزید کام نہیں ہوگا۔اس دفعہ ہم لوگ بھی ڈٹ گئے کہ کام جاری رکھا جائے گا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ یہ مرنے مارنے پر اُتر آئے ہیں تو اپنے طور پر فیصلہ کیا کہ کیمپ کے تمام افسروں کو اس راز میں شامل کر لیا جائے تاکہ ان کی اکثریت اور مضبوط ہو جائے۔

ایک سو پچانوے جنگی قیدیوں میں سے جن لوگوں کے روکے جانے کا امکان تھا انہیں سرنگ سے بھاگنے کیلئے موقع تو فراہم کر رہے تھے لیکن ہمیں شک تھا کہ ہمارے جانے کے بعد ان پر کڑا پہرا ہوگا اور ہوسکتا ہے کہ انہیں تنگ کوٹھڑیوں

میں منتقل کر دیا جائے یا کسی اور کیمپ میں اکٹھا کر دیا جائے۔ ان میں سے بھی چند ہی لوگ ایسے تھے جن کے بارے میں خود ان کے علاوہ کچھ اور لوگوں کا بھی خیال تھا کہ وہ اس بہانے ضرور رکھ لیے جائیں گے۔ ان میں میجر ذولفقار جونیئر، کیپٹن ہدایت، میجر سلیم عنایت اور میجر حفیظ شامل تھے۔

جنوری کے وسط میں اعلان ہوا کہ رانچی سے چند دنوں میں افسروں کی واپسی شروع ہو جائے گی۔ اس اعلان سے تو مخالفت اور بھی شدت اِختیار کر گئی۔ یہاں تک کہ کچھ لوگ 195 جنگی ملزموں میں ممکنہ شامل افسروں کے لیے بھی سرنگ کو صحیح حالت میں چھوڑنے کو تیار نہ تھے اس لیئے عین ممکن تھا کہ کوئی افسر ہندوستانیوں کو مطلع کر دے۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر میں نے فیصلہ کیا کہ سرنگ کے استعمال کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں اپنے جنرل ہیڈکوارٹر GHQ سے رجوع کیا جائے۔ میں نے ایک پیغام بنا کر قرآن مجید کی مدد سے اُسے خفیہ کوڈ میں تبدیل کیا۔ پیغام کا متن کچھ یوں تھا ''کچھ افسر ہمارے سرنگ کے استعمال کرنے میں حائل ہیں۔ تفصیل پیغام رساں سمجھا دیں گے۔ اگر سرنگ استعمال کرنے کی اجازت نہ ہو تو 26 جنوری کی صبح ریڈیو پاکستان سے 26 پارے کی 26 ویں آیت سے تلاوت کلامِ پاک کا آغاز کیا جائے۔ بصورتِ دیگر یہ تصور کر لیا جائے گا کہ اجازت مل گئی ہے'' یہ خفیہ پیغام پہلے گروپ میں جانے والے ایک افسر کی کتاب کی جلد کے اندر بند کر دیا۔ خفیہ کوڈ ایک دوسرے افسر کے حوالے کیا۔ دونوں کو یہ معلوم نہ تھا کہ دوسرا کون سا افسر پیغام لے کر جا رہا ہے۔ پیغام بھیجنے کے بعد میں نے سب کو بتا دیا کہ یہ پیغام پاکستان بھجوایا جا چکا ہے تا کہ حکم وصول ہونے پر کسی کو پس و پیش نہ ہو۔ ہم 26 جنوری کا بے تابی سے انتظار کرتے رہے۔ اس صبح بہت سے لوگ ریڈیو کانوں سے لگائے 26 واں پارہ سامنے کھول کر بیٹھ گئے۔

تلاوت کے شروع ہوتے ہی ہماری اُمیدوں پر پانی پھر گیا۔ اس کا واضع مطلب تھا کہ اجازت نہیں ملی ۔ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ جی ایچ کیو ہمیں اس کام سے کیوں منع کر رہا ہے؟ ہر قیدی کو فرار کا حق حاصل ہے لیکن ہمیں اس حق سے محروم کیا جا رہا تھا۔ چونکہ 195 مبینہ جنگی مجرموں کی صورتحال کچھ مختلف تھی اس لیے فیصلہ کیا گیا کہ ہم دس، بارہ افسران لوگوں کے لیے سرنگ تیار کرتے رہیں گے۔ یہ جانتے تھے کہ مزید تگ و دو بیکار ہے لیکن ہم سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ جس سرنگ کو ایک سال دن رات کی ان تھک محنت سے پایہء تکمیل تک پہنچایا ہے اُسے یونہی چھوڑ دیں۔ لیکن سرنگ والے کمرے کے پانچ میں سے تین افسروں کی مخالفت کی وجہ سے یہ کام ممکن نہ ہوسکا۔ میرے وہاں سے آنے کے بعد اس کا منہ اینٹوں اور گارے سے بھر دیا گیا مبادا ہندوستانیوں کو پتہ چلنے پر ان کی رہائی میں کچھ رکاوٹ نہ پڑ جائے۔

سرنگ کے بارے میں شجاعت کی کتاب سے کچھ اقتباس

سرنگ کی کھدائی کے لیئے تقریبا ایک ماہ تک ہم حالات کا جائزہ لیتے رہے۔ ہمارے کمرے کے ساتھ منسلک ایک چھوٹا سا اسٹور نما کمرہ تھا۔ معلوم ہوا کہ یہاں سے ایک سرنگ کا آغاز ہوا تھا جو اپنوں ہی میں کسی کی مخبری کی وجہ سے کامیاب نہ ہوسکی تھی۔ یہ بھی خبر ملی کہ اس سرنگ کو ایک دو جگھوں سے بند کر دیا گیا تھا۔ ہم کسی نہ کسی طریقے سے اس سرنگ کا فاہدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ ہمارے کمرے کے اندر

اایک دروازہ تھا جو اسی اسٹور میں کھلتا تھا لیکن اس کو لکڑی کے تختوں اور میخوں کی مدد سے بند کر دیا گیا تھا اور دوسری طرف سے اس خلا کو اینٹوں کی چنائی سے مکمل سیل کر دیا گیا تھا۔ اس دروازے کے آگے میری چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ میجر قادر کے ذہن میں ترکیب آئی کہ کیوں نہ اس دروازے کو کھول کر اس کے پیچھے چنی ہوئی دیوار کو نیچے سے اس طرح تراشا جائے کہ دروازے کی دہلیز سے لیکر اینٹ کی دیوار تک نو انچ کا گیپ مل جائے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ جس سوراخ سے سر گذر جائے وہاں سے جسم بھی گذر سکتا ہے۔ اس کا مشاہدہ میجر قادر نے دو چارپائیوں کے درمیان نو انچ کا فاصلہ چھوڑ کر گذر کے دکھایا۔ تراشتے وقت اس بات کا بھی خیال رکھنا تھا کہ اس کی ساخت میں دوسری طرف سے دیکھنے والے کو کوئی تبدیلی نظر نہ آئے۔ ڈبل اینٹ کی دیوار بنائی گئی ہو تو تقریباً نو انچ کا گیپ حاصل ہو سکتا تھا۔ دوسرا مسئلہ سکیورٹی کا تھا کہ ہم نے ہر صورت میں اس کام کو مخفی رکھنا تھا کیونکہ ہم نہ چاہتے تھے کہ جیسے پہلے مخبری ہوئی تھی اس بار بھی نہ ہو جائے۔ میجر قادر اور میرے کمرے کے مکینوں نے ایک ملاقات کی جس میں میجر قادر کی تجویز کا انکشاف کیا گیا۔ ہم سب نے اس پر لبیک کیا۔ ہم نے عہد کیا کہ اس کام کو پایہء تکمیل تک پہچانے کی ہر ممکن کوشش کی جائیگی اور مکمل ہونے پر اس کیمپ میں مقیم تمام ساتھیوں کو مدعو کریں گے کہ جو کوئی بھی اسے استعمال کرنا چاہے کر سکتا تھا، چاہے بنانے میں اس کا ہاتھ تھا بھی کی نہیں۔ فیصلہ ہوا کہ کام رات کے اندھیرے میں کیا جائیگا۔ یہ بیان کرتا چلوں کہ کیمپ انتظامیہ سورج غروب ہونے پر ہم سب کو اپنے اپنے کمروں میں بند کر کے باہر تالہ لگا دیتی تھی اور صبح سویرے سورج طلوع ہونے پر کھول دیتی تھی۔ اس طریقے سے اپنے ہی کیمپ کا کوئی بندہ ایک دوسرے کمرے میں آ جا نہیں سکتا تھا۔

اسی سٹور کے ساتھ جڑا ہوا ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جسے میڈیکل انسپیکشن

رومM.I.Room بنا دیا گیا تھا۔ ہمارے دو قیدی ڈاکٹر بھائیوں میں سے ایک روزانہ دن میں میں دفتری اوقات کے دوران بیٹھتا اور کیمپ میں مقیم بیمار قیدی بھائیوں کی بیماری کی تشخیص کے بعد دوائی تجویز کرتا۔ نزلہ زکام کھانسی وغیرہ کے لیئے ادویات کیمپ انتظامیہ کی طرف سے مہیا کی جاتی تھیں۔ شکر ہے خدا کا کہ دوران اسیری کسی بیماری سے واسطہ نہیں پڑا۔

میجر قادر کا تعلق کور آف سگنل سے تھا۔ اسپیشل سروس گروپ (ایس۔ایس۔جی) جس کو عام زبان میں کمانڈو کہا جاتا ہے کی ٹریننگ حاصل کی ہوئی تھی۔ وہ ایک ذہین اور دلیر افسر تھے۔ وہ ہر قسم کا تکنیتی کام بخوبی انجام دے سکتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ اس کیمپ میں آنے کے بعد ایک سکھ جنرل نے ہمارے کیمپ کا دورہ کیا۔ ہمیں باقاعدہ فال ان (یعنی تین مساوی قطاروں میں آگے پیچھے کھڑا کرنا) کیا گیا۔ غلطی سے اس نے اپنے سکھ مذہب پر گفتگو شروع کردی۔ وہ تو مجھے یاد نہیں کہ اس نے کیا کچھ کہا لیکن میجر قادر نے سکھ جنرل سے ایک طنزیہ سوال کرتے ہوئے کہا۔ یہ جو آپ لوگوں نے سر پر پگڑی باندھی ہوتی ہے کیا یہ اس لیئے ہے کہ اس سے آپ اللہ سے رابطہ کرسکیں ہے۔ (اس سے فرق تو کوئی نہیں پڑتا لیکن چونکہ شجاعت نے اپنی کتاب تقریبا 55 سال بعد چھپوائی ہے اس لیئے ممکن ہے کہ اسے کچھ باتیں صحیح طور پر یاد نہیں تھیں۔ جیسا کہ پہلے بیان کر چکا ہوں میں نے اس کی کسی بات پر ذرا اونچی آواز میں کہا تھا کہ اس وقت بارہ بج رہے ہونگے)۔ دشمن کی قید میں ہوتے ہوئے اس کی فوج کے جنرل کو یہ بات کہنا دل گردے کا کام ہے۔ بدقسمتی سے میجر قادر جنرل ضیاالحق کا تختہ الٹنے کی سازش کیس میں بے گناہ پکڑے گئے اور ان کو فوج سے جبری ریٹائر کر دیا گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس فوج نے ایک قابل اور ایماندار افسر کو ضائع کر دیا۔ وہ کور آف سگنل میں ایک نہایت تجربہ کار افسر سمجھے

جاتے تھے اس لیئے ان کو ہاتھوں ہاتھ ٹیلی فون ڈیپارٹمنٹ لاہور میں بطور ڈائریکٹر تعینات کر دیا گیا، لاہور کے بعد ان کی تعیناتی اسلام آباد میں اسی محکمے میں کر دی گئی جہاں سے وہ ریٹائر ہوئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد آج کل ضلع چکوال (دراصل راولپنڈی) کے ایک گاؤں میں پرسکون زندگی گذار رہے ہیں۔ (حقائق سے مکمل شناسائی نہ ہونے کی وجہ سے آخری چند فقرے جو شجاعت نے بیان کیئے ہیں ان کی تصیح کرنا ضروری تو نہیں سمجھتا لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ سازش کیس ایک سال چلا جس کے بعد مجھے بری کر دیا گیا اور کچھ عرصے کے بعد فوج میں مزید ترقی کے مواقع نہ ہونے پر مجھے محکمہ ٹیلی فون نے سکانڈمنٹ secondment پر لے لیا اور فوج سے استعفی دینے کے بعد میں نے ٹی۔آئی۔پی میں مستقل بنیادوں پر ملازمت اختیار کر لی اور اس دوران گریڈ 20 میں ترقی کے بعد کچھ عرصہ پی۔ٹی۔سی۔ایل PTCL میں بطور جنرل مینجر کام کرتا رہا۔ 61 سال کی عمر میں ریٹائر ہو کر راولپنڈی کے نزدیک اپنے آبائی گاؤں پنڈ جھاٹلہ میں سکونت اختیار کر رکھی ہے)۔

کام شروع کرنے سے پہلے ہم نے ضروری سمجھا کہ اپنی بیرک میں مقیم تمام افسروں کو شامل کیا جائے۔ بلکہ ہم دونوں کمروں کے مکینوں کا متفقہ فیصلہ تھا کہ ہر ایک سے قرآن پر حلف لیا جائے کہ اس کام کے بارے میں اپنے کسی دوست رشتہ دار یا دشمن کو کسی صورت نہیں بتایا جائیگا۔ یہ ضروری اس لیئے بھی تھا کہ پہلے ہی اسی کیمپ کے کسی افسر نے پہلی سرنگ کا راز ہندوستانی حکام پر فاش کر دیا تھا۔

ہمارے کمرے والوں کو 2 اردلی سپاہی شریف اور سپاہی سرور ملے ہوئے تھے۔ ان کو بھی مہم میں شامل کرنا ضروری سمجھا گیا۔ یہ کک ہاؤس سے ہمارے لیئے کھانا لاتے تھے۔ اس کے علاوہ کک ہاؤس میں بہت سی چیزیں ایسی تھیں جو سرنگ کی کھدائی میں مددگار ثابت ہوسکتی تھیں۔ جیسے اینٹوں کو تراشنے کے لیئے کلہاڑہ اور تنور

سے روٹیاں نکالنے والی سلاخ اور لکڑیاں وغیرہ۔ان کو چرانے کے لیئے شریف اور سرور مددگار ثابت ہو سکتے تھے۔ہماری خوش قسمتی تھی کہ دونوں نہایت محنتی ، وفادار اور ایماندار تھے۔

میرے والی بیرک میں بلوچ رجمنٹ کے کیپٹن الیاس بھی قیام پذیر تھے۔وہ نہایت شریف ،کم گو نمازی پرہیزگار شخص تھے، اپنے ساتھیوں کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کے قائل تھے۔انہوں نے پوری تندہی سے سرنگ کی کھدائی میں حصہ لیا۔نہ صرف حصہ لیا بلکہ سرنگ کھودنے کے عمل میں استعمال میں لائے جانے والے اوزار بھی بنائے،تنور سے روٹیاں نکالنے والی سلاخ کو ایک طرف سے چپٹا کیا جو کھدائی کے عمل میں کام آئی۔کیمپ ایڈمنسٹریشن کی طرف سے وقتاً فوقتاً بیرکوں کی مرمت کرنے کے لیئے آنے والے کارندوں کے سامان سے دروازوں کے قبضے اور پیرے وغیرہ چرانے اور مہارت کے ساتھ ان کے کدال بنالیں۔سرنگ سے مٹی کھودنے اور نکالنے کا کام تیز ہو گیا۔(میجر الیاس نے مع اپنے بیٹے کے تبلیغی جماعت میں شمولیت اختیار کی ہوئی ہے اور رائیونڈ میں خدائی خدمتگار کے طور پر اس جماعت کے ساتھ کام کر رہے ہیں)۔

طے شدہ منصوبے کے تحت میجر قادر کی ٹیم سرنگ بنانے کا کام شروع کرنے کے لیئے اپنے کمرے میں چھت پر جانے کے لئے موجود راستے سے ہوتے ہوئے ہمارے کمرے کی چھت پر اکڑوں چلتے ہوئے آجاتے جہاں سے فالس سیلنگ کی ایسبٹاس کی پوری شیٹ جو فریم میں جڑوی ہوئی تھی ، دیوار کے ساتھ چارپائی لگا کر اتار لیتے اور میجر قادر کی ٹیم چارپائی کی مدد سے کمرے میں آجاتی۔کام ختم ہونے پر فریم کو دوبارہ اپنی جگہ پر لگا دیا جاتا۔سکیورٹی رکھنے کے لیئے کھڑکی میں شیشے کو اس طریقے سے رکھا جاتا کہ کیمپ کے اندر داخل ہونے والے کا پتہ چل سکے۔اس ڈیوٹی پر عمر

رسیدہ افسروں کو تعینات کر دیتے۔

آخر کام شروع ہوا۔ میجر قادر نے بہت محتاط طریقے سے لکڑی کے تختوں کو اکھیڑا جو کہ میخوں کے ساتھ چوکاٹ کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ انہی سوراخوں کو مزید کھلا کیا گیا تاکہ دروازہ بند کرنے پر تختے اپنی صحیح جگہ پر بیٹھ جائیں۔ دروازے کے کنڈے کو کھول کر ایک لمبے پیچ کو کنڈے کے ایک چھوٹے پیچ کی جگہ ڈال کر دروازے کو چوکاٹ کے ساتھ کس دیا تاکہ اگر کوئی کنڈا کھول کر دروازہ کھولنے کی کوشش کرے تو دروازہ کھل نہ سکے اور لکڑی کے تختے اپنی جگہ قائم رہیں، اس کے بعد اینٹوں کو نیچے سے تراشنے کا کام شروع کیا۔

اینٹوں کو تراشنے کا کام مشکل تھا لیکن ہم سب کا ارادہ مضبوط اور کام کرنے کی بے انتہا لگن تھی جس نے ہمیں اس مشکل کام پر مستعدی سے قائم رکھا۔ اینٹوں کے تراشنے کے عمل میں کچھ دن لگے، دیوار ڈبل اینٹ کی تھی اس لیئے دروازے کی دہلیز اور اینٹوں کے درمیان اتنی جگہ بن گئی جتنی ہمیں درکار تھی۔ پھر نیچے جانے کا عمل شروع ہوا۔ نکالی گئی گیلی مٹی کو بالٹیوں میں بھر کر چھت پر بیٹھے ساتھی کو پکڑاتے جو اسے دیواروں کے ساتھ لیپ دیتا۔ جیسا کہ میں اوپر بیان کر چکا ہوں کہ چھت پر لکڑی کے فریم میں ایسبسٹاس کی شیٹیں لگی ہوئی تھیں، ظاہر ہے وہ اتنی زیادہ مٹی کا بوجھ کسی صورت برداشت نہیں کر سکتی تھیں اس لیئے کک ہاؤس سے لکڑیاں بیٹ مین شریف اور سرور چرا کر لے آتے اور انہیں دیوار کے متوازی چھت کے فریم پر جوڑ کر اس طرح رکھتے کہ مٹی کا بوجھ ایسبسٹاس کی شیٹ پر نہ پڑے بلکہ چھت کی لکڑی کے مضبوط فریم برداشت کر لے۔

جوں جوں کام آگے بڑھتا گیا ہماری مزید حوصلہ افزائی ہوتی گئی اور ہم مزید جوش جوش اور جذبے کے ساتھ کام نپٹاتے گئے۔ جب ہم چھ فٹ کی گہرائی تک پہنچے

تو اس جگہ کو اتنا کھلا کیا کہ کام کرنے والا آسانی اور آرام کے ساتھ بیٹھ سکے۔ اس کے بعد سرنگ کا رخ اس طرف کیا جس طرف ہماری اطلاع کے مطابق پہلی سرنگ بنائی گئی تھی تاکہ اس سے ملاپ ہو سکے اور اس سے آگے کام جاری رکھا جائے۔ آخر وہ دن بھی آگیا جب ہم اس میں کامیاب ہو گئے۔ پرانی سرنگ کافی کشادہ تھی لیکن یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ سات فٹ کے بعد اسے بند کر دیا گیا تھا۔ ہمیں مجبوراً سرنگ کو قدرے باہیں طرف کیمپ کی باؤنڈری وال کو مدنظر رکھتے ہوئے موڑنا پڑا۔

اب ضرورت پڑی کہ اس سرنگ میں روشنی کیسے مہیا کی جائے۔ اس کام کے لیئے بجلی کی تار، بلب اور ہولڈر وغیرہ چاہیے تھے۔ کیمپ انتظامیہ نے ہماری تفریح کے لیئے اجازت دی کہ ہم کوئی ورائٹی پروگرام کر سکتے ہیں چنانچہ انہوں نے اسٹیج بنا کر دیا۔ اندھے کو کیا چاہیے دو آنکھیں، موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ورائٹی شو ختم ہونے پر احسن اور میں نے کافی ساری تار، کچھ بلب مع ہولڈرز چرا لیئے اور کمرے میں لا کر سرنگ میں چھپا دیئے۔ میجر قادر جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں ایک تکنیکی ذہن (technical minded) کے مالک تھے انہوں نے پرانی سرنگ کے ملاپ والی جگہ پر بلب لگا دیا اور ہمارے کمرے سے کنکشن دے دیا۔ اس جگہ کا نام چاندنی چوک رکھا گیا، جب ہم کام سے فارغ ہو جاتے تو پوری تار لپیٹ کر اس سرنگ میں پھینک دی جاتی۔ سرنگ میں کام نیکر یا انڈر وئیر پہن کر کرتے، سرنگ میں کام ختم کرنے کے بعد کمرے سے منسلک غسلخانے میں نہاتے، صاف کپڑے پہنتے اور گندے کپڑے سرنگ میں پھینک دیتے۔ کام کرنے کے بعد دروازے کو اصل حالت میں بند کر دیتے۔ کمرے کی صفائی بھی لازمی تھی کیونکہ مٹی کا اگر کوئی نشان بھی باقی رہ جاتا تو شک کی گنجائش پیدا ہو سکتی تھی۔ ہم کام نہایت محتاط طریقے سے کرتے تاکہ غیر ضروری شور پیدا نہ ہو۔ یہاں تک کہ دن کے وقت نیند پوری کرنے کے لیئے

ایک ہی وقت تمام لوگ نہ سوتے تاکہ کسی کو شک نہ گذرے کہ اس کمرے والے رات کو کیا کرتے ہیں جو دن بھر سوتے رہتے ہیں ۔ چنانچہ اپنی نیند کی ضرورت کو دن کے مختلف اوقات میں پورا کرتے ۔

جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے گئے ہمیں مٹی کھودنے اور مٹی کو چھت پر ٹھکانے لگانے کے لیئے مختلف قسم کے ہتھیاروں کی ضرورت پیش آئی ۔مٹی کو کھینچنے کے لیئے لکڑی کی ٹرالی بنائی گئی ۔اس کے لیئے پہیے فروٹ کے ٹین کے خالی ڈبوں میں سیمنٹ بھر کر بنائے گئے ۔کیمپ انتظامیہ کی طرف سے ملے ہوئے تولیوں سے تھیلے بنائے ۔ بھرے ہوئے تھیلے کو ٹرالی پہ رکھا جاتا تو سرنگ کے اس طرف بیٹھا ہوا آدمی کھینچتا لیکن فرش دلدلی ہونے کی وجہ سے یہ طریقہ کارآمد ثابت نہ ہوا۔ہم دل شکستہ نہ ہوئے اور مٹی کھینچنے کا نیا طریقہ ایجاد کرلیا۔ وہ یہ تھا کہ جیسے گھوڑا تانگے کو کھینچتا ہے ویسے ہی ٹرالی کے سامنے کی دائیں اور بائیں اطراف رسیاں کچھ اس طرح باندھیں کہ مٹی کھینچنے والا افسر رسیوں کو اپنے کندھوں کے اوپر سے لاکر ہاتھوں اور گٹنوں کے بل کھنچتا۔ گو اس میں طاقت زیادہ صرف ہوتی اور سرنگ کے اندر آکسیجن کی کمی کی وجہ سے سانس پھول جاتی لیکن پھر بھی یہی طریقہ کارگر ثابت ہوا اور آخر تک استعمال ہوا۔ایک روز کیپٹن ناصر جس کا تعلق انجینیئر کور سے تھا چاندنی چوک پر بیٹھا مٹی کھینچنے میں مصروف تھا کہ اسے بجلی کا جھٹکا لگا اور وہ بیہوش ہو گیا۔ہم سب فکر مند ہو گئے کی خدانخواستہ یہ مرگیا تو پھر کیا ہوگا۔ خدا کا شکر ہے کہ اسے ہوش آگیا اور ہم نے اپنا کام دوبارہ شروع کردیا۔

ہندوستان کے شہر رانچی میں موسم برسات کے دوران کافی بارشیں ہوتی ہیں ۔ بارشوں کی وجہ سے زمین میں موجود پانی کی سطح اوپر آجاتی ہے ۔1973 کے موسم برسات میں بہت بارشیں ہوئیں اور نتیجا تا سرنگ پانی سے بھرگئی اور کام کو روکنا

پڑا۔ بارشوں کا موسم ختم ہوا۔ ہمارے پاس چائے پینے کے لیئے ایلومونیم کے مگ تھے ان سے بالٹیاں بھر بھر کر غسل خانے میں پھینکتے اور اس طرح سرنگ کو خالی کیا۔ اس عمل میں تین سے چار ماہ لگ گئے۔ اسی جوش اور جذبے کے ساتھ ہم نے کام دوبارہ شروع کیا۔ جیسے جیسے ہمارے کیمپ میں دوسری بیرکوں کے افسروں کو سرنگ کے بارے میں پتہ لگتا ہم ان کو اعتماد میں لے لیتے۔ اس کا ایک اور فائدہ ہوا کہ سکیورٹی سے بے نیاز ہم نے دن کے وقت بھی کام شروع کر دیا۔ دو کمروں کی چھتوں پر مزید مٹی ڈالنے کی گنجائش باقی نہ رہی تو ہم تیسرے کمرے کی چھت پر پہنچ گئے۔ ایک رات اپنی اپنی باری پر سرنگ کی کھدائی جاری تھی کہ اچانک خوفناک گڑگڑاہٹ کی آواز آئی، ایسے لگا جیسے کوئی چھت زمین بوس ہوگئی ہو۔ سائرن بجنے لگا۔ ٹاور پر کھڑے سنتریوں نے سرچ لائٹوں کا رخ ہماری بیرک کی طرف کر دیا۔ ہم بجلی کی تیزی سے سرنگ میں سے باہر نکلے۔ گندے کپڑے اتارے اور سب ایک ہی وقت میں ننگے غسل خانے میں نہانے کے لیئے داخل ہوگئے۔ باہر آ کر دیکھا کہ تیسرے کمرے کی چھت مٹی کے بوجھ کی وجہ سے گر گئی تھی۔ فوری طور پر باہر کھڑے میجر قادر، کیپٹن احسن، کیپٹن محبوب قادر اور میں نے ملاقات کی (کچھ عرصہ قبل کمروں کو تالے لگانا چھوڑ دیا گیا تھا) اور فیصلہ کیا کہ جیسے ہی کیمپ انتظامیہ آئے گی اسے ہم کہیں گے کہ جو سرنگ پہلے پکڑی گئی تھی اس کی مٹی چھت پر ڈالی گئی تھی اور جو اتاری نہیں گئی تھی۔ ہمارے آدمی مرتے مرتے بچے ہیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ اس اس وقت اسی کمرے میں چار قیدی بھائی کمرے کے چاروں کونوں میں چارپائیوں پر سو رہے تھے۔ چھت درمیان میں سے ٹوٹی اور سب بال بال بچ گئے۔ ان میں سے ایک بہت گھبرا گیا اور کیمپ کے گیٹ کی طرف دوڑا کہ وہ ہندوستانی انتظامیہ کو بتانے جا رہا کہ یہاں ایک سرنگ کھودی جا رہی ہے۔ لپک کر ہم نے اسے پکڑ کر سمجھایا کہ

کچھ نہیں ہوگا ہوش کے ناخن لے، ہم سب اس کے ساتھ ہیں۔ انتظامیہ کو آنے میں کچھ وقت لگا۔ اسی دوران ہم نے اپنا منصوبہ بنا لیا تھا کہ ہم نے کیا کہنا ہے۔ چنانچہ جب انتظامیہ پہنچی تو الٹا ہم ان پر برس پڑے کہ یہ کیا مذاق ہے کہ ہمارے آدمی مرتے مرتے بچے۔ کسی نے پہلی سرنگ پکڑے جانے کے بعد چھت کی تلاشی نہ لی۔ وہ گھبرا گئے اور سکھ کیمپ کمانڈنٹ کو اپنی نوکری کے لالے پڑ گئے اور اس نے کہا کوئی بات نہیں یہ مٹی وغیرہ ہٹا دیں۔ اس صورت حال سے ہمیں یہ فائدہ ہوا کہ ہم نے اپنی بیرک کی پہلی دو چھتوں کو بھی مٹی سے خالی کر دیا۔ اس سے ہمیں مٹی ٹھکانے لگانے کے لیئے مزید جگہ مل گئی۔ خدا نے دشمنوں کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔ دن کی روشنی میں صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ تازہ مٹی ہے لیکن ان کو یہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ چھت کی دوبارہ مرمت کر دی گئی۔ اس میں کچھ دن لگے اور ہمیں مجبورا اپنا کام روکنا پڑا لیکن ہم خوش تھے کہ تمام مٹی کو ٹھکانے لگانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

چھت کے گرنے والے حادثے کے بعد ہمیں کام دوبارہ شروع کرنے کے لیئے تقریبا دو تین ہفتے کا وقفہ دینا پڑا تا کہ حالات بہتر ہو جائیں۔ سرنگ کی کھدائی دوبارہ شروع کر دی، جوں جوں ہم آگے بڑھتے گئے آکسیجن کی کمی کی وجہ سے سانس جلد پھول جاتا اور کام کی رفتار میں خلل پڑتا۔ اس مشکل پر کسی حد تک قابو پانے کے لیئے rat hole بنایا۔ سرنگ میں سے چھوٹا سا سوراخ اوپر کی طرف باہر نکالا تا کہ کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس کا اخراج ممکن ہو اور اس کی جگہ آکسیجن لے لے۔ ہمارے کام کی رفتار پہلے کی نسبت بڑھ گئی۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ باہر سے معلوم ہو جائے کہ کہاں تک کھدائی ہو چکی ہے اور ہمیں مزید کتنی دور تک اور کھودنا ہے۔ فاصلہ ناپنے کا طریقہ کچھ اس طرح اختیار کیا جاتا کہ سرنگ کے اندر rat hole کے ذریعے سگریٹ کا کش لے کر دھواں پھینکا جاتا اور باہر کھڑے شخص

کو باآسانی معلوم ہو جاتا کہ سرنگ کی لمبائی کہاں تک پہنچ گئی ہے۔

ایک روز دوپہر کے وقت سرنگ کے اندر کام جاری تھا، میں اس وقت دروازے کے نیچے بنی ہوئی سیمنٹ کی پٹی کی مرمت کر رہا تھا۔ ہماری بیرک کے کمرے کی چھت کی مرمت کے دوران سیمنٹ کی بوری سے کچھ سیمنٹ چوری کیا ہوا تھا۔ دو آدمی سرنگ کے اندر کام کر رہے تھے اور تین سرنگ کے باہر، جن میں میں بھی شامل تھا۔ اچانک ہمارے کمرے کا دروازہ کھٹکا۔ بجلی کی رفتار سے بھی زیادہ تیز سب باہر نکلے، گندے کپڑے اتار کر سرنگ میں پھینکے، تمام اکٹھے ننگے ہو کر جلدی سے نہائے۔ گرمیوں کے دن تھے۔ چارپایاں دیواروں کے ساتھ کھڑی کر کے پورے کمرے میں پانی پھینک دیا تاکہ پتہ نہ چل سکے کہ دروازے کی بنی کی مرمت تازہ تازہ ہوئی ہے۔ دوبارہ دروازہ کھٹکایا گیا۔ اس دوران ہم سب تیار ہو گئے تھے۔ سرنگ کا دروازہ بند کیا، کمرے کا دروازہ کھولا، باہر انتظامیہ کے لوگ وردی میں کھڑے تھے۔ ہمارے کمرے پر ہی چھاپا تھا، باہر نکل کر ہم باقی ساتھیوں کے ساتھ فال ان fall in ہو گئے۔ ایک دوسرے کا منہ دیکھنا شروع کر دیا۔ چھاپا مارنے والے ایک بار اندر کمرے کے اندر گئے اور پھر باہر آ گئے۔ انہوں نے دوبارہ یہی عمل دہرایا۔ کھڑے کھڑے میں نے اللہ سے دعا کی کہ اے اللہ میرے پروردگار یہ سرنگ بنانے میں اگر ہماری خودغرضی کا عمل داخل ہے کہ ہم اسے بنا کر بغیر کسی کو بتائے چپکے سے نکل جائیں گے تو بے شک سرنگ پکڑی جائے کوئی افسوس نہیں ہوگا۔ لیکن اگر ہماری نیت میں کوئی خلل نہیں اور یہ سرنگ پکڑی گئی تو میرا اور تمہارا رابطہ ہمیشہ کے لیئے ٹوٹ جائے گا۔ شاید یہ دعا کی قبولیت کا وقت تھا، تین بار وہ کمرے میں گئے اور باہر نکلے لیکن ان کو کچھ حاصل نہیں ہوا۔ آخر کار وہ واپس چلے گئے اور ہم برخاست ہو کر واپس اپنے کمرے میں آ گئے۔ چارپایاں بچھائیں۔ کیپٹن

احسن اور میں ایک چارپائی پر بیٹھ گئے، باتیں شروع ہوئیں تو بے اختیار شکرانے میں میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے اور پھر میں زار و قطار رونے لگا۔ دشمن بالکل اندھا بہرہ ہوگیا تھا حالانکہ یہ بالکل واضع تھا کہ اس کمرے میں کچھ گڑ بڑ ہے لیکن یہ سب کچھ چھاپہ مارنے والوں کی نظروں سے اوجھل رہا۔

اسی دوران یہ خبر ملی کہ قیدیوں کو واپس بھجوانے کا معاہدہ ہوگیا ہے۔سب سے پہلے آگرہ جیل کو خالی کیا گیا۔اس معاہدے کا ہم نے کوئی اثر نہ لیا اور اپنے منصوبے پر کام جاری رکھا۔اب چونکہ پورے کیمپ میں موجود قیدی افسروں کو پتہ چل چکا تھا کہ اس کمرے سے ایک سرنگ نکالی جا رہی ہے تو اختلافات پیدا ہونے شروع ہو گئے۔زیادہ ترافسروں کا خیال تھا کہ ہمیں سرنگ بنانے کا کام ترک کر کے وطن واپسی میں اپنی باری کا انتظار کرنا چاہیے لیکن ہمارے پرانے گروپ جس میں میں بھی شامل تھا کی سوچ مختلف تھی۔ ہم چاہتے تھے کہ باعزت طریقے سے دشمن کے پنجے سے آزادی حاصل کی جائے اور یہ طریقہ بذریعہ سرنگ تھا۔تب تک ہم سرنگ کی کھدائی میں کافی آگے نکل چکے تھے بلکہ باؤنڈری وال بھی عبور کر چکے تھے اور باہر لگائی گئی خاردار تاروں کی رکاوٹوں کے درمیان تک پہنچ چکے تھے۔ یہاں بھی ہم نے ایک rat hole بنا کر اس امر کی تصدیق کر لی تھی۔ چند دنوں کی مزید محنت سے ہم ان رکاوٹوں کو بھی عبور کرنے میں کامیاب ہو جاتے۔اختلافات ہونے پر ہمارا کام رک گیا۔ اسی دوران پتہ چلا کہ ہمارے کیمپ نمبر 95 میں موجود قیدیوں کو سلسلہ وار پاکستان بھیجنے کا پروگرام جاری ہوگیا ہے۔اب ہمارے پاس اور کوئی چارہ نہ تھا، چنانچہ سرنگ کے ذریعے بھاگنے کا ارادہ ترک کرنا پڑا۔آنے سے پہلے میں نے فٹے foot ruler سے پوری سرنگ کو ماپا۔ہم 179 فٹ تک کھدائی کر چکے تھے۔دوسری جنگ عظیم میں اتحادی قیدیوں نے 60 فٹ لمبی سرنگ منائی تھی جس

پر امریکنیوں نے The Great Escape نامی فلم بنا ڈالی۔ ہماری ڈیڑھ سال کی محنت رائیگاں گئی۔ شاید خدا کو یہی منظور تھا اور اسی میں ہم نے اپنی بھلائی سمجھ کر خدا کے اس فیصلے کو قبول کیا۔ ہمارے کمرے میں مقیم بیشتر افسروں کے نام رانچی کیمپ سے قیدی لیجانے والی تیسری یا چوتھی ٹرین میں شامل تھے۔ (نوٹ :کیمپ 95 میں سرنگ کی کھدائی کے بارے میں میجر عبدالقادر (کرنل کے عہدے سے ریٹائر ہوئے) نے اپنی کتاب بے تیغ سپاہی میں صفحہ نمبر 123 پر تفصیلا ذکر کیا ہے۔)

وطن واپسی

افسروں کی تین چار پارٹیاں جا چکی تھیں اور چوتھی پارٹی میں جانے والے افسروں میں میں بھی شامل تھا۔ یہ پارٹی 8 فروری کو روانہ ہونی تھی۔ واپسی پر میجر ذولفقار علی جنجوعہ میرے ساتھ تھا۔ ہتھکڑیاں تو نہ پہنائی گئیں لیکن حفاظتی اقدامات ویسے ہی سخت تھے۔ ریڈکراس کا ایک ڈاکٹر بھی ساتھ تھا۔ اسے بھی میری پہلی کوشش کے بارے میں علم تھا جس کی تفصیل اس نے مجھ سے دریافت کی۔ ہماری گاڑی جب کچھ دیر کے لیے مغل سرائے رکی تو بہت سے سویلین ہمیں دیکھنے کے لیے اکٹھے ہو گئے۔ ان میں پندرہ سولہ سال کا ایک نوجوان آگے بڑھا اور پاکستان اور اسلام کے حق میں نعرے لگانے لگا۔ اُسے اس کے ساتھی پیچھے کھینچ رہے تھے کہ مبادا ہندوستانی اُسے ماریں یا گرفتار کر لیں لیکن انجام سے بے پرواہ وہ نعرہ تکبیر اور

پاکستان زندہ باد کے نعرے لگاتا رہا۔ مختلف شہروں سے گزرتے ہوئے جب گاڑی لکھنؤ پہنچی تو وہاں پلیٹ فارم پر بہت سے ہندو اور سکھ افسر موجود تھے۔ لکھنؤ کے بارے میں اطلاع ملی تھی کہ یہاں ان ایک سو پچانویں کی لسٹ میں شامل افسروں کو الگ کر کے جنگی ملزموں کے کیمپ واقع آگرہ میں منتقل کیا جاتا ہے۔ سنٹرل کمانڈ ہیڈ کوارٹر ہونے کی حیثیت سے جنگی قیدیوں کا کنٹرول سیل بھی یہیں پر تھا۔ کوئی ہندو افسر میرا نام لیتا لیتا ہمارے کمپارٹمنٹ میں داخل ہوا تو میجر جنجوعہ کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ اس کا خیال تھا کہ مجھے یہاں سے الگ کیا جا رہا ہے۔ افسر بڑی خوش اخلاقی سے ملا اور پھر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد واپس چلا گیا۔ اُس کا میرے بارے میں علم ہونے کا معمہ سمجھ میں نہیں آیا۔ امرتسر ریلوے سٹیشن پر گاڑی روک لی گئی اور جنگی قیدیوں کے کھانے کا معقول انتظام الوِداعی پارٹی کی صورت میں دیا گیا۔ ہمیں یقین دلانے کی کوشش کی گئی کہ ہندوؤں کے دلوں میں ہمارے لیے نیک جذبات کے سوا کچھ نہیں۔ واہگہ سے میل ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ٹرین روک دی گئی۔ یہاں سے ہمیں سرحد تک پیدل لے جایا گیا۔ بارڈر پر انتظار کے لمحے بہت سے لوگوں کے لیے بے تابی کا باعث بن رہے تھے لیکن میں اپنا سر ندامت سے جھکائے چلا جا رہا تھا۔ سوچا وطن واپس کیا منہ لے کر جا رہا ہوں؟ اس کے دو لخت کرنے میں گو خفیف سہی میرا بھی تو ہاتھ تھا۔ لیکن ہماری حوصلہ افزائی کے لیے سرحد پار شامیانے لگائے گئے تھے۔ شادیانے بج رہے تھے۔ آرائشی دروازے، جھنڈیاں اور نہ جانے کیا کیا سجایا گیا تھا۔ بہت سے جرنیل اور فوجی افسر اور اعلیٰ سول حکام ہمیں خوش آمدید کہنے آئے تھے۔ آخر ہم اپنے مادی وجود کو بچالانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ کروڑوں ہم وطن مسلمان مردوں اور عورتوں کو ہندوؤں اور سکھوں کے حوالے کر آنے کے بعد اب ہم سکھ اور چین کی بانسری بجائیں گے۔ محمد

بن قاسم کے جانشینوں کا یہ کارنامہ شاید ہماری آئندہ نسلوں کے لئے درس عبرت ہوتو ہو لیکن اس وقت تو ہم ایک مداریُ کے اشارے پر ہے جمالو، بھارتی اور مغربی دھنوں پر رقص میں مصروف تھے۔ بنگلہ دیش تسلیم کرو کا نعرہ ملک کی فضاؤں میں گونج رہا تھا۔

دو قومی نظریہ؟؟؟۔انشا اللہ قائم رہے گا۔اب ہندوستان کو ایک نہیں دو اسلامی مما لک کا جلد یا بدیر سامنا کرنا پڑے گا۔اس کا سنار بنگلہ کا خواب شرمندء تعبیر نہ ہوسکا نہ اس کے آئندہ کوئی امکانات ہیں۔ بنگال کی قبل از آزادی کی تقسیم کی لکیر انشاء اللہ کبھی بھی نہیں مٹے گی بلکہ اور گہری ہوکر مغربی بنگال کی طرف بڑھے گی۔
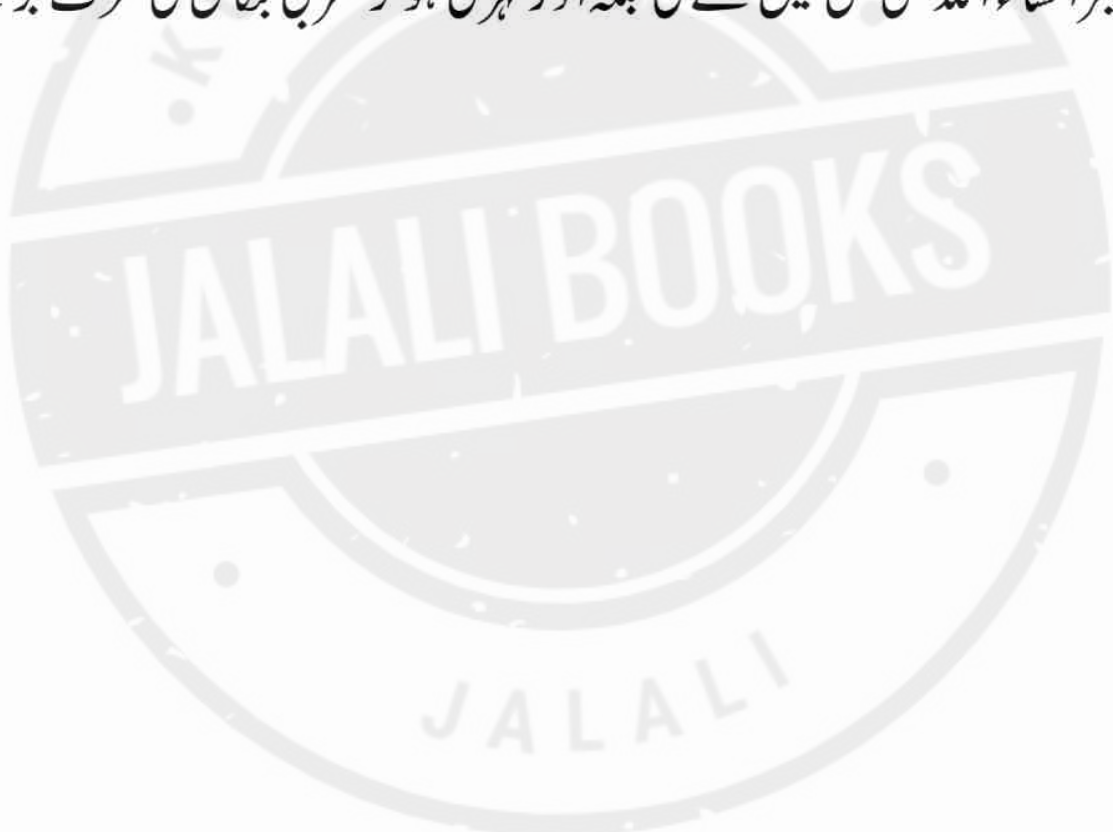
تیسرا باب

قید سے واپسی کے بعد

گو یہ کتاب کے موضوع سے کچھ ہٹ کر ہے لیکن شاید کچھ قارئین جاننا چاہیں گے کہ جنگ اور قید کے بعد زمانہ امن میں میں نے زندگی کے دن کیسے گزارے۔ ہوسکتا ہے اس میں ان کے لیئے کوئی دلچسپی کا عنصر موجود ہو۔ میں ان لوگوں کا بھی نہایت شکرگزار ہوں جنہوں نے یہاں تک میرا ساتھ دیا۔انہیں نیک تمناؤں کے ساتھ خدا حافظ!

تفتیشی عمل Interrogation کے بعد پشاور میں ایک سگنل یونٹ میں پوسٹنگ ہوئی اور سال بعد وہاں ایک نئی کور کھڑی ہونے پر کور ہیڈکوارٹر میں جی۔ٹو، کمیونیکیشن کے طور پر پوسٹ کردیا گیا۔قید کے دوران نماز پابندی سے پڑھنی شروع کردی تھی لیکن واپس آکر تین چار مہینوں کے اندر ہی یہ عادت مجھ سے چھوٹ گئی جس کی وجہ سے میں کافی پریشان رہنے لگا تھا۔سکول آف سگنلز (موجودہ ملٹری کالج آف سگنلز) میں ایک کورس کے دوران کیپٹن نسیم نے، جو لڑائی کے دوران بھیراب بازار اور میرٹھ کے قیدی کیمپ نمبر 40 میں میرے ساتھ تھا، میرا تعارف سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ کے شیخ مولانا اللہ یار خان رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ سے کروایا جس سے میری دنیا ہی بدل گئی۔ایک دن والد صاحب نے مجھے دفتر جاتے ہوئے بڑھی

ہوئی داڑھی کے ساتھ دیکھا تو اس کے بارے میں پوچھا۔میرے بتانے پر انہوں نے مشورہ دیا کہ فی الحال داڑھی رکھنے کا ارادہ ملتوی کر دو کیونکہ تمہارا کرنل کے عہدے پر ترقی کے لئے کچھ عرصے کے بعد بورڈ ہونے والا ہے اور فوج میں داڑھی کو پسند نہیں کیا جاتا۔ جواب میں کہا کہ زندگی میں جو کچھ پانا تھا پا لیا ہے اب کسی مزید چیز کی طلب نہیں رہی ۔ شیخ کی صحبت اور پابندی سے صبح وشام ذکر کرنے سے فرائض ادا کرنے میں آسانی اور بیحد سکون کے علاوہ میری روزمرہ زندگی میں آہستہ آہستہ تبدیلی آنی شروع ہوگئی۔اس دور میں ٹی۔ وی۔ پر انگریزی میں خبریں پڑھنے والی ایک مشہور نیوز ریڈر شائستہ خان (جی ہاں یہی نام تھا اور اگر وہ پگڑی وغیرہ پہن کر جلوہ افروز ہوتی تو کسی کو اس کے عورت ہونے پر ذرا سے بھی شک نہ ہوتا) کو بھی خبریں سننے کے دوران نگاہیں نیچی ہو جاتی تھیں۔

انفنٹری سکول میں بطور انسٹرکٹر تعیناتی کے دوران مجھے کمانڈنٹ کی طرف سے حکم ملا کہ آرمی ریگولیشنز ، جو برطانوی دور میں بنائے گئے تھے اور جن کی ہم ابھی تک پیروی کر رہے ہیں ، کے مطابق اس کی لمبائی جتنی زیرلب سے ایک مشت سے زیادہ ہے کاٹ دو۔ میرے انکار پر کیس جی۔ایچ۔ کیو کو بھجوایا گیا جہاں سے اس بارے میں مجھ سے وضاحت مانگی گئی۔اس کے جواب میں میں نے لکھا کہ میں نے داڑھی سنت کے مطابق رکھی ہے نہ کہ کسی آرمی ریگولیشن کے تحت۔اس کے بعد مجھ سے کوئی مزید تفتیش نہیں کی گئی۔ چونکہ اس وقت کے آرمی چیف جنرل ضیا الحق تھے اس لیئے داڑھی کی لمبائی کی شرط کو نظر انداز کر دیا گیا یا ختم کر دیا گیا۔ 1976 میں انگلینڈ، پاکستان ،ترکی اور ایران کی ایک مشترکہ ٹیم کے ساتھ سینٹو CENTO کے سنٹرل وائرلیس سسٹم کی ٹیسٹنگ کے لیئے ایران اور ترکی جانے کا اتفاق ہوا تو ترکی کی دیہی آبادی کا اسلام سے والہانہ لگاؤ نے بہت متاثر کیا۔ مجھے یقین ہوگیا کہ

اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز اسی ملک سے ہوگا گو شہری آبادی قطعی طور پر آزاد خیال اور مغرب زدہ تھی۔ سینٹو ہیڈکوارٹر کے نزدیک ایک مرکزی مسجد میں بہت سے قافلے بسوں کے ذریعے حج پر جانے کے لیئے رکے ہوئے تھے۔ جب میں وہاں نماز پڑھنے گیا تو بہت سے ترکوں نے مجھے داڑھی کے ساتھ فوجی وردی میں دیکھ کر فرط جذبات میں میری داڑھی کو چوما۔ اس وقت ترک فوج میں داڑھی رکھنے کی ممانعت تھی۔ اس سے قبل جب میں ائیرپورٹ سے ایک افسر میس میں ٹھہرانے کے لیئے لایا گیا تو مجھے اس کے باہر بہت دیر تک انتظار کرنا پڑا تھا چونکہ کسی بھی باشرع شخص کو میسوں میں داخلے کی ان کے قواعد کے مطابق اجازت نہیں تھی اس لیئے انہیں کسی اعلیٰ افسر سے خاص طور پر میرے لیئے اجازت لینی پڑی تھی۔ اس طرح شاید میں اتاترک کی ترکی میں کسی میس میں داخل ہونے والا داڑھی والا پہلا فوجی افسر تھا۔ اتنی تفصیل میں جانے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ اگر ترکی جسے یورپ کا بیمار شخص isick man of Europe کہا جاتا تھا اور جہاں اتاترک نے نہ صرف ترکی زبان کے رسم الخط کو عربی سے رومن میں تبدیل کر دیا تھا بلکہ قرآن کو بھی صرف اسی رسم الخط میں شائع کرنے کی اجازت دی تھی۔ اس طرح ترک اپنے ماضی سے آہستہ آہستہ کٹ کے رہ گئے تھے۔ ایک دکان پر کچھ اسلامی کتابیں جن کی حضرت جی رحمتہ اللہ نے فرمائش کی تھی خریدنے گیا تو وہاں عربی کی کوئی کتاب موجود نہیں تھی۔ دکاندار مجھے دکان کے عقب میں ایک سٹور میں لے گیا جہاں بہت سی اسلامی کتب ایک ڈھیر کی صورت میں پڑی ہوئی تھیں۔ اس کے مطابق اب ان کتابوں کا کوئی طلبگار نہیں رہا تھا۔ اسلام سے اس قدر دور کر دیئے جانے کے بعد اگر وہ اس کی طرف واپس پلٹ سکتے ہیں تو ہم ایسا کیوں نہیں کر سکتے؟ اسی دورے کے دوران ایران میں شہنشاہ رضا شاہ پہلوی کے خلاف امام خمینی کی تحریک کو بھی قریب سے دیکھنے کا موقع

ملا۔

1977 میں سٹاف کالج انٹرینس ٹیسٹ پاس کرنے کے بعد ایک سالہ سٹاف کورس کیا اور لفٹینینٹ کرنل کے عہدے پر ترقی پا کر انفنٹری اسکول کوئٹہ میں ٹیک Tac ونگ میں بحثیت انسٹرکٹر پوسٹ ہوگیا۔ جنرل ضیاالحق سے میری پہلی ملاقات بھی وہیں پر ہوئی جب وہ افسروں سے ملتے ملاتے میرے قریب آئے تو رک گئے۔شاید میری وردی پر لگے ایس۔ ایس۔ جی ونگ، ستارہ ء جرأت کی میڈل ربن، ٹوپی پر سگنل کا بیج پہنے ایک باشرع افسر کو دیکھ کر ان کا میرے قریب رکنے اور کچھ دیر باتیں کرنے کی وجہ بنی۔اس سے قبل سٹاف کالج کی ٹریننگ کے دوران، جب ان کی تقریر کے بعد سوال و جواب کا وقفہ ہوا، تو میں نے ان سے پوچھا تھا کہ اگر 90 فیصد مسلمان آبادی کے ملک افغانستان میں ایک الحادی نظام کمیونزم رائج ہوسکتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ پاکستان جہاں اتنے ہی تناسب سے مسلمان آباد ہیں اسلام کا نفاذ نہیں ہو سکتا۔اس کا انھوں نے کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا تھا۔ان سے دوسری ملاقات دارالعرفان منارہ ضلع چکوال میں ہوئی جہاں پر اس وقت کے ہمارے سلسلے کے شیخ اور تنظیم الاخوان کے سربراہ امیر محمد اکرم اعوانؒ نے انہیں اسلامی نظام کے نفاذ کے بارے میں گفتگو اور منارہ میں صقارہ اکیڈیمی، جہاں پر انٹرمیڈیٹ لیول تک لڑکے اور لڑکیوں کو الگ الگ دینی اور روائتی تعلیم دی جاتی ہے، کے افتتاح کے لیئے مدعو کیا تھا۔ ان کے ملٹری سیکریٹری برگیڈئیر اکرم نے ان سے میرا تعارف ایک درخواست، جو میں نے اس کے توسط سے دی تھی، کے حوالے سے کروایا لیکن وہ بغیر کوئی بات کیئے آگے بڑھ گئے تھے۔اس کے بعد ان سے میرا ایک خط کے ذریعے رابطہ تب ہوا جب مجھے جنرل تجمل کی ان کے خلاف سازش کیس کے سلسلے میں نظر بند کر دیا گیا تھا۔میں نے اپنی حراست کے ایک ماہ بعد انہیں ایک خط لکھا جس میں ان سے

کہا کہ چونکہ اب تک میری اس کیس میں شمولیت کا کوئی ثبوت نہیں ملا اور چند ماہ قبل میرے والد اور چھوٹے بھائی شیخوپورہ کے نزدیک ہرن مینار تالاب میں ڈوب کر فوت ہوگئے ہیں اور میری بوڑھی ماں میرے ساتھ اس واقعہ اور خاوند اور بیٹے کی جدائی کی وجہ سے کافی پریشان ہیں اس لیئے یہ نظر بندی ختم کر دی جائے۔ اس پر مجھے رہا تو کر دیا گیا لیکن ایک سال تک اس کیس سے منسلک رکھا گیا۔

افغانستان کی جنگ کی وجہ سے کافی مجاہدین کوئٹہ میں اکھٹے ہوگئے تھے۔ ان میں سے چند ایک کے ساتھ ایک نہایت جوشیلے اور جذبہء اسلام سے بھرپور میجر خالد سلطان کی وساطت سے رابطہ ہوا اور ان کی ہم نے کچھ ابتدائی ٹریننگ کی جو میری وہاں سے پوسٹنگ ہو جانے کی وجہ سے جاری نہ رہ سکی۔ جیسا کہ اوپر ذکر کر چکا ہوں میں نے اور میجر خالد سلطان نے جنرل ضیا الحق کو ان کے ملٹری سیکرٹری بریگیڈیئر اکرم، جو میرے روحانی سلسلے کے بھی ساتھی تھے (ضمناً عرض کرتا چلوں کہ جنگ افغانستان کے ہیرو شہید کرنل سلطان امیر عرف کرنل امام آخر تک اسی سلسلے میں شامل رہے اور جس کا ذکر انہوں نے اپنی کتاب میں بھی کیا ہے۔ ان کا تعلق میرے بعد اسی ٹیپو کمپنی سے تھا جس میں میں نے ایس۔ ایس۔ جی کی ٹریننگ کے بعد شمولیت اختیار کی تھی۔ وہ مجھ سے اکثر کہا کرتے تھے کہ سر انشا اللہ میں آپ کے ساتھ غزوۃ الہند میں شامل ہوں گا)، کی وساطت سے افغان جہاد میں شرکت کے لیئے درخواست دی۔ اس میں یہ بھی لکھا کہ اگر فوج میں رہ کر یہ ممکن نہیں تو ہمیں ریٹائر کر دیا جائے۔ اس پر ہمارے علاوہ بریگیڈیئر اکرم کی سخت سرزنش ہوئی کہ ہم اس طرح اپنے فوجیوں کو اس جنگ میں ملوث نہیں کر سکتے۔ آخری دفعہ اپنی شہادت سے دو روز قبل میں نے انہیں راولپنڈی کچہری کے پاس ایک یوٹرن پر، جس پر میری گاڑی رکی ہوئی تھی، نہایت پریشانی کی حالت میں دیکھا۔ انہوں نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ

مجھ پر ڈالی اور آگے بڑھ گئے۔ نجانے ان کے ذہن پر اس وقت کیا کیا خدشات حاوی تھے۔ عین ممکن ہے کہ انہیں اپنے خلاف ہونے والی سازش کا کچھ کچھ ادراک ہو گیا تھا۔ انہیں دنوں میں نے اپنی ایک غزل میں ان کے بارے میں یہ شعر کہا تھا۔

ضیاالحق تیرا بجھتا دیا ہے　　　اندھیری رات طوفانی بہت ہے

والد صاحب اور چھوٹے بھائی کے ہرن مینار تالاب میں ڈوب کر مرنے پر والدہ کے ساتھ رہنے کے لیئے راولپنڈی پوسٹنگ کروائی جہاں مجھے ایک کور سگنل بٹالین کی کمانڈ سونپی گئی۔ تھوڑے عرصے بعد ایک رات لفٹیننٹ جنرل تجمل (ریٹائرڈ) ،جنہیں میں پہلے سے نہیں جانتا تھا، مجھے ملنے میرے گھر آئے اور پاکستان میں اسلامی انقلاب کے بارے میں کچھ دیر گفتگو کی۔ ان کے بیٹے کیپٹن نوید کے ساتھ کوئٹہ سے سفر کے دوران ملک میں اسلام کے نفاذ کے بارے میں گفتگو ہوئی تھی جو شاید اس ملاقات کی بنیاد بنی تھی۔ انہوں نے بھی اسلامی انقلاب لانے کے بارے میں ہی گفتگو کی جس کے جواب میں میں نے انہیں کہا تھا کہ یہ انقلاب ایک عوامی جد و جہد کے بغیر ممکن نہیں جس کے بعد وہ چلے گئے تھے۔ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ جنرل ضیاالحق کی حکومت کا تختہ الٹانے کی سازش کر رہے ہیں۔ ایک رات ہمارے گھر کور ہیڈ کوارٹر سے دو بریگیڈیئر آ کر مجھے اپنے ساتھ جی۔ ایچ۔ کیو لے آئے جہاں جنرل اختر عبدالرحمان نے مجھ سے سازش کے بارے میں پوچھ گچھ کی جس سے میں نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ اس کے بعد مجھے ایک مہینے کے لیئے نظر بند کر دیا گیا اور تقریباً ایک سال مقدمہ چلنے کے بعد پشاور میں ائیر فارمیشن سگنل ہیڈ کوارٹر میں پوسٹ کر دیا گیا۔

گو میں سازش میں ملوث تو نہیں پایا گیا لیکن ملاقات کی اطلاع نہ دینے پر یہ سب کچھ بھگتنا پڑا تھا۔ میرے تو خواب و خیال بھی نہیں تھا کہ جنرل صاحب کسی

سازش میں ملوث ہیں جس کی تاہید خود انہوں نے کورٹ مارشل کے دوران اپنے دفاعی بیان میں بھی کی اور جس کی بنا پر میں بے گناہ قرار دیا گیا۔ اس طرح کے مقدمے میں ملوث ہونے کے بعد فوج میں مزید ترقی کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں اس لیئے برگیڈیئر منصور الحق ڈائریکٹر جنرل ٹی۔این۔ٹی (موجودہ پی۔ٹی۔سی۔ایل) جنہیں میں صرف نام سے جانتا تھا نے مجھے دو دوسرے سگنل افسروں کے ساتھ اپنے محکمے میں ڈیپوٹیشن پر لے کر لاہور میں بحثیت ڈائریکٹر ٹیلیفون پوسٹ کر دیا۔ ٹی۔اینڈ۔ٹی جو بعد میں پی۔ٹی۔سی۔ایل کے نام سے موسوم ہوئی میں میری مندرجہ ذیل مصروفیات رہیں۔

1۔ **1982 -1983** ڈائریکٹر ٹیلیفون لاہور۔

2۔1983 سویڈن میں ایرکسن ERICSSON کے ڈجیٹل الیکٹرانک ایکسچینجوں کی ہارڈ ویئر اور سوفٹ ویئر کی چھ ماہ کی ٹریننگ اور واپسی پر 1984 پاکستان کے پہلے ڈجیٹل الیکٹرانک ایکسچینج کا پروجیکٹ ڈائریکٹر اور پھر لاہور ہی میں ڈائریکٹر ڈجیٹل۔

3۔1986 میں چائنا کے شہر گوانگزو میں ایشیا پیسیفک ٹیلی کمیونٹی APT ،جس میں آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ سمیت بائیس ایشائی مما لک شامل ہیں، کے سٹڈیز گروپس کی میٹنگ میں شرکت کی اور دونوں سٹڈیز گروپس کا دو سال کے لیئے پاکستان سے پہلا چیئر مین منتخب کر لیا گیا۔ اس حیثیت میں تھائی لینڈ اور ہندوستان جانے کا موقع بھی میسر آیا۔

4۔ 1986 -1988 پی،ٹی۔سی۔ایل ہیڈ کوارٹر اسلام آباد میں ڈائریکٹر پلاننگ ڈجیٹل سوئچنگ سسٹم جہاں قومی ٹیلیفون نیٹ ورک کو ڈیجیٹل میں تبدیل کرنے کی پلاننگ کی اور ڈجیٹل ایکسچینجوں کا معیار Specifications قائم کرنے میں حصہ

لیا۔

5۔ جب ڈیپوٹیشن کی 1988 میں چھ سالہ معیاد ختم ہوئی تو فوج نے واپس بلانا چاہا تو میں نے اس وقت کے ڈائریکٹر جنرل ٹی۔ اینڈ۔ ٹی مسٹر صدیقی کے کہنے پر فوج سے استعفیٰ دیکر اسی عہدے پر کنٹریکٹ کی بنیاد پر ملازمت اختیار کر لی۔

ٹیلیفون انڈسٹری آف پاکستان TIP جو پی، ٹی، سی۔ ایل کے لیئے ٹیلیفونز اور ایکسچینج بناتی تھی میں جب 1991 میں ء سیمنز Siemens کے ڈجیٹل سسٹم EWSD کی نئ فیکٹری لگنی شروع ہوئی تو جنرل مینیجر مسٹر نذر محمد نے مجھے مستقل بنیادوں پر جرمن انجینئر کے مقابل ڈائریکٹر پروجیکٹ لگا دیا۔ بعد میں پہلے سے موجود مینجروں نے جرمن انجینئر کی شہ پر ہڑتال کی تو چیئرمین پی۔ ٹی۔ سی۔ ایل، جو بورڈ آف ڈائریکٹرز کا سربراہ بھی تھا، نے مجھ سے معذرت کر کے میری جگہ ایک مکینیکل انجینئر کو پروجیکٹ مینیجر لگا دیا اور مجھے اسلام آباد میں واقع ٹی۔ آئی۔ پی کے مینیجنگ ڈائریکٹر کے ساتھ چیف ٹیکنیکل مینیجر کے طور پر، جو بنیادی طور پر گریڈ 20 کی پوسٹ تھی، تبدیل کر دیا گیا۔ 1998 میں گریڈ 20 میں باقاعدہ ترقی پر ہری پور میں چیف انجینئر کوالٹی ایشورنس ڈیپارٹمنٹ اور چیف انجینئر ریسرچ اور ڈیولوپمنٹ CE QAD/R&D کے عہدے پر پوسٹ کر دیا گیا اور بعد میں مجھے چیف انجینئر ٹسٹنگ اور کمشننگ CE Testing/Commissioning کا اضافی چارج دے دیا گیا۔ سیمنز کی طرف سے مجھے سینئر مینیجرز کورس کے لیئے جرمنی کے شہر میونخ میں دو ہفتوں کے لیئے بھیجا گیا جہاں سے واپسی پر عمرہ ادا کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ استادمکرم مولانا اکرم اعوان رحمتہ اللہ علیہ بھی ان دنوں عمرے کی غرض سے آئے ہوئے تھے۔ انہیں اسلامی یونیورسٹی مدینہ کے ایک پاکستانی ڈائریکٹر ملنے آئے تو دوران گفتگو اس بات کا تذکرہ ہوا کہ کیونکہ قرآن مجید کے انگلش میں کیئے گئے

ترجمے عام انگلش بولنے والے لوگوں کو مشکل سے سمجھ میں آتے ہیں اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ ان پر نظر ثانی کی جائے یا عام فہم اور سادہ زبان میں ایک نیا ترجمہ کیا جائے جس سے ڈائریکٹر نے اتفاق کیا اور شاید اسی بات کو لیکر اس نے ایک پاکستانی ڈاکٹر ہلالی کے ساتھ مل کر ایک نیا ترجمہ کیا جو موجودہ دی نوبل قرآن The Noble Quran کے نام سے کنگ فہد کمپلیکس نے شائع کر کے دنیا بھر میں تقسیم کیا ہے۔ مولانا محمد اکرم اعوان رحمتہ اللہ علیہ نے میرے ساتھ وہاں موجود اور دو ساتھیوں ڈاکٹر کرنل حامد (پی۔ ایچ۔ ڈی) اور کرنل نسیم کو کہا کہ آپ تینوں مل کر یہ کام سرانجام دیں۔ واپس آ کر ہم تینوں نے اس کام کی ابتدا تو کر دی لیکن باقی دو کی مصروفیات کی وجہ سے کچھ عرصے کے بعد مجھے اکیلے ہی اسے جاری رکھنا پڑا۔ اس طرح یہ کام تقریباً سات سال میں مکمل ہوا۔ اس کی نظر ثانی کے لئیے میں نے مختلف نہایت قابل پروفیسرز جن میں نمل NUML کے ایک سولین پروفیسر اور دو فوجی بریگیڈیئرز ڈاکٹر اکبر سگنلز اور بریگیڈیئر ڈاکٹر اللہ بخش آرمی ایجوکیشن کور بھی شامل تھے، ایک ایک کاپی دی۔ ان کی طرف سے تو کوئی جواب نہیں آیا لیکن ان میں سے کسی ایک نے ایک کاپی پروفیسر بدر ہاشمی کو دی جو خود بھی اسی کام میں مصروف تھے۔ ان ہی کی طرف سے ٹیلیفون آیا کہ مجھے آپ کا ترجمہ پسند آیا ہے۔ اپنے دو دوستوں جنرل لہراسب اور کرنل بخشی کو بھی ایک ایک نسخہ بھیجا۔ کرنل بخشی نے تو کچھ کمنٹ لکھ کر دیئے لیکن جنرل لہراسب نے یہ کہہ کر کہ میں اسے تبرکاً اپنے پاس رکھوں گا کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ اس دوران مولانا اکرم اعوان رحمتہ اللہ الیہ نے قرآن کا سلیس اردو میں ترجمہ کیا اور مجھے کہا کہ اپنا انگریزی کا ترجمہ بھی اس کے مطابق کر لو جس کے لئیے مجھے تقریباً نئے سرے سے کام کرنا پڑتا تھا جو اب ممکن نہیں رہا تھا۔ انشا اللہ موقع ملتے ہی اسے شائع کرنے کی کوشش کروں گا

تا کہ اللہ کا پیغام غیر مسلموں تک آسانی کے ساتھ پہنچ سکے۔ انشا اللہ۔

اس دوران سیمنز کی ڈیجیٹل فیکٹری لگ چکی تھی۔ انہوں نے کمال ہوشیاری، چالاکی اور پی۔ ٹی۔ سی۔ ایل کی کے چند سینئر افسروں کی ملی بھگت سے پرانی فیکٹریوں اور ہزاروں ملازمین کا نئ فیکٹری کی آمدن پر انحصار ختم کرنے کے لئیے، مینیجنگ ڈائرکٹر محمد رفیق ملک، فنانس مینیجر مسٹر ندیم اور میری شدید مخالفت کے باوجود ٹی۔ آئی۔ پی کو تین حصوں میں تقسیم کر کے تھوڑے سے سٹاف کے ساتھ ڈجیٹل فیکٹری الگ کر لی۔ اس طرح باقی دو فیکٹریوں کے مالی حالات ابتر ہو گئے۔ مزید برآں ڈجیٹل ایکسچینج بنانے والی فیکٹری کو مکینیکل انجینئر اس لئیے نہیں چلا سکے کہ وہ سیمنز کے ساتھ معاہدے کے مطابق پوری ٹیکنالوجی منتقل نہیں کروا سکے اور بجائے دنیا کی کھلی مارکیٹ سے سستے الیکٹرانک کمپونٹس Electronic Components منگوا کر ٹیسٹنگ کی سہولت جو، ایک معاہدے کے تحت سیمنز نے مہیا کرنی تھی اور جس کے لئیے ہمیں ٹیسٹنگ کے لئیے درکار سامان بھی بیچا تھا، استعمال کرتے، ان ہی سے مہنگے داموں خرید کر لگانے سے ایکسچینجوں کی قیمت دوسری دو کمپنیوں فرانس کی الکاٹل Alcatel اور چینی کمپنی زیڈ۔ ٹی۔ ای ZTE کے مقابلے میں زیادہ ہو گئی۔ یوں آخر کار 1955 میں اس وقت کی ایشیا کی جاپان کے بعد دوسری بڑی ٹیلیفون فیکٹری آہستہ آہستہ بند ہو گئی اور تنخواہوں اور پنشنوں کی ادائیگی کا بوجھ حکومت پر آن پڑا۔

اس دوران PTCL نے مجھے ٹی۔ آئی۔ پی سے ڈیپوٹیشن پر لے کر ایک نئے ریجن میں جنرل مینجر کے طور پر پوسٹ کر کے ایک ایسا سسٹم لگانے کا کام سونپا جس کے ذریعے غیر قانونی انٹرنیشنل ایکسچینجوں Intenational Gateway Exchanges کی نشاندہی کی جا سکے۔ ان ایکسچینجوں کی وجہ سے پی۔ ٹی۔ سی۔ ایل

کو سالانہ انٹرنیشنل کالوں کی آمدن کی مد میں تقریباً دوسو پچاس ملین ڈالر سے زیادہ کا نقصان ہو رہا تھا۔ انٹرنیشنل مارکیٹ میں ایسے سسٹم کی قیمت ہماری پہنچ سے باہر ہونے کی وجہ سے ملکی انجینئیروں، جن میں ملٹری کالج آف سگنلز کے چار زیر تربیت طلبا شامل تھے، سے ایک نہایت ذہین اور قابل انجینئر فیصل انور کی زیرنگرانی ایک سنٹرل مانیٹرنگ سسٹم بنوا کر لگایا جس کے ذریعے جلد ہی ہم نے متعدد ناجائز ایکسچینجوں کا کھوج لگا کر ان کے مالکوں کو پکڑ کر پولیس کے حوالے کیا۔ 2002 میں ریٹائرمنٹ کی عمر کو پہنچا تو پی۔ٹی۔سی۔ایل نے امیرے لیئے یک سال کی اضافی مدت ملازمت کی اجازت منسٹری سے لے لی۔ جب میں سن 2003 میں فارغ ہوا تو پی۔ٹی۔اے نے اسی کام کے لیئے ملازمت کی آفر دی جو بوجوہ قبول نہیں کی۔

2005 میں جب وزیراعلیٰ پنجاب پرویز الٰہی کی آشیرباد اور بھرپور پشت پناہی کی بدولت بحریہ ٹاؤن کے مالک ملک ریاض نے ہمارے علاقے تحصیل راولپنڈی کی زمینوں پر پولیس اور ضلعی انتظامیہ کے غیر موثر ہونے کے بعد ناجائز قبضہ شروع کیا تو میں نے سواں کیمپ سے لے کر روات تک جی۔ٹی روڈ کے دونوں اطراف میں واقع تقریباً پچاس گاؤں کے لوگوں کو اکھٹا کر کے ایک تنظیم بنام 'تنظیم تحفظ حقوق زمینداراں پوٹھوار' بنائی جس کا مجھے چیئرمین منتخب کرلیا گیا۔ اس تنظیم کے تحت ہم نے متحدد جلسے جلوس کیئے اور جی۔ٹی۔ روڈ کو روات کے نزدیک بلاک کرنے کے علاوہ کچہری اور ڈی۔سی آفس کے سامنے مظاہرے کیئے۔ چوہدری نثار جو ہمارے حلقے کے ایم۔این۔اے بھی تھے، کے علاوہ، خان سرور خان، اے۔این۔پی کے حاجی عدیل، خاقان عباسی اور عمران خان اور نیشنل اسمبلی میں کچھ اور اراکین سے اس سلسلے میں ملاقات کی لیکن کوئی مثبت پیش رفت نہ ہوئی تو ہم نے بزور بازو مزید ناجائز قبضے سے بحریہ کو روک دیا گوان کے پاس ایک ریٹائرڈ

کمانڈو کیپٹن شاہد کے زیر کمان تقریباً سو سابقہ فوجیوں کی ایک فورس موجود تھی جو زبردستی قبضے کرنے کے لیئے استعمال ہوتی تھی ۔اس کے ساتھ ہی 2005 کے نومبر میں ان میں سے بیشتر دیہاتوں کے دس ہزار کنال کے رقبے کو آرمی ویلفیئر ہاؤسنگ اسکیم AWHS کے حق میں صوبائی حکومت نے ایکوائر کرنے کا ایک نوٹیفیکشن جاری کیا جس پر ہم نے سخت احتجاج کیا۔ جب ہمارے احتجاج کے باوجود نوٹیفیکشن منسوخ نہ کیا گیا تو اس کے خلاف لاہور ہائی کورٹ راولپنڈی بنچ میں پٹیشنیں petitions دائر کر دیں ۔میری اور میرے ساتھ شامل سات زمینداروں کی پٹیشن کی پیروی شوکت صدیقی ، جو بعد میں اسلام آباد میں ہائی کورٹ میں جج مقرر ہوئے ، کر رہے تھے ۔اس پٹیشن میں اور چیزوں کے علاوہ ہم نے یہ موءقف اختیار کیا تھا کہ آرمی ویلفیر ہاؤسنگ اسکیم کے پاس قانون کے مطابق کوئی منظور شدہ ہاؤسنگ اسکیم نہیں ہے اور نہ ہی وہ مطلوبہ اسی فیصد زمین کی ملکیت رکھتے ہیں ۔اس وقت کے جسٹس علی نواز چوہان نے لینڈ ایکویزیشن کلیکٹر land Acquistion Collector سے اس کے بارے میں ایک بیان حلفی لیا اوراس کی بنیاد پر ہماری پٹیشنیں خارج کر دیں لیکن آرڈر میں لکھا کہ اگر پٹیشنز چاہیں تو اس کی تردید میں حلف نامہ داخل کر سکتے ہیں لیکن ہمارے وکیل نے کہا کہ مقدمہ ختم ہو چکا ہے ۔

چونکہ وکیلوں کی بھاری فیس دینے کے لئے ہمارے پاس مطلوبہ رقم نہیں تھی اس لیئے چاروناچار میں نے کیس کی خود پیروی کرتے ہوئے اس آرڈر میں جو حلف نامے کو رد کرنے کی سہولت دی گئی تھی اسے بنیاد بنا کر ایک نئی پٹیشن عدالت میں دائر کر دی ۔ساتھ ہی لینڈ ایکوازیشن کلکٹر اور ڈپٹی ڈائریکٹر پر جھوٹا بیان حلفی دینے پر مقدمہ دائر کر دیا جو ابھی تک ہائی کورٹ راولپنڈی میں زیر سماعت ہے! یہ پٹیشن شنوائی کے لیئے منظور کر لی گئی ۔اس مقدمے کا، جس کی پیروی بحریہ کے وکلا جن میں

چوہدری اعتزاز احسن کے علاوہ بہت سے مشہور وکیل کر رہے تھے، چھ سال تک چلنے کے بعد بھی فیصلہ نہ ہوا تو میں نے اس وقت کے چیف جسٹس سپریم کورٹ کو بحریہ کے خلاف تخت پڑی ریزورز فورسٹ کے تقریباً پانچ ہزار کنال کے رقبے پر ناجائز قبضے کے خلاف ایک سوموٹو suo moto، کیس، جس میں میں بھی ایک درخواست کے ذریعے شامل ہو چکا تھا اور اس میں ہائی کورٹ اپنے مقدمے کے فیصلے میں تاخیر کا بھی ذکر کیا تھا، کی ایک تاریخ پر اس مقدمے کا ابھی تک فیصلہ نہ ہونے کے بارے میں بتایا۔اس پر چیف جسٹس افتخار چوہدری نے ہائی کورٹ کو دو ماہ میں فیصلہ کرنے کا آرڈر دیا۔ فیصلہ ہمارے حق میں ہوا تو اس کے خلاف ہائی کورٹ میں انٹرا کورٹ اپیل داخل کر دی گئی۔لیکن تقریباً چھ مزید سالوں کے بعد جب فیصلہ پھر ہمارے حق میں ہوا تو انہوں نے سپریم کورٹ میں اپیل دائر کرنے کی اجازت کی درخواست دے دی۔ دو سال گزرنے کے باوجود ابھی تک اس کی کوئی شنوائی نہیں ہوئی حالانکہ اگر بحریہ ٹاؤن (بحریہ ٹاؤن ہی ڈی۔ ایچ۔اے کی طرف سے مقدمے کی پیروی کر رہا ہے کیونکہ ایک معاہدے کے تحت اسے ان کی زمینوں کو خریدنے اور ان پر ترقیاتی کام developement کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے) چاہتا تو اس کا فیصلہ ایک ہفتے کے اندر اندر ہو سکتا تھا۔لیکن وہ یہ جانتے ہیں کہ فیصلہ ان کے حق میں نہیں ہو گا۔ وہ زمینیں جو انہیں پچھلے فیصلے میں واپس کرنے کا کہا گیا تھا محکمہ مال انہیں یہ جواز بنا کر منتقل نہیں کر رہا کہ ابھی فیصلہ ہونا باقی ہے جو سراسر ایک بہانہ ہے۔ کیا اس طرح کے حربوں اور لوگوں کے حقوق کی پامالی سے صوبائی حکومت کی کارکردگی پہلے سے بھی ابتر نہیں ہو چکی؟ میری DCO کو بحریہ کے علاقے میں جو ہماری آمد و رفت کے رستے چلے آ رہے تھے اور بحریہ نے انہیں ختم کر دیا ہے کی نشاندہی کی درخواست دس بارہ سالوں سے بغیر کسی ایکشن کے پڑی ہوئی

ہے۔

تخت پڑی سرکاری جنگل کی زمین پر ناجائز قبضے کے خلاف پٹیشن میں ضلعی انتظامیہ اور محکمہ جنگلات کے ساتھ میں، محکمہ جنگلات کے ایک ریٹائرڈ اکاؤنٹ افسر ملک محمد شفیع اور ڈاکٹر محمد شفیق ایک سول مسلینیس درخواست 3854/ CMA کے ذریعے شامل ہوئے۔ سرکاری محکموں نے تو کوئی خاص دلچسپی نہیں لی لیکن ملک محمد شفیع نے بحریہ کے وکیلوں کی، جن میں چوہدری اعتزاز احسن، علی ظفر جیسے چوٹی کے وکیل شامل تھے، ڈٹ کر مقابلہ کیا اور ان کی ایک نہ چلنے دی۔ میرا رول صرف مورل اسپورٹ اور ایک آدھ بحث میں حصہ لینے تک محدود رہا۔ اس کیس کے ساتھ ہی کراچی کے علاقے میں بحریہ کو صوبائی حکومت کی طرف سے تقریباً ایک لاکھ کنال کے ناجائز تبادلے کا کیس بھی چل رہا تھا جس کی پیروی ایک نہایت ہی محبّ الوطن شخص صدیقی کر رہا تھا۔ ان کیسوں کا فیصلہ ہونے سے پہلے کورٹ روم میں ایک عجیب تماشہ دیکھنے کو ملا۔ اس وقت چیف جسٹس جواد خواجہ تھے جن کی مدت اس عہدے پر فائز ہونے کے بعد صرف دو ڈھائی ماہ رہ گئی تھی اور وہ شروع سے ہی سے مقدمے کے سننے والے بنچ میں شامل رہے تھے۔ وہ اپنی دیانتداری، ایمانداری اور انصاف پر مبنی فیصلے کرنے کی شہرت رکھتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کیسوں کا فیصلہ ان کے ہوتے ہوئے ہو جائے لیکن بحریہ کے وکیل اسے طول دینے میں ہر طرح کا حربہ استعمال کر رہے تھے۔ علی ظفر سے غالباً اس کی کسی گذشتہ غیر حاضری کے بارے میں پوچھا گیا تو اس کے جواب میں وہ تقریباً چھ گھنٹوں تک، باوجود ججوں کے کہنے کے اس سے آگے کچھ کہو، وہ ایک دو فقرے مسلسل دہراتا رہا اور یوں جسٹس جواد خواجہ کی ریٹائرمنٹ سے قبل فیصلہ نہ ہو سکا۔ سنا ہے علی ظفر آجکل انصاف لائرز فورم کی سربراہی کر رہا ہے۔ بدلتے ہیں رنگ آسماں کیسے کیسے اور وہ بھی تبدیلی کے نام پر!

لیکن اسی بینچ میں شروع سے منسلک جناب جسٹس اعجاز نے کچھ عرصے بعد دونوں کیسوں کے فیصلے بحریہ کے خلاف دے دیئے۔ اس فیصلے کے مطابق دونوں جگہوں کی زمینیں حکومت کو واپس کرنے کا کہا گیا۔ تخت پڑی جنگل کی زمین تو ابھی تک واپس نہیں ہوئی لیکن کراچی کی زمین کی واپسی کے لیئے ایک تین رکنی بنچ اس آرڈر کو عملی جامہ پہنانے کے غرض سے تشکیل دیا گیا لیکن اس نے بجائے زمین کی واپسی کے (جو شاید ان کے چارٹر میں نہیں تھا) ایک معاہدے کی بنا پر بحریہ کو چارسو ساٹھ ارب روپے اقساط کی صورت میں حکومت کے خزانے میں جمع کروانے کا حکم دیا حالانکہ شروع میں اس بنچ یا کمیٹی نے اس زمین کا تخمینہ دو ہزار ارب لگایا تھا۔ حکومت کے اربوں ڈالر بچانے کے صلے میں نہ ہی سندھ اور نہ ہی حکومت پنجاب کی طرف سے ملک محمد شفیع اور صدیقی کی کوئی پذیرائی ہوئی۔ سندھ کی حکومت تو خود اس جرم میں شریک تھی لیکن پنجاب کی حکومت کو تو اس کا نوٹس لینا چاہیئے تھا۔ لگتا ہے محکمہ مال اور محکمہ جنگلات راولپنڈی نے یہ کامیابی اپنے کھاتے میں ڈال لی ہوگی۔ ڈرامے کے ایکٹروں اور پاپ سنگروں کو امتیازی تمغوں سے نوازا جاتا ہے کیونکہ وہ ہمیں ہر طرح کی جائز اور ناجائز تفریح مہیا کرتے ہیں لیکن اپنا پیسہ اور وقت خرچ کر کے قوم کی اربوں روپے کی قیمتی زمین لٹیروں سے واگذار کروانے کے صلے میں ان دونوں کو کوئی تعریفی سند تک عطا نہیں کی گئی۔ کچھ عرصہ فارغ رہنے کے بعد میں نے اپنی کتاب کے دوسرے ایڈیشن کی تیاری شروع کی تو خیال آیا کہ کیوں نہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بارے میں مزید تحقیق کی جائے جس کے بعد اس تحریک کی ابتدا کرنے کا خیال آیا۔

آخر میں اپنی چند غزلیں اور شعر آپکی خدمت میں موضوع کی مناسبت سے عرض کرنا چاہتا ہوں۔ میری شاعری کو آپ حادثاتی بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ جب میں

ایس۔ایس۔جی میں تھا تو ہر سال دو ماہ کے لیئے ٹریننگ کے لیئے اپنی کمپنی کو سندھ میں صحرائے تھر لے کر جا تا تھا۔رات کو تو ہم ٹرینگ میں مصروف ہوتے تھے لیکن دن جھاڑیوں وغیرہ میں چھپ کر گذارنا پڑتا تھا۔گرمی اور مچھروں کی وجہ سے نیند نہیں آتی تھی اس لیئے کچھ نہ کچھ اوٹ پٹانگ لکھنا مجبوری بن گیا تھا۔یہ ُ مجبوری ُ چند سال ہی رہی اور پھر ایک لمبے عرصے بعد دوبارہ کچھ لکھنے کا خیال آیا جو شاید 1988 تک رہا۔اس کے تقریباً دس سال بعد صرف ایک مشاعرے میں پڑھنے کے لیئے جو ایک غزل لکھی تھی چند پرانے اشعار کے ساتھ پیش خدمت ہے۔ تخلص خلش رکھا تھا۔

میں بزم شمع سے جب کوئی پروانہ اٹھاتا ہوں
بنا کر راہ حق کا پھر وہ دیوانہ اٹھاتا ہوں
نہ جانے عالم ہستی میں رکھتا ہوں کہاں جا کر
قدم میں خانقاہ سے جو رندانہ اٹھاتا ہوں

مٹ گئے گرجے جو آسمان کی طرح
وعدہء روٹی کپڑا مکاں کی طرح
اہل مغرب کے گمراہ کن فلسفے
راہ روشن میری کہکشاں کی طرح
ہے تقدس کے قابل یہ ارض وطن
اس کو جانو اگر اپنی ماں کی طرح

☆

غیر ملکی ایڈ کی زنجیر دیکھا چاہئیے
غیرت قومی کی یہ تصویر دیکھا چاہئیے

قوم کا کردار اول ، بعد اسکے سیم و زر
ملک کی دنیا میں پھر توقیر دیکھا چاہئیے

ہو گئے محکوم مسلم دیں سے آزادی کے بعد
اہل وسط ایشیا کشمیر دیکھا چاہئیے

☆

قوت اسلام ہی توڑے گی باطل کا طلسم
اک لڑی میں جب کبھی یہ دانہ دانہ مل گیا

ہاتھ میں تلوار ہے اور لب پہ ذکر اللہ ھو
مرد میداں کو لباس صوفیانہ مل گیا

☆

جنہیں ہے فخر قید حلقہء زلف پریشان پر
نہیں ممکن چلے ان کا سفینہ موج طوفاں پر
جو ہے بے مقصدیت اور لادینی جوانوں میں

نتیجہ ملحدوں کا اس قدر غلبہ دبستاں پر

زمانہ حق پرستی اور بے باکی سے نالاں ہے

رکھی ہے نوک نشتر بارہا میری رگ جاں پر

مئے مغرب نے تجھ کو اس قدر مدہوش کر ڈالا

ترے افکار پر غلبہ، تسلط ذوق و عرفاں پر

وہ مردہ خور گدھ پر نوچ ڈالے جسکے شاہیں نے

اڑن کے واسطے نظریں ہیں اسکی سرخ طوفان پر

تجھے سونپا گیا تھا اے خلش کار جہاں بانی

ہوا ہے مطمئن تو بھی مزاروں کے چراغاں پر

میرے لہو سے اس زمیں میں صبح انقلاب ہو

چھٹے سیاہ رات اور طلوع آفتاب ہو

یہ لمحہ گر گذر گیا تو ہاتھ پھر نہ آئے گا

ہے وقت سوچنے کا کب ہو جو بھی ہو شتاب ہو

سروں پہ باندھ کر کفن حیات جاوداں کی دھن

وہی رہیں گے ہم سفر، ہو عزم جن میں تاب ہو

تھے بھیڑ کے لباس میں جو حکمران بھیڑیے

کٹہروں میں گھسیٹ کر اب ان کا احتساب ہو

ہوس ہوا قتدار کی ، اٹھا کہ ان کو پھینک دو
نواز ، بے نظیر ہو، وڈیرہ ہو نواب ہو
حضور ﷺ ہم تو چل پڑے ، بے آسرا و بے نوا
یہ قافلہ ہے آپ کا اس پر نظر جناب ﷺ ہو
ہے شیخ سلسلہ کا سنگ ، خلش اٹھی نئ امنگ
اٹھو کہ ظلم ختم ہو، امن کی آب و تاب ہو

اپنے ملک کے لیئے کچھ کرنے کی خواہش

مجھے یہ کہنے میں کوئی باق نہیں کہ پاکستان کو مفاد پرست سیاستدانوں نے اس نہج پر پہنچا دیا ہے کہ آگے سوائے مزید خربی اور تباہی کے کچھ نظر نہیں آتا۔اس طبقے نے عوام ، جو خود کو مجبور محض سمجھتے ہیں، کو اپنے قائم کردہ استحصالی نظام میں پھنسا کر اور انہیں جمہوریت بچانے کے چکر میں ڈال کر اپنا اور اپنے خاندانوں کا ان پر مسلط رہنے کا ایک مستقل جواز بنا لیا ہے۔لسانی ،صوبائی اور قومی عصبیتیں تو پاکستان بننے سے پہلے ہی موجود تھیں لیکن اس کے وجود میں آنے کے بعد مختلف پارٹیوں اور ماضی اور حال کی سیاسی اور مذہبی شخصیات کا پجاری بنا کر ہمیں مزید منقسم کر دیا گیا ہے۔اس پر طرہ یہ کہ اسلام کا نعرہ لگا کر مسلمانوں کے اس ملک میں مذہبی فرقہ بندی کو اتنی ہوا دی گئی ہے کہ کچھ لوگ دوسرے فرقے کے مسلمانوں کو کافر قرار دینے سے

بھی گریز نہیں کرتے اور تقریباً تمام فرقوں (جو دراصل مسائل ہیں) کے ماننے والے کسی دوسرے فرقے کے امام کے پیچھے نماز یں ادا کرنے سے بھی احتراز کرتے ہیں۔

ہم اس نظریے سے، جس کے تحت لاکھوں لوگوں نے جان و مال اور اپنی عزتوں کی قربانی دے کر ایک ملک بنایا تھا، بہت دور ہو گئے ہیں۔ قرآن کے مطابق بھائی بھائی بننے کی بجائے ذرا سے اختلاف پر ہمارے ہاتھ ایک دوسرے کے گریبانوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ ایک اللہ کی بندگی چھوڑ کر ہماری وابستگیاں جماعتوں اور شخصیات کے ساتھ اس نہج پر پہنچ چکیں ہیں کہ ان کی کرپشن اور لوٹ مار کے واضع ثبوتوں کے باوجود ان کے جائز اور ناجائز دفاع میں اپنی جان و مال کی بازی لگانے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر آج بلاول زرداری، نواز شریف اور مولانا فضل الرحمان اپنے جیالوں کو ان کی خاطر جان لڑانے کا کہیں تو وہ اس سے گریز نہیں کریں گے۔ لیکن وہی لوگ اللہ کے واضع حکام پر نہ صرف عمل نہیں کرتے بلکہ بعض صورتوں میں ان لیڈروں کے اسلام کے بارے میں منفی رویئے پر بھی مجرمانہ خاموشی اختیار کر لیتے ہیں۔ خانہ کعبہ سے تو بتوں کو توڑ کر خالی کر لیا گیا تھا لیکن اسلام کے نام پر وجود میں آنے والی پاک سرزمین کو ہر طرح کے چھوٹے بڑے بتوں سے بھر دیا گیا ہے۔ ان کے پوجنے والے مسلم اور غیر مسلموں کی تعداد کروڑوں کے حساب سے ہے۔ اخبارات، الیکٹرانک اور سوشل میڈیا پر اسلام کے بارے میں بہت کم اور نہایت دبے ہوئے الفاظ میں ذکر ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں فحاشی کی تشہیر، اسلامی فرقوں کے آپس کے اختلافات، نام نہاد مذہبی دانشور اور مغربی تہذیب کے دلدادہ ایک محدود طبقہ جو اسلام کو توڑ موڑ کر کسی طور دنیا کی موجودہ روش اور مغربی دانشوروں کے خیالات سے ہم آہنگ

کرنے کی خواہش رکھتا ہے، سیاسی جماعتوں کی آپس کی چپقلش، افراط اور تفریق اور آپس کے لڑائی جھگڑوں کو زیادہ وقت دیا جاتا ہے۔

اقتدار پر قابض طبقے نے جو اپنے سابقہ آقاؤں کے، تقسیم کرو اور حکومت کرو divide and rule کے اصول پر عمل کرتے ہوئے ان تضادات کو مزید ہوا دے کر عوام پر اپنی گرفت مضبوط کرتے رہے ہیں۔ انگریزوں کے ایک محکوم قوم کے لیئے بنائے ہوئے سسٹم کو من وعن قبول کرتے ہوئے سرکاری افسر اپنے آپ کو عوام کا خدمت گار سمجھنے کی بجائے اپنے آپ کو حاکم اور ہمیں اپنی رعایہ گردانتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم نے بھی انہیں حاکم ہی کا مقام دے رکھا ہے اور وہ بھی اس حد تک کہ ایک معمولی سے سرکاری ملازم کے تحکمانہ رویے کو بھی اپنے جائز کاموں کو کھلے عام رشوت دینے کے بعد بھی برداشت کر لیتے ہیں۔

سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ ہم اس صورت حال سے کیوں دوچار ہوئے۔ قائد اعظم اور ان کے رفقائے کار کی ہندوستانی مسلمانوں کے لیئے ایک الگ وطن کی سوچ بلا شبہ مثبت اور ہندو ذہنیت کی موجودگی میں بالکل صحیح تھی لیکن 1940 اور 1947 کی درمیانی مدت میں حالات کے تیزی سے بدلتے ہوئے تناظر میں اسلامی نظریے کے نفاذ کے لیئے نہ تو کوئی قابل عمل خاکہ بنایا گیا اور نہ ہی تحریک پاکستان میں ایسے لوگ شامل ہوئے جو اس کے خدوخال بنا کر اسے عملی طور پر نافذ کرنے میں معاونت کر سکتے۔ بدقسمتی سے اس تحریک میں زیادہ تر وہ لوگ ہراول دستے میں در آئے جو خود بھی اور ان کے آباؤ اجداد اقتدار میں آنے والی ہر ملکی اور غیر ملکی حکومت کے پٹھو بننے میں پیش پیش رہ چکے تھے۔ مغلوں اور سکھوں کے زوال کے بعد انہوں نے انگریزوں کی کاسہ لیسی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی یہاں تک کہ 1857 کی جنگ آزادی میں انگریزوں کی مدد کے لیئے اپنے مسلح دستے بھیج کر ان کی مجاہدین آزادی

کو شکست سے دو چار کرنے میں معاونت کی تھی ۔ انہی غداروں کے کچھ خاندان اب تک ہم پر مسلط چلے آ رہے ہیں ۔

ہمارے علماء کی تحریک پاکستان سے عدم دلچسپی اور بعض کی کھلم کھلا مخالفت کی وجہ سے اسلام کے نفاذ کے لئے ان کا اس میدان میں موجود نہ ہونے کی وجہ سے اس نظریے کو نہ صرف پس پشت ڈال دیا گیا بلکہ مذہبی جماعتیں بھی مروجہ سیاست میں قدم رکھ کر اقتدار کی دوڑ میں شامل ہو گئیں اور میرے خیال میں اسلامی نظام حکومت میں سب سے بڑی رکاوٹ بن گئی ہیں ۔ اس صورت حال میں نظریہء پاکستان لاوارث ہونے کے ساتھ ساتھ بعض قدآور ماضی کے غداروں اور سیاستانوں کی ضرب کاری کا نشانہ بنتا رہا کیونکہ اس کا نفاذ ان کے لیئے زہر قاتل ثابت ہوسکتا ہے ۔ اب بھی بعض نام نہاد دانشور قائداعظم اور علامہ اقبال کو اسلام کے نام پر پاکستان کے حصول کو تنقید کا نشانہ بنانے میں بھی کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے ۔ سن 2020 کے اوئل میں ایک ادبی کانفرنس کے دوران ایک ملعون پروفیسر پرویز ھودبائی نے شرمناک طریقے سے قائداعظم کے خلاف ہرزہ سائی کے باوجود سامعین سے زبردست خراج تحسین حاصل کیا ۔ سامعین میں ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا جو اٹھ کر اس مبینہ دانشور کے خلاف کوئی بات کرتا ۔ اس سے زیادہ اس نظریے کی ہمارے ہاتھوں کیا درگت بن سکتی ہے ۔ اس سے انحراف سے ہم نے کتنے نقصان اٹھائے اس پر بات کرنا اشد ضروری ہے ۔

1940 میں قرارداد پاکستان پاس کرنے کے بعد مسلم لیگ کی قیادت میں ایسے لوگ شامل نہیں تھے جو اسے اسلام کے نفاذ کے لیئے کوئی لائحہ عمل دے سکتے ۔ پاکستان کے وجود میں آ جانے کے بعد بھی اس جماعت کے پاس اس نظریے کی ترویج کے لئے نہ کوئی پروگرام تھا اور نہ ہی اس کی ترجیحات میں اس کا کوئی ذکر تھا ۔ قائداعظم

جو ایک جان لیوا بیماری میں مبتلا تھے اور جسے انہوں قیام پاکستان اور کچھ عرصہ بعد تک اس لیئے پوشیدہ رکھا تھا کہ کہیں اس کے افشاء ہونے سے تقسیم ہند میں کوئی رکاوٹ نہ پڑ جائے مستقبل کے لیئے کوئی لائحہ عمل نہ دے سکے۔ بیماری کی وجہ سے وہ معمول کے کاموں سے الگ ہوگئے یا بعض کے نزدیک کر دئے گئے۔ جس کسمپرسی کی حالت میں ان کی موت واقع ہوئی اس پر بھی اس وقت کی حکومت پر بھی کڑی تنقید کی جاتی رہی ہے۔

لیاقت علی خان بھی شاید مشکل حالات، جن میں مہاجروں کی آبادکاری، کشمیر کی جنگ اور اس وقت کے بڑے بڑے سیاست دانوں کی آپس کی چپقلش اور ریشہ دوانیاں کی وجہ اس سمت میں کوئی ٹھوس قدم نہیں اٹھا سکے۔ اس طرح ان کے ہاتھوں اس نظریے کے عملی نفاذ کے سلسلے میں کوئی قابل قدر پیش رفت نہ ہوسکی۔ اس ضمن میں ان پر بہت سے الزامات لگے جن کا مستند یا غیر مستند ہونے کے بارے میں یقین سے کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ البتہ دو سال بعد انہوں نے قانون ساز اسمبلی سے قرارداد مقاصد منظور کروائی جو اسلام کے نفاذ کے لیئے ایک اہم قدم تھا اور جسے بدیر جنرل ضیاالحق نے آئین کا حصہ بنا دیا۔ لیکن اب اس کی افادیت اتنی ہی رہ گئی ہے کہ شاید یہ اسلام سے محبت رکھنے والی کسی آئندہ پارلیمنٹ کی توجہ کا مرکز بن سکے۔ فی الحال تو زیادہ تر ممبروں کی توجہ ان امور پر ہوتی ہے جن سے ان کی مرحات اور ترقیاتی فنڈوں میں اضافہ ہوسکے یا ان کی آئندہ نسلوں کے لیئے اقتدار کی راہیں ہموار رہ سکیں۔

اس کتاب کے موجودہ ایڈیشن کی نظر ثانی کے دوران خیال آیا کہ کیوں نہ مشرقی پاکستان کے الگ ہونے کی وجوہات پر تاریخی اعتبار سے کھوج لگائی جائے۔ اس سلسلے میں چند کتابیں اور تحریریں نظر سے گذریں تو بعض حقائق نے مجھے ورطہء حیرت

میں ڈال دیا۔لندن میں منعقدہ گول میز کانفرنسوں کی قرارداد یں ،جس میں مسلم لیگ کی قیادت جس میں قائداعظم اور لیاقت علی خان کے علاوہ علامہ اقبال موجود تھے، کا انڈین یونین کے اندر رہتے ہوئے مسلمانوں کے لیئے الگ ریاستوں کا مطالبہ تھا۔مزید اچنبے کی بات یہ تھی کہ چوہدری رحمت علی ،جن کا آج تک رول صرف پاکستان کے نام کے خالق تک محدود رکھا گیا ہے، نے اس مطالبے کی بھر پور مخالفت کی اور پاکستان کے حق میں ایک انفرادی تحریک چلائی اور Now or Never (ابھی نہیں تو کبھی نہیں) کے نام سے ایک پیمفلٹ شائع کیا جس میں ان قرادوں میں دیئے گے مندرجات کو رد کرتے ہوئے مسلمانوں کے ایک الگ ملک کا مطالبہ کیا گیا تھا۔اس میں مسلم اکثریت کے پانچ صوبے یعنی ، پنجاب (پ)،افغان (صوبہ سرحد (ا)،کشمیر (ک) سندھ (س) اور بلوچستان (تان) (پ اک س تان۔۔ پاکستان) تو شامل کیئے گئے تھے لیکن مشرقی بنگال کا کہیں ذکر نہیں کیا گیا تھا۔اس کی سوچ کتنی دوررس تھی اس کا واضع ثبوت بعد میں رونما ہونے والے حالات سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔ہماری بے حسی کا یہ عالم ہے کہ ان کے جسد خاکی کو لندن سے پاکستان لانے کی کئی کوششوں میں ہمیشہ حکومت وقت آڑے آتی رہی ہے۔

قرادادمقاصد منظور ہونے کے کچھ عرصے کے بعد اسی اسمبلی نے پاکستان میں آئندہ دوایوانوں کے ساتھ پارلیمانی نظام حکومت کے نفاذ کی قرارداد منظور کر لی تھی ۔عجیب بات تھی کہ بجائے ایسا نظام لانے کے جس سے مختلف اکائیوں ، جس میں صوبوں کے علاوہ مہاجروں کی ایک کثیر تعداد موجود تھی ،کو ملا کر ایک مضبوط اتحاد کی بنیاد رکھی جاتی انگریزوں کی اندھی پیروی کرتے ہوئے ایک ایسا نظام حکومت اپنایا گیا جس کی وجہ سے ان میں مزید تفریق ، ناچاقی اور کشمکش کی صورت پیدا ہوسکتی

تھی۔

قرارداد پاکستان میں الگ الگ ریاستوں کا ذکر تھا لیکن بعد میں قائداعظم کی قیادت پر مکمل اعتماد اور تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کے تحت اس پر کوئی سوچ بچار یا پیش رفت نہیں کی گئی اور صرف تقسیم ہند کے ضمن میں کسی حکمت عملی پر ہی کام ہوتا رہا۔ میرے خیال میں، جس سے شاید بہت سے لوگ اتفاق نہ کریں، اگر اس وقت مشرقی حصے کو ایک الگ ملک کی حیثیت نہ بھی دی جاتی تو پاکستان کو ایک کنفیڈریشن بنانے سے اسے یکجا رکھ کر بہتری کی ایک صورت پیدا ہوسکتی تھی۔ اس طرح دونوں حصے بجائے آپس کی مخاصمت کے اپنے پیروں پر کھڑا ہوکر اپنی معیشت اور دفاع کو مضبوط کر کے ایک دوسرے پر اپنا انحصار کم کر سکتے تھے۔

ہمیں سوچنا پڑے گا کہ ہمیں مشرقی پاکستان کے الگ ہونے سے کیا نقصان ہوا۔ ماسوائے ہندوستانی فوج کے آگے ہتھیار ڈالنے کی رسوائی کے جس کی زیادہ تر ذمہ داری ہم پر آتی ہے ہم نے کچھ نہیں کھویا۔ ہمارا واویلا کہ پاکستان ٹوٹنے سے دوقومی نظریے کی نفی ہوگئی ہے صحیح نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو بنگلہ دیش قائم نہ ہوتا بلکہ مشرقی اور مغربی بنگال دوبارہ اکھٹے ہو جاتے یا کم از کم اس کے لیئے بنگلہ دیش میں کوئی چھوٹی موٹی تحریک ہی چلتی۔ اپنی مسلمان رعایا کے ساتھ ہندوستان کی موجودہ حکومت کا سلوک اور ہندومت کے نظریے کی ترویج اور اس کا تیزی سے زور پکڑنا بنگلہ دیش کے عوام کو باور کرانے کے لیئے کافی ہے کہ انھوں نے دوقومی نظریے کے تحت ہندوستان سے الگ ہونے کے بارے میں صحیح فیصلہ کیا تھا۔ حال ہی میں بنگلہ دیشی عوام کی بھرپور مخالفت کی وجہ سے ہندوستان کے وزیراعظم نریندر مودی کو اپنا دورہ منسوخ کرنا پڑا۔ چند ہی سالوں کے اندر انشا اللہ آئندہ کسی جنگ میں ہندوستان کو ایک نہیں بلکہ دو اسلامی ملکوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

ہمیں یہ مان لینا چاہیے کہ ہم ان کو عمومی طور اپنے سے کم تر سمجھتے رہے اور انہیں مساوی حیثیت دینے سے گریز کرتے رہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب عوامی لیگ نے 1970 کے الیکشن میں کامیاب ہو کر اپنے طور پر حکومت بنانے کی پوزیشن حاصل کر لی تو ہم نے پس وپیش سے کام لیا اور حیلے بہانوں سے انہیں اقتدار سے دور رکھا۔ آج تک واضع نہیں ہو سکا کہ ہم نے انہیں زبردستی کیوں اپنے ساتھ رکھا؟ خاص کر جب وہ نظریہ جس کے تحت ہم اکٹھے ہوئے تھے اپنایا ہی نہیں گیا تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کون سی چیز انہیں ہمارے ساتھ جوڑے رکھتی۔ ہم نے ان کے دفاع کے لیئے کوئی خاطر خواہ انتظام بھی تو نہیں کیا تھا۔ تین اطراف میں موجود ہندوستان کے ساتھ 4000 کلو میٹر لمبی سرحد کے دفاع کے لیئے صرف ایک ڈویژن بری فوج، چند گن بوٹس (کوئی تباہ کن جہاز نہیں تھا) اور ایک سکوڈرن جنگی ہوائی جہاز وہاں پر رکھے گئے تھے۔ فوج کی اتنی قلیل تعداد کسی طور اتنی لمبی سرحد کا دفاع نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے برعکس مغربی پاکستان جس کی ہندوستان کے سرحد، جو صرف 3000 کے قریب لمبی ہے، کے دفاع کے لیئے اس سے کئی گنا زیادہ فوج تیار کی گئی تھی۔ اگر انہیں اس پر اعتراض تھا تو وہ اس میں حق بجانب تھے۔ اس کے علاوہ اسلامی بھائی چارے کی بنیاد نہ پڑنے کی وجہ سے انہیں کشمیر کی آزادی اور وہاں سے پاکستان میں داخل ہونے والے دریاؤں کا ہندوستان کے کنٹرول میں جانے کے خدشے سے کوئی خاص دلچسپی نہیں رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ انہیں بہت زیادہ فوجی اخراجات جو ان کے خیال میں پٹ سن کی برآمد کی آمدنی سے ہوتی تھی پر سخت اعتراض تھا۔

قائد اعظم کی وفات کے بعد مسلم لیگ آہستہ آہستہ انتشار کا شکار ہوتی رہی۔ مشرقی پاکستان میں جہاں اس کی بنیاد پڑی تھی اور بنگالیوں کے دلوں میں اس کی جڑیں بہت مضبوط تھیں وہاں بھی پاکستان کے قیام کے ایک ڈیڑھ سال کے اندر

ہی اس کی مقبولیت میں کمی آنی شروع ہوگئی تھی ۔مولوی فضل الحق ،مولانا بھاشانی اور سہروردی جیسے بہت سے مقتدر رہنماوں نے یا تو اپنی پارٹیوں کو اس سے الگ کرلیا تھا یا پھر اپنی اپنی الگ سیاسی پارٹیاں بنا لیں تھیں ۔اس طرح پاکستان کی خالق جماعت کا اثر رسوخ نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا جس کے نتیجے میں 1954 ہونے والے صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات میں اسے زیادہ تر صوبوں میں کامیابی حاصل نہ ہوسکی ۔اس الیکشن میں مشرقی پاکستان میں مولوی فضل الحق کی قیادت میں متعدد پارٹیوں نے جگتو فرنٹ بنا کر تقریباً سوا تین سو سیٹوں میں سے 300 سے زیادہ سیٹیں جیت کر زبردست کامیابی حاصل کی تھی ۔اس کے بعد مزید سیاسی جماعتیں ابھرنا شروع ہوگئیں جن میں رپبلیکن پارٹی اور نیشنل عوامی پارٹی قابل ذکر ہیں ۔ اس الیکشن میں مسلم لیگ کو صرف دس سیٹیں ملیں جو آئندہ 1970 میں منعقد ہونے والے الیکشن کا ایک طرح کا پرتو تھا۔مغربی پاکستان کے صوبوں کی مخالفت کے باوجود ون یونٹ بنا دیا گیا جس کی مخالفت کی وجہ سے پہلی دفعہ مسلح بلوچ جدو جہد شروع ہوئی ۔لیاقت علی کی شہادت کے تین سال بعد خواجہ ناظم الدین کو گورنر جنرل کے عہدے سے ہٹا کر وزیر اعظم بنا دیا گیا اور غلام محمد جو بنیادی طور پر ایک بیوروکریٹ تھا گورنر جنرل کے عہدے پر براجمان ہوگیا اور بعد میں باوجود فالج زدہ ہونے کے کافی عرصے تک اس اہم عہدے کے ساتھ چمٹا رہا اور اسے برقرار رکھنے کے لیئے ہر طرح کی سیاسی اکھاڑ پچھاڑ میں مشغول رہا۔1954 ہی میں اس نے خواجہ ناظم الدین کے بطور وزیر اعظم استعفیٰ دینے کے بعد امریکہ میں متعین پاکستانی سفیر محمد علی بوگرا کو وزیر اعظم بنا دیا جس نے آہستہ آہستہ پاکستان کو امریکہ کی جھولی میں ڈال دیا۔اسی زمانے میں روس کے خلاف بنائے گئے بغداد پیکٹ میں پاکستان شامل ہوا جس کے منفی اثرات ہم آج تک بھگت رہے ہیں ۔

آزادی کے بعد برٹش یونین جس کے سربراہ بادشاہ جارج ہشتم اور اس کے بعد ملکہ الزبتھ تھے میں رہنے کی وجہ سے 1956 تک ہم اپنے آئین سے محروم رہے۔ اس وقت کے وزیراعظم اور عوامی مسلم لیگ کے سربراہ حسین شہید سہروردی نے آئین ساز اسمبلی سے 1956 کا آئین پاس کروایا جس کی رو سے مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں کو اکٹھا کر کے ون یونٹ بنا دیا گیا اور قومی اسمبلی کی سیٹوں کی تقسیم دونوں صوبوں میں برابری کی بنیاد پر کر دی گئی حالانکہ یہ مشرقی پاکستان کے سیاستدانوں کے مطالبے، جس میں کہا گیا تھا کہ یہ تقسیم آبادی کی بنیاد پر ہونی چاہیے، کے برعکس تھی۔ گو سہروردی نے یہ کارنامہ سرانجام دے کر حب الوطنی کا ثبوت دیا تھا لیکن جلد ہی اسے ہٹا کر ایک غیر منتخب شخص محمد علی کو وزیراعظم بنا دیا گیا۔ اس کے بعد اس عہدے کا حصول سکندر مرزا کی صدارت کے دوران ایک میوزیکل چیئر کی شکل اختیار کر گیا۔ صوبائی اسمبلیوں میں بھی شروع سے ہی یہی کچھ ہوتا رہا تھا جہاں کوئی وزارت اعلی اپنی مدت پوری نہ کر سکی بلکہ بعض کو ایک سال کے اندر ہی چلتا کیا گیا۔

اس صورت حال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے 1958 میں اسکندر مرزا جو اپنے ہی جیسے بیوروکریٹ غلام محمد کو ہٹا کر کرسی صدارت پر براجمان ہو گیا تھا نے آرمی کے کمانڈر انچیف جنرل ایوب جو اس وقت مرکز میں وزیر دفاع بھی تھے کی مدد سے ملک میں مارشل لگا دیا۔ چند ہی دنوں بعد جنرل ایوب نے سکندر مرزا کو ہٹا کر صدر اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ہونے کا اعلان کر دیا۔ اسی طرح صوبوں میں بھی اسمبلیوں اور وزارتوں کو ختم کر کے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر کر دیئے گئے۔

جنرل ایوب کا دور حکومت جس میں چار سال مارشل لاء اور سات سال صدارتی نظام کے تحت معاشی، صنعتی اور تعلیم کے میدان میں ترقی، استحکام اور ملکی وقار میں بے پناہ اضافے کی بنا پر پاکستان کی تاریخ کا بہترین دور تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن

ایوب خان نے اپنے علاوہ کسی اور کو ملک کی باگ ڈور سنبھالنے کے قابل نہ سمجھتے ہوئے نہ صرف اپنے بنائے گئے 1962 کے آئین، جس کی تخلیق میں بھٹو خود بھی شامل تھا، کے تحت صدارتی انتخابات میں حصہ لیا لیکن بجائے بالغ رائے دہندگی کے صرف لوکل کونسلروں کو ووٹ ڈالنے کی اجازت دی۔ اس کی وجہ سے ان پر الزام لگا کہ انہوں اپنے حق میں لالچ اور دباؤ کے تحت ووٹ حاصل کیئے ہیں جو کچھ لوگوں کے خیال میں درست نہیں ہے۔ ان کے مدمقابل محترمہ فاطمہ جناح کو، جنہیں مشرقی پاکستان میں بے پناہ مقبولیت حاصل تھی، 22 ہزار سے زیادہ ووٹوں سے ہرایا گیا تھا۔ اس کے نتیجے میں ایوب خان کی مقبولیت میں نہ صرف کمی ہوئی بلکہ مشرقی پاکستان میں پر تشدد مظاہرے ہوئے۔ اس سے قبل ایوب خان کے اپنے ہی وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو نے 1965 کی جنگ کے بعد ہونے والے تاشقند معاہدے کے خلاف حکومت سے الگ ہو کر ایک زبردست حکومت مخالف تحریک شروع کی لیکن بعد میں باوجود عوام سے اپنے وعدے کے، وہ بلی کو تھیلی سے باہر نہ لا سکا اور آج تک اس کی اس معاہدے کی مخالفت کی وجوہات سامنے نہیں آسکیں۔ چینی کے ایک ملک گیر بحران نے بھی حکومت کو کمزور کرنے میں ایک اہم کردار کیا۔ اس کے نتیجے میں جو ملک میں اننتشار پھیلا اس کی وجہ سے نہ صرف ہم نے مشرقی پاکستان کھو دیا بلکہ اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے سیاسی عدم استحکام اور بحران نے طالع آزما سیاستدانوں کو موقع فراہم کیا کہ وہ ہمیں کسی نہ کسی سانحے سے دوچار رکھ کر اقتدار پر قابض رہیں اور ملکی وسائل کو لوٹتے رہیں۔

1969 میں فیلڈ مارشل ایوب کو ہٹا کر جنرل یحیٰ خان نے بھٹو کے ساتھ مل کر مارشل لاء لگا دیا۔ اس کے بعد جلد ہی لیگل فریم ورک آرڈر کے تحت الیکشن کروائے گئے جس کے نتیجے میں عوامی لیگ کو زبردست کامیابی حاصل ہوئی لیکن بھٹو

اور مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے کچھ سیاستدانوں نے شیخ مجیب کو اقتدار منتقل کرنے کی راہ میں روڑے اٹکائے۔ اس کے نتیجے میں مشرقی پاکستان میں خون ریز فسادات ہوئے جو وہاں پر موجود پاکستانی فوج کے ہتھیار ڈالنے اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی پر منتج ہوئے۔ اس وقت کے وزیر خارجہ بھٹو نے جس کے خلاف پاکستان کے ٹوٹنے کے سلسلے میں ایک باضابطہ جوڈیشل انکوائری ہونی چاہیے تھی قوم اور فوج کے گرے ہوئے مورال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چند جرنیلوں کے تعاون سے اقتدار پر قبضہ جما کر مارشل لاء لگا دیا۔ اسے اقتدار حوالے کرنے کا جواز اس کی پارٹی کا مغربی پاکستان میں 1970 کے الیکشن میں سب سے زیادہ سیٹیں حاصل کرنا پیش کیا گیا حالانکہ وہ الیکشن تو ایک متحدہ پاکستان کی بنیاد پر ہوا تھا اور جس کا اب وجود باقی نہیں رہا تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ دو سال مارشل لاء رہنے کے باوجود اسی اسمبلی سے ہی، جس کا وجود مارشل لگنے کے بعد ختم ہو جانا چاہیے تھا، 1973 کا آئین منظور کروایا گیا۔ یہ آئین اب تک بعض ترمیموں کے ساتھ ملک کا تسلیم شدہ آئین ہے۔ اس کے بارے میں کوئی آئینی ماہر قانون ہی بتا سکتا کہ اس کی کیا حیثیت ہونی چاہیے تھی۔

سانحہ مشرقی پاکستان کے باوجود ہم نے کوئی سبق نہیں سیکھا اور ابھی تک اسی ڈگر پر چل رہے ہیں جس کی وجہ سے یہ المیہ وقوع پذیر ہوا تھا۔ ۱۹۷۱ کے بعد بھی دو وزرائے اعظم کو ہٹا کر لمبے عرصوں تک مارشل لاء لگا۔ جنرل پرویز کے آخری (اللہ کرے یہ آخری ہی ہو) مارشل لاء کے بعد دو سیویلین حکومتیں آئیں لیکن ان سے بھی ملک میں استحکام اور یک جہتی کے لیئے کوئی پیش رفت نہ ہوسکی۔ ان وزرائے اعظم پر بدعنوانی اور کرپشن کے سنگین الزامات لگے جن کے تحت عدالتوں میں ان پر مقدمات قائم ہوئے۔ 2018 کے الیکشن میں عوام نے انہیں رد کر کے حالات کو بدلنے اور

ملک کو ترقی کی راہ پر لگانے کے لیئے ایک غیر روائتی لیڈر عمران خان کو ایوان اقتدار تک پہنچا دیا۔ لیکن اسے بھی اس نظام کی تمام کمزوریوں اور قباحتوں کا سامنا کرنا پڑا اور الیکشن کے دوران کئے گئے وعدوں کو پورا کرنے میں کوئی قابل ذکر کامیابی حاصل نہیں ہوسکی۔

پارلیمانی نظام حکومت نے ہمیں کمبل کی صورت میں ایک ریچھ بن کر اپنے ساتھ چمٹا لیا ہے اور اس سے چھٹکارا عوام کی نظروں میں نہ صرف ناممکن بنا دیا گیا ہے بلکہ اس کی آبیاری کے لیئے انہیں مزید خون دینے کے لیئے تیار کر رکھا ہے۔ دین اور ایمان بچے نہ بچے جمہوریت کا دفاع ہم سب کی زندگی کا اہم ترین مشن بنا دیا گیا ہے۔ ہمیں یہ سوچنا پڑے گا کہ 73 سالوں کے دوران ملک پر اس نظام نے کیا مثبت اور منفی اثرات ڈالے جس کی وجہ سے ہم اس حال تک پہنچے۔

کثیر الجماعتی ہونے کی وجہ سے پارلیمانی نظام میں سیاسی جماعتوں کی تعداد پر کوئی پابندی نہیں جس کی وجہ سے پاکستان میں دو سو سے زیادہ رجسٹرڈ پارٹیوں کے علاوہ متعدد چھوٹی چھوٹی پارٹیاں میدان سیاست میں موجود ہیں۔ کیا مختلف قوموں کو ایک نظریے کے تحت اکھٹا کرنے کے لیئے ایک ایسا سیاسی نظام موزوں ہوسکتا ہے جس میں ہر طرح کا افراط اور تفریق کا عنصر بدرجہ اتم موجود ہو؟ موجودہ دور کی تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ دنیا میں امریکہ کے مقابلے میں روس ایک سپر پاور بن کر ابھرا تھا لیکن جس نظریے کے تحت اس نے یہ قوت حاصل کی تھی اس کے کمزور پڑ جانے پر وہ بکھر کر واپس اپنی پرانی سرحدوں پر کس تیزی سے آ گیا ہے۔

ہمارے ہاں ہر پارٹی کا اپنا اپنا الگ منشور ہے جن میں سے کئی ایک پارٹیاں ل کھلے عام اسلامی نظریے اور پاکستان کی مخالفت میں پیش پیش رہی ہیں۔ اس کے باوجود اقتدار کے ایوانوں تک پہنچنے میں انہیں کبھی کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ اس

کی ایک مثال خان عبدالغفار خان کے بھائی، جسے خان صاحب کے نام سے جانا جاتا ہے، کی دی جاسکتی ہے۔ تقسیم ہند کے وقت پاکستان کی ان دونوں بھائیوں نے شدید مخالفت کی تھی۔ لیکن اس جمہوری نظام میں اکھاڑ پچھاڑ کی کھلی اجازت کی وجہ سے 1954 میں اسے ون یونٹ کی بنیاد پر بننے والے صوبے مغربی پاکستان کا پہلا وزیراعلی بنا دیا گیا تھا کیونکہ اس نے بعض دوسرے سیاسی لیڈروں کے تعاون سے ریپبلکن پارٹی بنا کر باقی سیاسی جماعتوں سے زیادہ سیٹیں حاصل کرلیں تھیں۔

پاکستان کی خالق جماعت مسلم لیگ اگر ابتدا ہی میں کمزور ہوکر بکھر نہ جاتی اور ہندوستان کی کانگریس پارٹی کی طرح کافی مدت تک عنان حکومت سنبھالے رکھتی تو شاید پارلیمانی نظام بھی بہتر طور پر چلتا رہتا۔ اسمبلیوں کے امیدوار حرام کی دولت کے بل بوتے پر الیکشن لڑتے ہیں یا پھر وہ اس نیت سے اس دوڑ میں شریک ہوتے ہیں کہ منتخب ہونے کے بعد وہ ان اخراجات سے کئی گنا زیادہ کما لیں گے یا اپنے کاروبار کو مزید تقویت دے سکیں گے۔ نہایت قابل اور ایماندار لوگ پیسے کی کمی، سیاسی پشت پناہی کی عدم موجودگی اور سچائی کے دامن نہ چھوڑنے کی وجہ سے الیکشن میں کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔ اس کے نتیجے میں اسمبلیوں میں بہت کم ایسے لوگ پہنچتے ہیں جو کاروبار سلطنت کو احسن طریقے پر چلاسکیں۔ یہاں وہ دور بھی دیکھنے کو ملا جب کورے ان پڑھ افراد مرکز تک میں اپنے اثر رسوخ اور سیاسی داؤ پیچ کے بل بوتے پر وزارتوں پر متمکن ہوئے۔ گو اب یہ بات ایک لطیفے کے طور پر مشہور ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ جب ماضی کے ایک مرکزی وزیر نے ایک سرکاری چٹھی پر سیکریٹری کے کہنے پر کہ 'سر اس پر آپ صرف سین seen لکھ دیں' اس پر اردو کا حرف 'س' لکھ دیا تھا۔

آج کل کے انتہائی ترقی یافتہ دور میں بھی ہم اس بات پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ

بجائے ملک میں موجود ہر شعبے میں ماہر سینکڑوں نہایت قابل اور مخلص افراد کے اس طرح کے نااہل لوگوں کو اہم وزارتوں کا قلمدان دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور ملکی ترقی کا انحصار ہر حکومت انہی پر کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ کیا ایسے لوگ دنیا بھر میں معاشی، صنعتی، زرعی اور کئی اور اہم شعبوں میں تیزی کے ساتھ ترقی کا شانہ بہ شانہ ساتھ دے سکتے ہیں۔ اپنی نااہلی کی وجہ سے ان کو سول سروس کے چیدہ چیدہ گروں GURUS پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ سول سروس بھی، جو کاروبار سلطنت میں ایک اہم ستون کا درجہ رکھتی ہے، آہستہ آہستہ نااہل اور بدعنوان حکمرانوں کا ساتھ دیتے دیتے خود بھی کرپٹ اور غیر فعال ہونے کے علاوہ اپنی وفاداریوں کو مختلف سیاسی جماعتوں کے ساتھ منسلک کر دیا ہے۔ ویسے بھی انگریزوں کے ایک غلام قوم کے لئیے بنائے گئے قوانین اور ضابطے عوام کے لئے انصاف کے حصول اور منصوبوں کی تکمیل میں ایک بہت بڑی رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ اس طرح سول سروس اور سیاست دان ان لامحدود اختیارات کی بدولت جائز اور ناجائز طریقے سے ملک کے وسائل اپنے مفاد کی خاطر استعمال کرنے میں کوئی رکاوٹ محسوس نہیں کرتے۔

ایک پارٹی جب اقتدار میں آتی ہے تو اس کے خلاف تمام جماعتیں صف آراء ہو کر اس کے ہر اچھے کام کو تنقید کا نشانہ بنانا اپنے فرض عین سمجھتی ہیں۔ اس طرح عوام کی بھلائی کے کاموں میں روڑے اٹکانے اور یہ ثابت کرنے میں کوشاں رہتی ہیں کہ وہ کام ملکی اور عوامی مفاد کے خلاف ہیں۔ حکومت میں آنے والی ہر پارٹی کی کوشش ہوتی ہے کہ صنعتی اور دوسرے اہم شعبوں میں لمبے عرصے کا کوئی ایسا منصوبہ نہ بنائے جس کی ان کے دور حکومت میں مکمل ہونے کی امید نہیں ہوتی۔ اس لئیے اس کی ترجیح قلیل مدت منصوبوں تک ہی رہتی ہے۔ ان منصوبوں کے لئیے مناسب ملکی ذرائع نہ ہونے کی وجہ سے بھاری سود اور کڑی شرائط پر قرض لیا جاتا ہے اور جیسا کہ دیکھنے

میں آیا ہے بہت سے ایسے منصوبے جو ملک میں موجود فنی مہارت اور مطلوبہ لوکل سرمائے سے پایہء تکمیل تک پہنچ سکتے ہیں وہ بھی غیر ملکی کمپنیوں اور فرموں کو دے دیئے جاتے ہیں۔ان منصوبوں کا غیر ملکی زرمبادلہ کا ایک بڑا حصہ کمیشن کی صورت میں اہل اقتدار کے غیر ملکی بنک کھاتوں میں منتقل ہو جاتا ہے۔عموماً ایسے منصوبے بھی اگر کسی ایک پارٹی کے دور حکومت میں مکمل نہ ہوسکیں تو نئی آنے والی حکومت انہیں کھٹائی میں ڈال دیتی ہے کیونکہ ان کے خیال میں ان کی تکمیل سے انہیں کوئی سیاسی یا مالی فائدہ حاصل نہیں ہوسکتا۔اس طرح کے منصوبے کامیاب ہوبھی جائیں تو وہ اس قابل نہیں رہتے کہ ہماری قومی آمدن میں کم از کم اتنا تو اضافہ کرسکیں کہ ہم ان کے لیئے گئے بیرونی اور اندرونی قرضوں کو دی گئی مدت میں اتار سکیں۔ فیلڈ مارشل ایوب خان کے دور میں بڑی صنعتیں قائم ہونے کے علاوہ منگلا اور تربیلا ڈیم کی صورت میں دو بڑے پانی کے ذخائر بنائے گئے لیکن اس کے بعد نہ صرف اس سلسلے میں کوئی قابل ذکر پیش رفت نہیں ہوئی بلکہ ان کے ایک بہت اہم بجلی اور پانی کے منصوبے کالا باغ ڈیم کو سیاست کی بھینٹ چڑھا دیا گیا اور اس دور میں قائم کی گئی بہت سے صنعتیں قومیانے کی وجہ سے یا حکومتوں کی عدم توجہی اور غفلت سے رو بہ زوال ہو گئیں یا انہیں اونے پونے داموں نجی شعبے کے حوالے کر دیا گیا۔

مروجہ سیاسی نظام کی یہ عجیب بات ہے کہ پارٹی ڈسپلن قائم رکھنے کی آڑ میں اپنے اپنے ممبروں کو مخالف پارٹی کی حکومت کے اچھے اقدامات پر کھل کر حمایت کرنے سے روک دیا جاتا ہے۔قومی اسمبلی جس کا بنیادی کام قانون سازی ہے پارٹیوں کی آپس کی چپقلش کی وجہ سے کئی اچھے اور ضروری قوانین پاس کروانے میں کامیاب نہیں ہوتی۔ بر خلاف صدارتی نظام حکومت کے اس نظام میں ایک معلق پارلیمنٹ (Hung parliament) کی گنجائش موجود رہتی ہے۔ جب اکثریتی

پارٹی حکومت بنانے کے لئیے مطلوبہ نشستیں حاصل نہیں کرسکتی تو اسے دوسری جماعتوں کی حمایت اور شمولیت پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ یہ جماعتیں اپنے جائز اور ناجائز مطالبات منوانے کے لئے بعض دفعہ بلیک میلنگ پر اتر آتی ہیں۔ انہیں راضی رکھنے کے لئیے حکومت کوئی ایسے اقدامات کرنے پڑتے ہیں جن کی وجہ سے نہ صرف ان کی کارکردگی متاثر ہوتی ہے بلکہ ان کے حمایت کرنے والے عوام میں اس پارٹی کی مقبولیت کم کرنے اور حکومت کو کمزور کرنے کا باعث بنتی ہیں۔ اس رویے کی وجہ سے اپوزیشن جماعتوں کو منفی پراپوگنڈے کا ایک جواز مل جاتا ہے۔ اندرونی چپقلش اور کئی ایک ممبروں کے ذاتی مفاد کی خاطر پارٹیوں کے اندر مختلف فارورڈ بلاک بنتے رہتے ہیں جو پارٹی کی کارکردگی اور اندرونی خلفشار اور نئی پارٹیوں کے وجود میں آنے کا سبب بنتی ہیں۔

سینیٹ جس کی ایک اہم ذمہ داری صوبوں کے حقوق کا تحفظ ہے اب ایک ایسا پلیٹ فارم بن چکا ہے کہ اگر اس میں حکومتی جماعت کی اکثریت نہ ہو تو نیشنل اسمبلی سے پاس کیئے گئے بل یہاں پر روک لیئے جاتے ہیں۔ اس طرح کئی صورتوں میں انتہائی اہم قانون سازی مخالفت برائے مخالفت کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔ اسی طرح آئین میں بھی کسی اشد ضروری ترمیم، جس کے لیئے دو تہائی اکثریت کی ضرورت ہوتی ہے، تقریباً ناممکن ہوگئی ہے۔ زیادہ تر ترامیم مارشل لاء ادوار میں کی گئیں تھیں اور جنہیں ختم کرنے کی کوشش ہر حکومت کرتی رہی ہے۔ جنرل ضیاالحق کے دور میں کی گئی وہ ترامیم، خاص کر اسمبلی ممبران کی اہلیت کے متعلق آرٹیکل 62 اور 63 اور اسلامی سزاؤں کے بارے میں شقوں، کو ختم کرنے کی سعی اب تک کی جارہی ہے اور ان کے عملی نفاذ میں پس و پیش سے کام لیا جارہا ہے۔ (میں نے اسلام آباد ہائی کورٹ میں ایک آئینی درخواست گذشتہ تین سالوں سے دے رکھی ہے کہ الیکشن

کمیشن کے پاس اسمبلی کے امیدواروں کو ان شقوں کے مطابق جانچنے کی کوئی سہولت اور طریقہ موجود نہیں ہے۔ ابھی تک یہ پٹیشن بغیر کسی کاروائی کے التوا میں پڑی ہوئی ہے۔) س کے برخلاف اٹھارویں ترمیم، جو نواز شریف کے دور میں لائی گئی تھی اور جس کے حق میں بہت چرچا ہوا تھا، کے ذریعے مرکزی حکومت کو کمزور کر کے بہت سے اختیارات صوبوں کے سپرد کر دیئے گئے ہیں۔ اس ترمیم نے مرکز اور صوبوں میں اکثر معاملات میں آپس میں مخاصمت کی صورت پیدا کر دی ہے خاص کر ان حالات میں جب مرکز اور کسی صوبے میں ایک ہی پارٹی کی حکومت نہ ہو۔ اٹھارویں ترمیم کی وجہ سے وہی صورت حال نظر آتی ہے جو مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے وقت پیدا ہو گئی تھی۔ میرے اپنے خیال میں ون یونٹ ٹوٹنے کے بعد یہ ترمیم ملکی اتحاد پر دوسری کاری ضرب ہے۔ گو پارلیمنٹ کی کاروائیوں کے دوران گنتی کے چند ارکان ہی حصہ لیتے ہیں اور باقی کو پارٹی پالیسی کے مطابق صرف ہاں یا نہ کہنے کی اجازت ہوتی ہے لیکن ان کی تنخواہوں اور متعدد مراعات کا بوجھ ہر مہینے اربوں روپوؤں کی صورت میں عوام کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ آج وہی لوگ فوج کے اخراجات پر کڑی تنقید کر رہے ہیں۔

اسلامی ریاستوں میں صرف دو ہی گروہوں کی گنجائش رہی ہے۔ ایک اہل ایمان اور دوسرے اہل کفر۔ متعدد پارٹیوں کی موجودگی میں ایک نظریے کی ترویج میں کوئی پیش رفت نہیں ہو سکتی کیونکہ ان کی سیاست کی بنیاد ہی ایک دوسرے سے سبقت لیکر اقتدار کا حصول ہوتا ہے۔ ان کا باہمی تعاون ہو بھی جائے تو اسی مقصد کے لیئے ہوتا ہے۔ اس طرح کا سیاسی نظام چند ترقی یافتہ اور تاریخی لحاظ سے متحد قوموں میں تو چل رہا ہے لیکن کئی منتشر قومی اکائیوں کو یکجا کرنے کی صلاحیت اس میں سرے سے موجود ہی نہیں۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے اس نظام نے سوائے مزید منتشر کرنے،

غربت اور دائمی غلامی کے اندھیروں میں دھکیلنے کے ہمیں کچھ نہیں دیا۔ ہمارے ذہنوں کو اس قدر مفلوج کر دیا گیا ہے کہ ہمیں اس کے چنگل سے نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ ہر بار حکمرانی کے لیئے وہی طبقہ، جس کی لوٹ کھسوٹ ہم پر عیاں ہو چکی ہوتی ہے، آگے آجاتا ہے۔

یہ نظام اب ایک گندے تالاب کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ عمران خان نے بھی اس کی خستہ صورت حال کو صحیح طور پر بھانپنے بغیر تبدیلی کے نعرے کے ساتھ اسی گندے تالاب میں چھلانگ لگا دی ہے اور اب بمشکل اپنا سر اس کی سطح سے کچھ اوپر رکھ کر مکمل طور پر ڈوبنے سے اپنے آپ کو بچایا ہوا ہے۔ ایک کھٹارہ ٹرک میں نیا انجن لگانے سے اس کی کھڑ کھڑاہٹ میں مزید اضافہ ہو جانے کے بعد آخر کار نا کارہ ہو جاتا ہے۔ اس نظام کو ماضی کے حکمران بخوبی سمجھتے تھے اور اسے چلانے کے لیئے ضروری پٹرول رشوت اور بدعنوانی کی صورت میں فراوانی کے ساتھ مہیا کرتے تھے۔ اس کے بغیر یہ سسٹم ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ عمران خان کو اب تک یہ سمجھ آجانی چاہیے کہ ہماری بیوکریسی کرپشن اور سست روی کی اتنی عادی ہو چکی ہے کہ وہ اس سسٹم کو اسی نہج پر رکھنے کے لیئے کاروبار سلطنت میں ہر طرح کی رکاوٹ ڈالنے میں کوشاں رہے گی۔ دو سال گذرنے کے بعد بھی تھانوں اور پٹوار خانوں کی لوٹ کھسوٹ میں باوجود کمپیوٹرائزیشن کے ذرہ برابر بھی تبدیلی نہیں آئی۔ میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر یہی کرپٹ نظام چلانا ہے تو حکومت بحریہ ٹاؤن کے مالک ملک ریاض کے حوالے کر دی جائے جو اس کی ایک ایک رگ سے اچھی طرح واقف ہے اور اس میں ہر قسم کی رکاوٹ کو دور کرنے کی صلاحیت اور تجربہ رکھتا ہے۔

اس صورت حال سے نکلنے کے لیئے میرے خیال میں ایک ہی راستہ ہے وہ اس

نظام کو کلی طور پر جڑ سے اکھاڑ پھینکنا ہے۔ اس کی جگہ صدارتی نظام، جو ایک متبادل جمہوری نظام ہی ہے اور جو بشمول امریکہ اور فرانس بہت سے ملکوں میں کئی عشروں سے کامیابی سے چل رہا ہے۔ دور کیوں جائیں سوائے ہندوستان کے ہمارے پڑوس کے تمام ملکوں میں یہی نظام رائج ہے۔ اس نظام کا نفاذ ہی ہمیں اس فرسودہ پارلیمانی نظام، اس کے تحت وجود میں آنے والے ایک طاقتور استحصالی طبقے اور عوام کی پستہ حالی سے نجات دلا سکتا ہے۔ فیلڈ مارشل ایوب اور جنرل ضیاالحق کے دور کے صدارتی نظام کی اچھائیوں کو ایک منظّم مہم اور میڈیا کے بھرپور تعاون سے اس کی مبینہ کمزوری کو اچھالا گیا اور اس کی اچھائیوں کو نظروں سے اوجھل رکھ کر عوام کو اس سے اتنا متنفر کر دیا گیا ہے کہ وہ اس کے بارے میں سوچنے کو بھی گناہ تصور کرنے لگے ہیں۔ مارشل لاء ایک ایسا جابرانہ نظام ہے جس کی کسی صورت تعریف نہیں کی جا سکتی لیکن اگر ان ادوار میں کچھ اچھے کام ہوئے ہیں تو ان کو کسی طور پر رد نہیں کیا جا سکتا۔

فیلڈ مارشل ایوب کا نافذ کردہ صدارتی نظام ملکی حالات اور اس وقت کے تقاضوں کے مطابق نہایت غور وغوض اور محبّ الوطن سیاست دانوں، جن میں ذوالفقار علی بھٹو شامل تھا، اور آئینی ماہرین کی مشاورت کے بعد ہی نافذ کیا گیا تھا۔ اس نظام کے تحت کچھ موجودہ اور سابق سیاستدان، بشمول ذوالفقار علی بھٹو، مختلف وزارتوں میں کام کرتے رہے تھے۔ بھٹو 1965 کے آخر تک حکومت کا ساتھ دیتا رہا۔ تاشقند معاہدے کو بغیر کسی جواز کے بہانہ بنا کر اس نے ایک ملک گیر مہم چلائی جو صدارتی نظام کی بجائے صرف ایک ایوب مخالف تحریک تھی اور اس کا مقصد صرف ایوان اقتدار تک پہنچنا تھا۔ اسی طرح جنرل ضیا کا نافذ کردہ صدارتی نظام ان کی وفات کے بعد ان سے شدید مخالفت کرنے والی بے نظیر نے ان کے بعد

حکومت میں آ کر ختم کر دیا تھا۔ اگر ان حکمرانوں کے جانے کے بعد بھی یہ نظام چلتا رہتا اور حالات کے مطابق ان میں ضروری ترامیم کی جاتی رہتیں تو یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ آج صورت حال کافی مختلف ہوتی۔ اس نظام کی مخالفت عوام کی بجائے ان مفاد پرست سیاستدانوں نے کی جن کی عوام پر سے گرفت ختم ہو کر اقتدار کے ایوانوں تک رسائی کی امید ختم ہو چکی تھی۔ ان سیاست دانوں اور مبینہ دانشوروں نے میڈیا کی بھرپور معاونت سے قوم کو ہمیشہ یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ ان ادوار میں سیاسی آزادی کو بری طرح دبایا گیا تھا اور جمہوریت کو قتل کر دیا گیا تھا۔ انہیں سوچنے کا کبھی بھی یہ موقع نہیں دیا گیا کہ وہ یہ سوچیں کہ ان کے مقابلے میں ہمیں جمہوریت نے سوائے انتشار اور غربت کے کیا دیا ہے۔

اس ملک کی یک جہتی، سلامتی، ترقی اور خوش حالی کا میری نظر میں واحد حل اسلامی صدارتی نظام کا نفاذ ہے۔ اس کی وجہ ہی سے ملکی یک جہتی، ترقی کا حصول اور کرپٹ عناصر سے ہمیشہ کے لئے چھٹکارہ ممکن ہو سکے گا۔ لیکن یہ آج کی یا آئندہ کسی منتخب ہونے والی پارلیمنٹ کے ذریعے ناممکن ہیکیونکہ موجودہ سیاسی مافیہ اس میں رکاوٹ ڈالنے کی حتی الوسع کو (protracted) عوامی جد و جہد کی ضرورت ہے۔

گذشتہ انتخابات میں یہ بات ثابت ہوگئی تھی کہ عوام کے ایک بہت بڑے طبقے کی نظریں بھی کسی ایسے ہی انقلاب کی طرف لگی ہوئی تھیں جو انہیں اس ناگفتہ بہ صورت حال سے نجات دلوا سکے۔ لیکن وقت نے ثابت کر دیا ہے کہ باوجود ایک باصلاحیت مخلص، اور محبّ الوطن قیادت کے اس ملک کے عمومی حالات جوں جوں کے توں بلکہ پہلے سے بھی زیادہ دگرگوں ہو گئے ہیں۔ نہ صرف مخالف سیاسی پارٹیوں کی ٹانگ کھچائی بلکہ گذشتہ 73 سال سے کرپشن کا عادی بیوروکریٹک اور عدالتی نظام اس کے ہر مثبت کام میں رکاوٹ ڈال رہا ہے۔

وقت کا تقاضہ ہے کہ ملک کا مخلص اور باشعور طبقہ جسے اس نظام کی خرابیوں کا صحیح ادراک ہے اور اس کے تدارک کی تمنا رکھتے ہیں اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر میدان عمل میں اتر کر عوام میں بیداری پیدا کریں اور ان کے تعاون سے اس نظام کو بدلنے کی کم از کم ابتدا تو کریں۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہم ہمیشہ سے اس فرسودہ نظام اور اس کے تحت پنپنے والے ایک کرپٹ اور نااہل سیاسی مافیہ کی گرفت میں رہ کر اس ملک کو مکمل تباہی کے دہانے کی طرف جاتے ہوئے دیکھتے رہیں۔ مجھے قوی امید ہے کہ اللہ کی مدد اور نصرت سے ہمیں اس عوامی بیدارری کی مہم میں کامیابی اور خوش حالی اور ترقی کی راہ ایک نئے نظام کے تحت ہموار ہوگی۔

میں نے چند لوگوں سے بارے میں جب بات کی تو میں حیران رہ گیا کہ وہ اس سلسلے میں کتنے پر جوش ہیں۔ ایک دکان پر ایک جوڑے سے جن کا تعلق کے۔ پی۔ کے کے ایک معروف سیاسی خاندان سے ہے اتفاقی ملاقات ہوئی۔ بیوی پیپلز پارٹی کے دور حکومت میں صوبائی وزیر رہ چکی تھی۔ خاوند نے مجھ سے استفسار کیا کہ کیا میرا تعلق فوج سے رہا ہے۔ میرے مثبت جواب دینے پر باتوں کا سلسلہ چل نکلا جس نے جلد ہی سیاست کا رخ اختیار کر لیا جو زیادہ تر ملک کے موجودہ حالات کے بارے میں تھا۔ دونوں میاں بیوی موجودہ حکومت کی برائیوں اور پیپلز پارٹی کے ادوار حکومت کی اچھائیوں پر زور انداز میں دلائل دے رہے تھے۔ سب کچھ سننے کے بعد جب میں نے موجودہ نظام کی خامیوں اور اس کے متبادل نظام کی ضرورت پر بات کی تو تھوڑی ہی دیر میں خاوند کہنے لگا کہ میں آج تک کسی سیاسی بحث میں چت نہیں ہوا لیکن میرے پاس تمہیں جواب دینے کے لیئے کوئی الفاظ نہیں ہیں۔ اگر میرے جیسا سیاست سے نابلد شخص پیپلز پارٹی کے ایک 'جیالے' جوڑے کے خیالات کو بدل سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ میدان سیاست میں آنے کے بعد نہایت قابل اور مخلص لوگ

اس نظام کی چنگل سے ہمیں نہ چھڑا سکیں۔ اس طرح کئی اور لوگوں سے گفتگو کے بعد میں پرامید ہوں کہ انشا اللہ یہ مہم کامیابی سے ہم کنار ہوگی۔

میں نے اللہ کا نام لے کر ایک تحریک بنام ُتحریک نفاذ اسلامی صدارتی ُ کا آغاز کر دیا ہے اور مجھے قوی امید ہے کہ اگر اللہ نے چاہا تو یہ جد و جہد جو تا حال ایک قطرے کی صورت میں ٹپکی ہے ایک مضبوط پلیٹ فارم کے وجود میں آنے پر جلد ہی ایک تند و تیز دھارے کی شکل اختیار کر لے گی اور اپنے آگے آنے والی ہر رکاوٹ کو بہا لے جائیگی۔ میں سمجھتا ہوں کہ عمر کے اس آخری حصے میں (اس وقت 78 سال) اگر میں اتنا کچھ بھی کر سکا تو شاید سکون سے اس جہاں سے رخصت ہو سکوں۔ مجھے نہ کسی شہرت اور نہ ہی اپنے نام کو کسی اعتبار سے تاریخ کا حصہ بنانے کی خواہش ہے۔ خواہش ہے تو صرف اتنی کہ اس خدا داد ملک میں ایک ایسی مضبوط قیادت ابھرے جو اس کام کو حتمی انجام تک پہنچا سکے۔ مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ موجودہ طاقتور استحصالی طبقے کی بھرپور مخالفت اور مزاحمت کے باوجود اس میں اللہ کی مدد سے کامیابی ہوگی اور وہ نظریہ جس کے تحت پاکستان وجود میں آیا تھا کلی طور پر نافذ ہو سکے گا۔ دعا ہے کہ اللہ ہمارا حامی و ناصر رہے۔ آمین!

JALALI
بے تیغ سپاہی
جنگ 71ء اور قید ہند کی روداد
لیفٹیننٹ کرنل (ر) عبدالقادر (ستارہ جرأت)